فہمِ قرآن

جس میں فہم قرآن سے متعلق تمام قدیم وجدید
نظریوں پر مبسوط اور محققانہ بحث کی گئی ہے اور قرآن مجید کے آسان ہونے کی
حقیقت کو دل نشین پیرایہ میں واضح کیا گیا ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ وحیِ الٰہی اور کلام ربانی کا
صحیح اور قطعی منشاء معلوم کرنے کے لئے صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اقوال و
اعمال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں تدوینِ حدیث اور اس سے متعلقہ مضامین
فتنۂ وضع حدیث، اس فتنہ کی روک تھام، حدیث کے پایۂ اعتبار، صحابہؓ کی عدالت
کثرت سے روایت کرنے والے بعض صحابہؓ کے حالات، دورِ تابعین کی خصوصیات،
اور دیگر اہم عنوانات پر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔

تالیف

مولانا سعید احمد ایم اے

ندوۃ المصنفین دہلی

قیمت
غیر مجلد
[illegible]

قیمت
مجلد
[illegible]

Marfat.com

سلسلۂ ندوۃ المصنفین

(۶)

فہمِ قرآن

جس میں فہمِ قرآن سے متعلق تمام قدیم وجدید نظریوں پر مبسوط اور محققانہ بحث کی گئی ہے اور قرآن مجید کے آسان ہونے کی حقیقت کو دل نشین پیرایہ میں واضح کیا گیا ہے، نیز بتایا گیا ہے کہ "دینِ الٰہی" اور "کلام ربانی" کا صحیح اور قطعی منشاء معلوم کرنے کے لئے شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات اور اقوال و اعمال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے، اس سلسلہ میں تدوینِ حدیث اور اس سے متعلقہ مباحث فتنۂ وضع حدیث، اس فتنہ کے انسداد، احادیث کے درجۂ اعتبار، صحابہؓ کی عدالت، کثرت سے روایت کرنے والے بعض صحابہؓ کے سوانح حیات، دورِ تابعین کی خصوصیات اور دیگر اہم عنوانات پر ایک خاص اسلوب سے تفصیلی کلام کیا گیا ہے۔

ذخیرہ محمد اقبال مجددی لاہور

تالیف

مولانا سعید احمد ایم، اے، فاضل دیوبند
مدیرِ اعلیٰ برہان

باہتمام مینیجر ندوۃ المصنفین قرول باغ دہلی
(مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس دہلی)

قیمت مجلد [illegible]

طبع ثانی
۱۳۶۴ھ
۱۹۴۵ء

قیمت غیر مجلد
دو روپے چار آنے

Marfat.com

-135306

Marfat.com

فہم قرآن

فہرستِ مضامین

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
سلمانوں میں مرکزیت کا فقدان	۹	عربیت (شرطِ اول)	۲۷
مرکز کی اہمیت	۱۰	ذوقِ لسانی	〃
سلمانوں کا مرکز	〃	ہر کلام کا صحیح مفہوم ایک ہی ہوتا ہے	۳۰
کلمۃ حقٍ اُرید بہا الباطل	۱۱	بلاغت کے مختلف مدارج و مراتب	۳۱
دعاءِ باطل کا اصل سبب	۱۲	دنیوی امور میں ماہرین کی طرف مراجعت	
قرآن کے آسان ہونے کا مطلب	۱۵	کی جاتی ہے۔	۳۲
رآن ہدایت و نصیحت کی کتاب ہے	۱۶	تفسیر کی تعریف	۳۳
ہم قرآن سے مراد۔	۱۷	دو اماموں کی رائے	۳۴
رآن احکام و مسائل کی کتاب ہے۔	۱۹	اصوات و لہجاتِ عرب کا علم	۳۷
حابہ فہمِ قرآن میں برابر نہیں تھے۔	۲۰	دوسری شرط ذوقِ قرآنی	۳۸
عض خاص خاص صحابہ کا ذوقِ قرآن فہمی	〃	تیسری شرط اتقاء	۴۰
ضرت ابنِ عباسؓ کی رمز شناسی	۲۱	اتقا کی ایک عقلی توجیہ	۴۴
فسیر قرآن میں اسلاف کی احتیاط	۲۳	چوتھی شرط	۴۶
س درجہ احتیاط کا سبب	۲۴	ایک شبہ اور اس کا جواب	۴۸
فسیر بالرائے پر وعید اور اس کا مطلب	〃	ذکر کی بحث	۴۹
ہم قرآن کے شرائط	۲۶	احکامِ قرآن میں بصیرت	۵۲

Marfat.com

مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ
نکتہ	۵۴
ناسخ و منسوخ	״
نسخ سے مفسرین کی مراد	״
قرآن میں نسخ کی حقیقت	۵۹
ایک شبہ اور اس کا ازالہ	۶۳
تفسیر و تاویل کا فرق	۶۶
کیا قرآن مجید بغیر سنت کے صحیح معنی میں سمجھ میں آسکتا ہے؟	۷۰
قرآن میں اتباعِ رسول کا حکم	۷۲
حدیث کی تشریعی حیثیت	۷۷
ایتمار اور نہی کی اسنادِ مجازی ہے یا حقیقی	۸۰
آیاتِ قرآنی کا صحیح مفہوم سنت کے بغیر متعین نہیں ہو سکتا	۸۲
حضرت عمران بن حصین کا استدلال	۸۳
سنت اور لغت	۸۴
بعض دفعہ کلام کی مراد بجز مخاطب کے کوئی دوسرا متعین نہیں کر سکتا۔	۸۵
ایک غلط فہمی کا ازالہ	۸۶
صحابہ کرام اور سنت کا احترام	۸۸
دین کا مدار قرآن و سنت دونوں پر ہے	۹۳
حدیث کی تشریعی حیثیت اور اس سے غرض	۹۵
تدوینِ حدیث	
عہدِ نبوت اور تدوینِ حدیث	۹۹
بعض خاص صحیفے	۱۰۱
تحریکِ تدوینِ حدیث	۱۰۲
درسِ حدیث	۱۰۳
عہدِ بنی عباس میں تدوینِ حدیث کا آغاز	״
کتبِ حدیث کی ترتیب میں اختلاف	۱۰۴
کتبِ حدیث میں فرقِ مراتب	״
تنقیدِ احادیث	۱۰۵
وضعِ احادیث کا فتنہ اور اس کا انسداد	
وضعِ احادیث کا چرچا	۱۰۶
وضاعینِ حدیث کے مختلف طبقے	״
اسباب وضعِ حدیث	۱۰۷
عہدِ صحابہ میں عدم کتابتِ حدیث کے وجوہ	۱۰۹
قبولِ حدیث میں صحابہ کی احتیاط	۱۱۱
بے تحقیق روایت پر وعید	۱۱۲

Marfat.com

مضمون	صفحہ
کثرتِ روایت سے اجتناب	١١٣
حدیث پر شہادت	١١٤
طلبِ حدیث کے لئے سفر	١١٧
حدیث بیان کرتے وقت دہشت اور خوف	١١٨
کثرت سے روایت کرنیوالے صحابہ	١١٩
حضرت ابوہریرہؓ	
اسلام اور جستجوئے علم	١٢٠
حضرت ابوہریرہؓ کے لئے دعاءِ نبوی	١٢١
جلالتِ علم	١٢٢
روایات	〃
کثرتِ روایت کے اسباب	١٢٣
اجلّہ صحابہ ان پر اعتماد کرتے تھے	١٢٤
قوتِ حافظہ	١٢٦
حدیث کی کتابت	١٢٧
احتیاط	〃
حق گوئی	١٢٨
عام تبصرہ	〃
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	
نام و نسب	١٣٠
مستشرقین کا اعتراض اور اس کا جواب	〃
حضرت ابنِ عباسؓ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ شفقت و تربیت	١٣١
وفاتِ نبوی کے وقت حضرت ابنِ عباسؓ کی عمر	١٣٢
علمی کمال	〃
علمی شوق	١٣٣
صحابہ میں آپ کی قدر و منزلت	١٣٤
روایت میں احتیاط	١٣٦
مرویات کی تعداد	〃
صحابہ سب عادل ہیں	١٣٧
عدالت سے مراد	١٤٢
شاہ عبدالعزیزؒ کا ارشاد	〃
تابعین کا دور	
درسِ قرآن و حدیث کے مرکز	١٤٤
امام زہریؒ	١٤٥
کتابتِ حدیث	١٤٦
حفظِ حدیث	〃

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
مرویات کی تعداد اور ان کا پایہ	۱۴۷	حفظِ حدیث	۱۶۱
شیوخ	"	طلب حدیث میں سفر	"
اسناد	۱۴۹	تنقیدِ حدیث	۱۶۲
اسناد کی اہمیت	۱۵۱	الجامع الصحیح	۱۶۴
اسمار الرجال کی تدوین	۱۵۲	تعدادِ احادیث	۱۶۵
اسمار الرجال کی کتابیں	۱۵۴	شروطِ بخاری	"
حدیث کی قسمیں	۱۵۶	صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا موازنہ	۱۶۷
حدیثِ صحیح کی تعریف	"		
عدالت	"	**اصولِ درایت**	
عدالت کے اعتبار سے طبقاتِ رواۃ	۱۵۸	درایت کی ابتدا عہد صحابہ میں	۱۷۱
ضبط	"	درایت کے اصول	۱۷۳
شذوذ	"		
علّت	۱۵۹	**محدثین کی بےلوث خدمات علم ومذہب**	
حدیثِ حسن کی تعریف	"	از صفحہ ۱۸۷ تا صفحہ ۱۹۳	
امام بخاریؒ		**ایک خط اور اس کا جواب**	
نام ونسب	۱۶۱	از صفحہ ۱۹۴ تا صفحہ ۱۹۹	

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچۂ طبع ثانی

"فہم قرآن" پہلی مرتبہ ۱۹۴۱ء؁ میں شائع ہوئی تھی اور اس کو مطبوعات "ندوۃ المصنفین" کے دوسرے سیٹ میں شامل کر کے محسنین و معاونینِ ادارہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ اب تقریباً پانچ سال کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن زیادہ بہتر اور زیادہ مکمل صورت میں شائع ہو رہا ہے۔

مضامین کی ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے طبعِ اول میں جو نقائص رہ گئے تھے اس دفعہ ان کو بڑی حد تک دور کر دیا گیا ہے اور بہت سے اہم اور مفید اضافے بھی کئے گئے ہیں، اسلوبِ بیان بھی کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔

وقت کے جدید مسائل پر "ندوۃ المصنفین" نے جو کتابیں شائع کی ہیں، ان میں "فہمِ قرآن" ایک خاص رنگ کی تبلیغی اور اصلاحی کتاب ہے۔ پھر اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی ہے کہ موضوعِ کتاب کا تعلق ایک ایسے مسئلہ سے ہے جو آج کل خاص طور پر ہمارے بہت سے جدید تعلیم یافتہ اصحاب کی بحث و نظر اور غور و فکر کا مرکز بنا ہوا ہے۔

فہمِ قرآن اور تدوینِ احادیث کے متعلق جو مختلف نکتے یا مختلف قسم کی جو

Marfat.com

اُلجھنیں ان حضرات کے دماغ میں ہیں وہ ان کا تشفی بخش اور دل پذیر حل دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے۔ اور اس مرحلے پر بے تکلف یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ "فہم قرآن" اس سلسلہ کی پہلی مستند اور مہتم بالشان تالیف ہے جس میں اس مسئلہ کے تمام اہم اور ضروری گوشوں پر وقت کے جدید تقاضوں کی روشنی میں مفصّل کلام کیا گیا ہے۔

دعا ہے حق تعالیٰ مصنّف کی کاوش وسعی مشکور فرمائے اور طالبانِ حق اس سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھائیں۔

عتیق الرحمن عثمانی

ناظم ندوۃ المصنفین دہلی

۲۱ر رمضان المبارک ۶۴ھ

مطابق ۳۰ر اگست ۴۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جس طرح کسی شخص کے اعضاءِ رئیسہ میں فتور پیدا ہو جاتا ہے تو اس سے تمام جسم متاثر ہوتا ہے معدہ و جگر بیمار ہوتے ہیں تو مریض کا مزاج، عادات و خصائل، چہرہ کا رنگ، جسم کی موزونیت یہ سب چیزیں بدل جاتی ہیں، دماغ کا توازن خراب اور طبیعت میں ایک خاص قسم کا چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ ٹھیک یہی حال قوموں اور جماعتوں کا ہے۔ کسی قوم کے اربابِ علم و فضل اس قوم کے لئے قلب و جگر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پس ظاہر ہے اگر یہ تندرست اور قوی ہیں تو قوم کے افراد میں بھی صحت و تندرستی کے آثار پائے جائیں گے، لیکن اگر بدنصیبی سے ان لوگوں کا ہی حال سقیم ہے؛ خود ان ہی کے دماغ کا توازن بگڑ گیا ہے اور ان میں آپس میں یکجہتی و ہم خیالی، ہم مقصدی و ہم آہنگی نہیں ہے تو پھر غریب افراد کا پوچھنا ہی کیا، وہ اگر ریگ کے ذروں کی طرح منتشر و پریشان ہوں تو تعجب نہیں، اور اگر ان کا "خاکسترِ قومیت" دوشِ ہوا پر جہالت و نادانی کے تیرہ و تار بیابانوں میں آوارہ پھر رہا ہے تو اس پر کوئی حیرت نہیں۔

آہ! کیونکر کہئے کہ آج مسلمانوں کی قوم کا حال بھی یہی ہے۔ جماعت جس چیز سے جماعت بنتی ہے یعنی احساسِ مرکزیت وہ سراسر ان میں مفقود ہے۔ ہر شخص ایک نئے خیال کا پابند اور ہر فرد ایک نئے جذبہ و آہنگ سے ہم کنار ہے ایک مرض ہو تو اس کی شکایت کی جائے، زخم ایک ہو تو

اس کے لئے تدبیرِ چارہ گری کی جا سکتی ہے، جب جسم ہمہ تن داغ بن گیا ہو تو پنبہ و مرہم کہاں کہاں رکھا جائے۔ دامان و جیب اگر کہیں سے پھٹ گئے ہیں تو انھیں سیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر دستِ وحشت نے ان کو تار تار کر دیا ہے تو پھر کیوں کسی کا احسانِ سوزن کاری و منتِ بخیہ گری اٹھایئے کہ یہ سب تدبیریں اور چارہ سازیاں لاکھ کوششوں کے بعد بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتیں۔

مرکز کی اہمیت ہر جماعت کی روحِ رواں اس کا مرکز ہوتا ہے جب تک اس قوم کے افراد میں مرکز سے وابستگی پائی جائے گی ان کی روح سرسبز و شاداب رہے گی اور جتنا جتنا اس وابستگی میں اضمحلال پیدا ہوتا جائے گا ان کی قومیت بھی مضمحل، کمزور اور از کار رفتہ ہوتی رہے گی یہانتک کہ اگر یہ احساسِ مرکزیت بالکل ناپید ہو جائے تو پھر وہ جماعت جماعت نہیں رہتی اس کے افراد ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح منتشر اور "گریبانِ عاشق" کی مانند پراگندہ و متفرق ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی دنیا الگ ہر ایک کا مرکزِ خیال جدا، اور ہر ایک کا کعبۂ مقصود نیا ہوتا ہے، ان میں جماعتی وحدت مفقود ہو جاتی ہے اور انفرادی تشتتِ خیال، ان کے نظامِ جماعت کے شیرازہ کو پریشان کر کے رکھ دیتا ہے۔

مسلمانوں کا مرکز مسلمانوں کا مرکز کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں ایک اور صرف ایک ہے اور وہ قرآن ہے، ان کے تمام عبادات، معاملات، معاشرت، تمدن، تہذیب اور ان کے تمام اجتماعی اور اقتصادی نظام سب اسی ایک مرکز سے وابستہ اور اسی ایک رشتہ سے منسلک ہیں۔ ان کی تمام اخلاقی و روحانی برتریوں اور بزرگیوں کا دارومدار صرف اسی ایک کتاب مبین کے تعامل پر ہے انھوں نے اس کی قیادت میں جب کبھی کسی جانب رُخ کیا دشمنوں کی صفیں پہاڑ کی طرح مضبوط تھیں، دم کے دم میں الٹ گئیں اور کفر و شرک کے مضبوط قلعے مفتوح و سرنگوں ہو کر حق و صداقت کا پرچم اڑانے لگے۔ انھوں نے قرآن کی مشعل کو ہاتھ میں لئے ہوئے جس کسی وادیٔ پُر ظلمت کی جانب اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑیں تردد و تذبذب اور شک و شبہ کی تاریکیاں خود بخود چھنٹتی چلی گئیں اور پھر وہاں ایمان و ایقان کے آفتاب جہانتاب نے

Marfat.com

اس شان سے طلوع کیا کہ ع

عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

لیکن جب سے دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر ان کو قرآن حکیم سے بُعد ہونا شروع ہوا ان کی روحِ قومیت بھی درماندہ ہونے لگی اور آج اس کے جو نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ان کے ماتم میں دیدۂ و دل سے جتنا بھی دجلۂ خون بہے کم ہے اور جس قدر بھی آہ و فغاں کے شرارے لب و دہن سے بلند ہوں تھوڑے ہیں۔

قرآن پر عمل سے انحراف اور روگردانی کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ہمارے زمانہ میں بعض انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب نے فہمِ قرآن سے متعلق ایک عام غلط فہمی یہ پھیلا دی ہے کہ قرآن وید کی طرح کوئی ایسی کتاب نہیں جس کا علم کسی خاص طبقہ تک محدود ہو۔ بلکہ وہ ایک آسان کتاب ہے اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ آج ہر شخص اپنی بساطِ علمی اور استعدادِ فکری کے مطابق قرآن کی کسی آیت کے جو معانی چاہتا ہے متعین کر لیتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دینے لگتا ہے۔

اس بنا پر اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ان دونوں مسئلوں کی تنقیح کر کے یہ صاف صاف بتا دیا جائے کہ

(۱) کیا قرآن آسان ہے؟ اور اگر ہے تو اس کی حقیقت کیا ہے؟ کیا وہ عربی کی معمولی شدبد سے سمجھ میں آسکتا ہے اور ہر شخص کو اس سے استخراجِ احکام و استنباطِ مسائل کا حق حاصل ہو سکتا ہے

(۲) اور اگر قرآن کے فہم کے لئے صرف عربی کی معمولی استعداد کافی نہیں ہے تو اب یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اور کونسے شرائط ہیں جن کی تکمیل کے بغیر کسی شخص کو فہمِ قرآن کا ادعا جائز نہیں

اس وقت آپ کے ہاتھوں میں جو کتاب ہے اس کا موضوع انھیں دونوں مسئلوں پر بحث کرنا ہے۔

کلمۃ حقٍ اُرید بہ الباطل جیسا کہ آگے چل کر ہم بتائیں گے قرآن واقعی آسان ہے۔ لیکن اس کی حقیقت وہ نہیں ہے جو آج کل کا ہمارا ایک مخصوص طبقہ سمجھتا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک تو قرآن کے آسان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ

Marfat.com

(۱) قرآن کو سمجھنے کے لئے کسی خاص علم وفن کا حاصل کرنا ضروری نہیں۔

(۲) قرآن سے احکام کا استنباط جس طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابنِ مسعودؓ کرتے تھے ہم بھی کر سکتے ہیں اور ہم میں اور دوسرے ائمۂ تفسیر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(۳) اب تک جو تفاسیر لکھی گئی ہیں بیکار ہیں، کیونکہ قرآن تو ایک آسان کتاب ہے، اس کے فہم کے لئے کسی معلم اور راہنما کی ضرورت ہی نہیں۔ ہر شخص ترجمہ دیکھکر اس کا مطلب خود بخود معلوم کر سکتا ہے۔

پھر ان ہی لوگوں میں اب ایک گروہ پیدا ہوا ہے جو ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہتا ہے :۔

(۴) فہمِ قرآن کے لئے حدیث کی بھی ضرورت نہیں۔ قرآن ایک مکمل سرچشمۂ ہدایت ہے اسلامی احکام کی تمام کلیات وجزئیات اس میں بیان کردی گئی ہیں، ان کے ہوتے ہوئے کیا ضرورت ہے کہ احادیث کی روشنی میں قرآن مجید سے احکام مستنبط کئے جائیں۔

ان حضرات کا دعوی اور اس پر ان نتائج کی بنیاد کو دیکھکر ہم حضرتِ علیؓ کے قول کے مطابق یہی کہہ سکتے ہیں کہ۔

کلمتہ حقٍ ارید بہا الباطل   بات تو سچی ہے لیکن ارادہ باطل چیز کا کیا گیا ہے۔

ادعائے باطل کا اصل سبب

لیکن اصل مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے اس امر پر متنبہ کردینا ضروری ہے کہ آپ نے کبھی اس پر غور فرمایا ہے کہ جو بات ساڑھے تیرہ سو برس میں آج تک نہیں کہی گئی وہ آج کیوں کہی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کے دورِ عروج وارتقا سے لیکر اب تک ہر زمانہ میں برابر یہ دستور رہا کہ جو حضرات فہمِ قرآن کی سعادت حاصل کرنے کے لئے عمریں صرف کرتے تھے ملک ملک کی خاک چھانتے تھے، علومِ قرآن ہی میں اشتغال رکھتے تھے لوگ ان کو ہی قرآن کے معانی ومضامین پر کلام کرنے کا اہل سمجھتے تھے اور جب بھی کوئی ایسا معاملہ پیش آتا تھا تو انہیں حضرات کی طرف رجوع کیا جاتا تھا یہ کبھی نہیں ہوا کہ ہر شخص کو خواہ وہ قرآن سے اشتغال رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو فہمِ قرآن کے

Marfat.com

شرائط کا جامع ہو یا نہ ہو۔ بہر حال قرآن مجید کے آسان ہونے کے باعث اس کو قرآن کے حقائق و مطالب پر دسترس رکھنے والانہ طور سے کلام کرنے کا اہل سمجھا گیا ہو۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ جو دعویٰ پہلے کبھی نہیں کیا گیا وہ آج کیا جا رہا ہے اور جس چیز کو پہلے کبھی زبان پر نہیں لایا گیا آج بر ملا اس کی اشاعت کی جا رہی ہے۔

اصل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد جب انگریزوں نے ہندوستان پر اپنے حاکمانہ قبضہ کی گرفت مضبوط کرنی چاہی تو انھیں یہ محسوس ہوا کہ ہندوستان کی قومیں اور بالخصوص مسلمان کٹر قسم کے مذہبی لوگ ہیں اور اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر انگریزوں کی ہر ایک چیز سے نفرت شدید کرتے ہیں اور اسی مذہبی جوش کے باعث ان میں جذبۂ جہاد (Fanaticism) بھی بدرجۂ اتم موجود ہے، انگریز ہندوستان کو فتح کر چکے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ مسلمان کا جذبۂ جہاد ایک شیر کی طرح ہے کہ جب تک وہ اپنی کچھار میں پڑا سوتا رہتا ہے کسی چیز کی پروا نہیں کرتا لیکن جب وہ بیدار ہو جاتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کو خوف زدہ نہیں کر سکتی یہی اندیشہ تھا جس نے انگریز کو پریشان کر رکھا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کوئی ترکیب ایسی چلنی چاہئے کہ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزیت کے خلاف جو جذبۂ نفرت بھرا ہوا ہے وہ جاتا رہے لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ مسلمان علمائے کرام کے زیر اثر تھے اور وہ کسی حالت میں بھی انگریز کی طہارت کا فتویٰ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ اب انھیں محسوس ہوا کہ ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ علمائے کرام کا ہی وجود ہے، اور یہ ایسی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں ہیں کہ آسانی سے کسی کے نقرئی یا زریں دام فریب میں آسکیں۔ اس بنا پر انھوں نے چاہا کہ کسی طرح علما کا وقار ختم کر دیا جائے، اور مسلمانوں کے دل و دماغ پر انھوں نے جو تسلط جما رکھا ہے اس کی گرفت کو ڈھیلا کر دیا جائے۔

یہ اس فکر میں تھے ہی کہ انھیں سرسید اور ان کے بعض ہم خیال لوگ مل گئے جنھوں نے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا اور اس میں اپنے مذہبی مضامین کے ذریعہ غریب علما کا تو ذکر ہی کیا ہے، سرے سے مذہب کی بساط کہن ہی الٹ کر رکھ دی، آپ

آپ سرسید کے مضامین پڑھئے، ان کے ہم خیال شعرار کی نظمیں دیکھئے، آپ محسوس کریں گے کہ ان میں کس آزادی کے ساتھ علمار کرام پر آوازے کسے گئے ہیں، کیسی کیسی نادر اور نرالی پھبتیاں ان پر چسپت کی گئی ہیں۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ محض سب وشتم سے کام نہیں چلتا۔ اس لئے علمار کے وقار کو ختم کرنے کے لئے انھوں نے ایک اور تدبیر اختیار کی جو شاید پہلی سے زیادہ کامیاب رہی۔ ایک طرف تو انھوں نے کہنا شروع کیا کہ "اَلدِّیْنُ یُسْرٌ" دین تو آسان ہے۔ ہر شخص اس کو اپنی اپنی سہولت و آسانی کے مطابق سمجھ سکتا اور اس پر عمل کرسکتا ہے اور دوسری طرف انھوں نے کہا کہ حضور خود فرما گئے ہیں "انتم اعلم باموردنیا کم" تم اپنی دنیا کی باتوں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو، پھر کبھی انھوں نے اعلان کیا کہ دین ہے ایسا کونسا پیچیدہ معمہ جس کے حل کرنے کے لئے ابوحنیفہؒ یا کسی غزالیؒ ورازیؒ کا دماغ وجانسوزی درکار ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما گئے ہیں مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ جس کسی نے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا جنّت میں داخل ہوگیا۔

یہ جتنی باتیں کہی گئیں، الفاظ کی حد تک سب درست تھیں۔ لیکن ان الفاظ کے قالب پر معانی کا جو جامہ چڑھایا گیا، اسلامی تخیل کے نقش سے بالکل معرّا اور سادہ تھا اور اس پر جگہ جگہ اغراضِ فاسدہ کے سیاہ دھبے پڑے ہوئے تھے، اس طرح کی باتیں کہہ کہہ کر مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ دین اور قرآن کوئی مشکل چیز نہیں ہے۔ ہر شخص خواہ عربی کا عالم ہو یا نہ ہو اُسے سمجھ سکتا ہے اور اس کے احکام معلوم کرسکتا ہے۔ اس لئے علمار کا جو وصف مابہ الامتیاز سمجھا جاتا ہے وہ ایک بے بنیاد چیز ہے۔ انگریز اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو علمار اسلام کی ایک جماعت حقہ سے نفرت دلاکر کس اطمینانِ خاطر کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے۔

دراصل یہ ہے تاریخ اس طرح کے پروپیگنڈے کی اور یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے کوئی نئی بات نہیں، بلکہ ایک نوائے قدیم کی صدائے بازگشت ہے جو کچھ دنوں کے لئے خاموش ہوگئی تھی، اگر اب بعض مصالح کی خاطر سیاست کے حُدی خواں نے پھر اس نغمۂ کارواں کو گانا شروع کردیا ہے۔

اب آیئے اصل مسئلہ کی تحقیق کریں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ معلوم کرلینا چاہیے کہ قرآن آسان ہے یا نہیں اگر آسان ہے تو اس کی حقیقت اور اس سے مراد کیا ہے؟

قرآن کے آسان ہونے کا مطلب

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن نے اپنے تئیں خود آسان کہا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ۔ (القمر) — اور تحقیق ہم نے قرآن مجید کو سہل کردیا تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنیوالا؟

یہ آیت "سورۃ القمر" میں متعدد بار آئی ہے۔ سورۃ کے شروع میں قیامت کا ذکر ہے اور ان لوگوں پر شدید نفرت کا اظہار کیا گیا ہے جو اپنی خواہشات کی پیروی میں دن رات مشغول رہتے ہیں اور داعی حق کی آواز کو بالکل نہیں سنتے پھر علی الترتیب، قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم لوط کی نافرمانی و سرکشی اور قہر الٰہی سے ان کے تباہ و برباد ہوجانے کا بیان الگ الگ ایسے انداز میں کیا گیا ہے جس کو سن کر سخت سے سخت منکر کا بھی دل لرز جائے اور ہر واقعہ کے ذکر کے بعد بطور تنبیہ دریافت کیا گیا ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ (القمر) — (دیکھو) میرا عذاب دینا اور ڈرانا ان کے حق میں) کس طرح پورا ہوا پس کیا کوئی ہے (اس سے) نصیحت حاصل کرنے والا؟

اور مذکورہ بالا آیت میں نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن کی آسانی اور سہولت کو بیان فرما کر اس سے سبق لینے کی دعوت دی گئی ہے۔

ایک اور موقع پر سورہ مریم میں ارشاد ہے۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنْذِرَ بِهِ قَوْمًا لُدًّا۔ — اور تحقیق ہم نے قرآن مجید کو تمہاری زبان میں آسان کردیا ہے تاکہ تم اس کے ذریعہ پرہیزگاروں کو بشارت سناؤ اور جھگڑالو قوموں کو ڈراؤ دھمکاؤ۔

(سورہ مریم)

Marfat.com

قرآن ہدایت ونصیحت کی کتاب ہے

لیکن ان دونوں آیتوں کے نفس مطلب اوران کے سیاق وسباق پر غور کیجئے تو یہ حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے کہ قرآن مجید کی زبان میں اس کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ پہلی آیت کا سباق اوراس کا ماقبل سے ربط آپ کو معلوم ہوچکا، اس سے صاف طور پر یہی متبادر ہوتا ہے کہ قرآن مجید رشد وہدایت کی آسان کتاب ہے، اس میں عبرت وبصیرت کے لیے جگہ جگہ اقوام کہن کے واقعات کا بیان ہے اور خدا کے وجودِ حق کو ثابت کرنے کے لیے قدرت کی ایسی واضح نشانیاں بتائی گئی ہیں جن کا ایک ایک ذرہ مبدأ فیاض کے وجود وثبوت اوراس کی قدرت بے مثال کا زبانِ حال سے اعلان کررہا ہے، یہ سب باتیں ان کو قرآن مجید سے ہی معلوم ہوتی ہیں اس لئے اس عالمِ کون وفساد میں ہدایت کا سرچشمہ قرآن مجید ہی ہوا تو کیا پھر کوئی ہے جو اس سے موعظت گیر ہو اور نصیحت حاصل کرے؟

پانی کا برسنا، برق کی چمک، رعد کی گرج، دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا آنا آفتاب کا مشرق سے طلوع کرنا اور مغرب میں غروب ہوجانا، موسموں کا تغیر وتبدل، انسان کا عدم سے وجود میں آنے کے لئے کن کن مراحل سے گذرنا، چشموں کا اُبلنا، کھیتوں کا سرسبز وشاداب ہونا پتھروں سے پانی کا پھوٹ کر نکلنا اور اونٹ کی عجیب وغریب خلقت اور اسی طرح کی وہ سیکڑوں نشانیاں جو قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ ایک انسان بار بار ان کو دیکھتا ہے لیکن اس کا ذہن ان کے صانع وخالق کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم انتہائی فصیح وبلیغ پیرایہ بیان میں ان کا ذکر کرتا ہے، اور لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ ان سب چیزوں کے اصل منشا اور باعث اوران کی علتِ فاعلہ پر غور کریں، ظاہر ہے یہ چیزیں مشاہدات سے تعلق رکھتی ہیں اوران کا دیکھنا، سمجھنا ان سے خدا کے وجود پر استدلال کرنا، چنداں مشکل ودشوار نہیں، ضرورت صرف اس کی ہے کہ آدمی اس کی طرف متوجہ ہو۔ پس اسی بنا پر قرآن مجید نے اپنے تئیں آسان کہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یُسرِ القرآن کا ذکر کر کے للذکر "یعنی نصیحت کے لئے" فرمایا گیا ہے، اور پھر ارشاد ہوا فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ؟

Marfat.com

سورۃ القمر کی آیت کے علاوہ سورۃ مریم کی جو آیت اوپر مذکور ہوئی ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔

لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَ ہم نے قرآن کو اس لئے آسان کیا ہے کہ آپ اس کے ذریعہ پرہیزگاروں

تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا (مریم) کو خوشخبری سنائیں اور جھگڑالو لوگوں کو ڈرائیں۔

مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید میں ترغیب وترہیب سے متعلق جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ اس قدر صاف واضح اور روشن ہیں کہ وہ لوگ جن کے دل میں عناد وتعصب کے شعلے نہیں بھڑک رہے ہیں، ان کو سن کر شاد کام فلاح ہو جائیں گے اور جو فرط عداوت سے انکار وجود کی قسم کھا بیٹھے ہیں ان کو قرآن کی آیاتِ وعید سن کر تنبُّہ ہوگا اور وہ سمجھیں گے کہ جو قادر مطلق عاد وثمود کی سرکش قوموں کو صفحۂ ہستی سے بے نام ونشان کر سکتا، اور قوم لوط پر پتھروں کی بارش کر کے انھیں مسمار کر سکتا ہے وہ ان سرکشوں کے ساتھ بھی اگر چاہے تو یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

بہر حال قرآن مجید کے سہل ہونے کے معنی یہی ہیں کہ اس کی تعلیمات آسان ہیں، وہ جن حقائق کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتا ہے وہ فلسفے کے مسائل ومباحث کی طرح پیچیدہ نہیں بلکہ ہر ایک پر واضح ہیں۔ پھر ان پر عمل کرنا بھی دشوار نہیں، کیونکہ قرآن کی راہ اصل فطرت کی راہ ہے اور اس کی روش وہی ہے جس کی طرف ہر انسان کی فطرتِ سلیمہ دعوت دیتی ہے مثلاً نماز پڑھو، روزہ رکھو، حج کرو، والدین اور اعزاء واقرباء کے ساتھ احسان وکرم کا معاملہ کرو، شراب نہ پیو، زنا سے بچو، وعدہ پورا کرو، بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی سے پیش آؤ۔ یہ وہ احکام ہیں جن کو ایک عربی داں جس طرح سمجھ سکتا ہے ایک غیر عربی داں بھی اردو یا کسی اور زبان میں ترجمہ دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے۔

فہم قرآن سے مراد لیکن سوال یہ ہے کہ "فہم قرآن" کے معنی کیا یہی ہیں کہ قرآن مجید کو پڑھکر بعض چیزوں کے متعلق حسن وقبح کے احکام معلوم ہو جائیں اور بس۔ اگر واقعی یہی مراد ہے تو پھر ہمیں اختلاف کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر ظاہر ہے یہ مراد نہیں ہے، بلکہ فہم قرآن سے غرض یہ ہے

کہ انسان مجتہدانہ طور سے احکام کا استنباط کر سکے، قرآن کی کسی آیت کو پڑھ کر اس کے واقعی اور حقیقی مفہوم کو متعین کر سکے اس کے معیار بلاغت کو دریافت کر کے یہ سمجھ سکے کہ یہاں کلام کا مقتضئ حال کیا ہے اور کس چیز پر زیادہ زور دینا منظور ہے اس کا مدلول مطابقی اور مدلول التزامی کیا ہے اور یہاں کیا مراد ہے تو یہ بات یقینی ہے کہ اس مراد و غرض کے اعتبار سے فہم قرآن کسی ترجمہ کے دیکھ لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے خاص خاص شرائط و آداب ہیں کہ جب تک وہ نہ پائے جائیں کوئی شخص فہم قرآن کا مدعی نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ مفتی محمد عبدہٗ المصری بیان کرتے ہیں۔

تفسیر کے چند مراتب ہیں، ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اجمالاً وہ چیز بیان کر دی جائے جو قلب کو اللہ کی عظمت اور اس کے تقدس کے احساس سے پُر کر دے اور نفس کو شر سے روک کر خیر کی طرف لے آئے یہی بات ہے جس کی بنا پر "ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر" کا مژدۂ جانفزا ہم کو سنایا گیا ہے۔ لیکن (اس مرتبہ سے تجاوز کر کے) اگر کوئی شخص تفسیر کا مرتبہ علیا حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ بغیر چند امور کے حاصل نہیں ہوتا۔"

دور کیوں جایئے خود قرآن کو دیکھئے۔ اس نے جہاں اپنے آپ کو نصیحت کے لئے آسان کہا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ سب آیات یکساں نہیں ہیں بلکہ مراد کے واضح اور مخفی ہونے کے اعتبار سے ان میں باہمی فرق بھی ہے۔ ارشاد ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ	وہ خدا وہی ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری
اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ	اس کی بعض آیتیں عام فہم ہیں وہی کتاب کی
اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۔ پ ۳	اصل ہیں اور دوسری کئی پہلو والی ہیں۔

پھر اس کے بعد فرمایا گیا۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ	پس جن لوگوں کے دل میں کجی ہے وہ فتنہ کی
فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ	جستجو اور اصل حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے

Marfat.com

الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ، وَمَا يَعْلَمُ	کتاب میں سے ان آیات کے پیچھے پڑتے ہیں جن
تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ	میں کئی پہلو نکلتے ہیں حالانکہ ان آیات کی اصل
فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ	حقیقت صرف اللہ اور علماء راسخین جانتے ہیں
مِّنْ عِندِ رَبِّنَا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا	جبکہ وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لے آئے سب کچھ
أُولُو الْأَلْبَابِ ۔ (پ ۳)	ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور نصیحت تو عقلمند

ان دونوں آیتوں سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں بعض آیات ایسی بھی ہیں جن کی مراد اللہ کے سوا صرف علماء راسخین کو معلوم ہو سکتی ہے۔ ہر شخص خواہ عالم راسخ ہو یا نہ ہو ان آیات کی مراد تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔

قرآن احکام ومسائل کی کتاب ہے

علاوہ بریں یہ بات بھی نہ بھولنی چاہئے کہ قرآن مجید صرف امثال وقصص کی کتاب نہیں ہے بلکہ وہ شخصی اور اجتماعی زندگی کا ایک مکمل دستور العمل بھی ہے۔ جس کے بعد کوئی اور آسمانی کتاب نازل نہیں ہوگی۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کتاب الہی میں زندگی کے تمام مسائل کے لئے جزئی تفصیلات مذکور نہیں ہیں اور حق یہ ہے کہ چونکہ ہر زمانہ میں انسانی عقل وشعور کی استعداد اور صلاحیت یکساں نہیں ہوتی بلکہ اس میں عمل ارتقاء برابر جاری رہتا ہے۔ اس بنا پر حکمت خداوندی کا اقتضا یہی ہونا چاہئے تھا کہ آخری کتاب سماوی میں زندگی سے متعلق صرف اصول بیان کئے جائیں اور ان کی جزئیات سے تعرض نہ کیا جائے

پس جب قرآن میں جزئیات نہیں اور صرف اصول وکلیات کا تذکرہ وبیان ہے تو اب لامحالہ فہم قرآن کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہونا چاہئے کہ اصول سے فروع اور کلیات سے جزئیات کے استخراج واستنباط کی صلاحیت واستعداد ہو۔

اس بیان سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ چونکہ استنباط مسائل اور استخراج احکام میں سب لوگ یکساں صلاحیت واستعداد کے مالک نہیں ہو سکتے اس بنا پر ان میں بھی باہمی فرق مراتب ہوگا۔

Marfat.com

صحابۂ فہم قرآن میں برابر نہیں تھے

یہی وجہ ہے کہ ہم عجمیوں اور خیر القرون سے اس درجہ بعد رکھنے والوں کا کیا ذکر؟ خود صحابۂ کرام جو بلا واسطۂ غیرے نبوت کی زبانِ حق ترجمان سے قرآن مجید سنتے تھے، اہلِ لسان وصاحبِ زبان تھے اور جن کے سینے آفتاب جہاں تابِ رسالت کی شعاعوں سے براہِ راست منور تھے۔ فہم قرآن کے مرتبہ میں یکساں حیثیت کے مالک نہیں تھے۔ تمام صحابہ میں صرف چھ یا سات تھے جو قرآنی حقائق کی توضیح میں مستند مانے جاتے تھے۔ ان حضرات کے اسماءِ گرامی یہ ہیں۔ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ ابن مسعودؓ ابن عمر ابن عباسؓ زید بن ثابت اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ مسروق جو کہ ایک مشہور تابعی مفسر ہیں فرماتے ہیں۔

"میں نے صحابۂ کرام سے فیض صحبت اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ان کا علم چھ بزرگوں کی طرف لوٹتا ہے حضرت عمرؓ حضرت علیؓ عبداللہ بن مسعودؓ معاذؓ ابوالدرداءؓ اور زید بن ثابتؓ [1]

پھر عجیب بات یہ ہے کہ فہم قرآن میں ان چھ یا سات حضرات کا مرتبہ بھی یکساں نہیں تھا۔ یہی مسروق آگے چل کر بیان کرتے ہیں" میں نے ان چھ بزرگوں سے شرفِ صحبت حاصل کیا تو دیکھا کہ ان سب کا علم علیؓ اور عبداللہؓ پر ختم ہو گیا ہے۔

یزید بن عمیرۃ السکسکی حضرت معاذ بن جبل کے شاگرد تھے۔ فرماتے ہیں جب حضرت معاذؓ کی وفات ہونے لگی تو انھوں نے مجھکو حکم دیا کہ میں علم صرف چار بزرگوں سے حاصل کروں عبداللہ بن مسعودؓ عبداللہ بن سلامؓ سلمان الفارسیؓ اور ابوالدرداءؓ [2]

بعض خاص خاص صحابہ کا ذوقِ قرآن فہمی

صحابۂ کرام میں جو حضرات تفسیر قرآن کی خدمت انجام دیتے تھے ان کے حالات واقوال پر نظر ڈالی جائے تو ان میں ایک اور حیثیت سے بھی فرق نظر آئے گا۔ حضرت عمرؓ کاروبارِ خلافت کو انجام دیتے تھے، فتوحات ممالک اور سیاسی امور کی نگرانی کا کام کرتے تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ نہ تو احادیث آپ سے زیادہ تعداد میں مروی ہیں

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۰۴۔ [2] الاتقان فی علوم القرآن (سیوطی)

Marfat.com

اور نہ قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق ہی آپ کے اقوال کثرت سے دیکھنے میں آتے ہیں لیکن دراصل وہ حریم اسلام کے بہترین محرم راز تھے اور ان کی فطرت و طبیعت کو اسلام اور قرآن مجید کی تعلیمات واحکام کے ساتھ ایک رازدارانہ نسبت تھی حضرت ابوذرؓ فرماتے تھے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔

ان اللہ وضع الحق علی لسان عمر یقول بہ — اللہ تعالیٰ نے حق کو عمر کی زبان پر رکھ دیا ہے جس کو وہ کہتے ہیں۔

لیکن ان کی فہم عقل قضائی تھی یعنی جہاں تک اسلامی احکام کا تعلق ہے حضرت عمرؓ کا فیصلہ ایک بڑی حد تک شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منشاء سے قریب ہوتا تھا۔

حضرت ابن عباسؓ کی رمز شناسی

رہی یہ بات کہ اس حکم کی حکمت اور اس میں رمز کیا ہے تو غالباً اس معاملہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت عمرؓ پر فوقیت رکھتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق دعا کی تھی۔

اللّٰھم فقھہ فی الدین — اے اللہ تو ابن عباس کو دین میں نظر تفقہ عطا فرما۔

بعض روایتوں میں بجائے "فقھہ فی الدین" کے "علمہ التاویل" ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "اے اللہ تو قرآن مجید کی آیات کا صحیح مصداق ابن عباسؓ کو بتا دے"۔ [1]

حضرت ابن عباسؓ حضرت عمرؓ کے برخلاف سیاسی کاموں میں حصہ نہیں لیتے تھے، حد سے زیادہ محتاط تھے۔ دن رات تعلیم و تعلم اور تدریس و تدارس میں بسر کرتے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث عموماً انصار کے پاس تھیں، میں حدیث کی جستجو میں کسی انصاری کے پاس آتا اور اس کو دروازے پر سوتا ہوا پاتا تو وہیں دروازے پر بیٹھ جاتا تھا، ہواؤں کے تھپیڑے مجھ کو پریشان کرتے تھے۔ آخر کار بیدار ہونے کے بعد جب میں وہ روایت سن لیتا تو واپس چلا آتا تھا۔ اس انہماک و مشغولیت کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ شعر جاہلیت، انساب اقوام، اور تاریخ

[1] الاتقان ج ۲ طبقات المفسرین۔

عرب سے پورے واقف تھے۔ حضرت عمرؓ بھی ابنِ عباسؓ کی یہ خصوصیت تسلیم کرتے تھے اور جب کبھی انھیں قرآن مجید کے کسی لفظ میں اشکال پیش آتا تو وہ حضرت ابنِ عباسؓ کی طرف ہی رجوع کرتے چنانچہ ایک مرتبہ قرآن مجید کی سورہ عَبَسَ میں جو لفظ "ابًّا" آیا ہے اس کے معنی کے متعلق چند صحابہ میں اختلاف ہوا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا "چلو ابنِ عباسؓ کے پاس چلیں وہ ہم سب سے زیادہ لغتِ عرب کے جاننے والے ہیں"[۱]

حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے کہ ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا "نِعمَ ترجمان القرآنِ انت" عبداللہ بن مسعودؓ کا قول تھا "نعم ترجمان القرآن عبد اللہ بن عباس"۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھا کہ وہ آسمان اور زمین کون سے ہیں جن کی نسبت فرمایا گیا ہے "کانتا رتقاً ففتقنٰھما" ابنِ عمرؓ نے اس شخص کو خود کچھ جواب نہیں دیا۔ بلکہ ارشاد ہوا "ابنِ عباسؓ کے پاس جاؤ اور ان سے اس کے متعلق دریافت کرو، پھر مجھ سے آکر اسے کہہ جانا حضرت ابنِ عباسؓ کے پاس وہ شخص آیا۔ تو آپ نے جواب دیا "آسمانوں کا رتق تو یہ ہے کہ ان سے بارش نہیں ہوتی تھی اور زمینوں کا رتق یہ تھا کہ ان میں روئیدگی نہیں پائی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فتق کر دیا تو آسمانوں سے بارش ہونے لگی اور زمینوں میں نباتات پیدا ہونے لگیں"[۲]

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ ایک دفعہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ کے متعلق صحابہ میں اختلاف ہوا۔ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا "آپ کیا فرماتے ہیں۔ انھوں نے کہا "میں وہی جانتا ہوں جو ابنِ عباسؓ جانتے ہیں"[۳]

135306

---

[۱] الاتقان ج ا ص ۱۱۳۔ [۲] یہ سب روایات الاتقان ج ۲ باب طبقات المفسرین سے لی گئی ہیں۔

[۳] لیکن یہ بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے کہ اس علم و فضل کے باوجود خود حضرت ابنِ عباس قرآن مجید کے بعض الفاظ کے معنی اور ذرائع سے معلوم کرتے تھے۔ ایک روایت میں وہ خود فرماتے ہیں کہ میں فاطر السمٰوات کے معنی نہیں جانتا تھا۔ ایک مرتبہ اتفاق سے دو اعرابی ایک کنوئیں پر جھگڑتے ہوئے میرے پاس آئے۔ ان میں سے ایک بولا "انا فطرتھا" میں نے یہ کنواں سب سے پہلے کھودا ہے بس اعرابی کے یہ کہتے ہی فاطر السمٰوات کی مراد میری سمجھ میں آگئی۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۲۳ پر دیکھو)

Marfat.com

یہ اور اس طرح کے سیکڑوں آثار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ زبان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت سے سرفراز ہونے میں یکساں و ہم رتبہ ہونے کے باوجود تمام صحابہ فہمِ قرآن میں یکساں نہیں تھے۔ بلکہ ان میں بعض خاص خاص صحابہ ہی ایسے تھے جو درحقیقت ذمہ دارانہ طور پر تفسیر قرآن کی خدمت انجام دے سکتے تھے اور ان کی اس خصوصیت کو اجلۂ صحابہ بھی تسلیم کرتے تھے۔ ان کی اس برتری اور فضیلت کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں تھی کہ وہ ذوقِ قرآنی جو محض ایک عطیۂ خداوندی ہے ان کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ افراط کے ساتھ مرحمت ہوا تھا وذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

تفسیر قرآنی میں اسلاف کی احتیاط

ہمارے زمانہ میں ہر شخص جو عربی کی معمولی شدبد رکھتا ہے قرآن کے حقائق و مطالب پر کلام کرنے کا اپنے تئیں مستحق سمجھتا ہے اور ائمۂ تفسیر کے عام بیانات کے برخلاف اس کو خود اپنی طرف سے جدت بیانی کرتے ہوئے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن آپ کو شاید یہ سُنکر تعجب ہو کہ عہدِ صحابہ و تابعین میں یہ جسارت عام نہیں تھی جیسا کہ ابھی معلوم ہوا۔ ان جماعتوں میں خاص خاص حضرات تھے جو قرآن مجید کی تفسیر بیان کرتے اور کر سکتے تھے۔ اور ان مباحث و مطالب میں وہ مرجع قوم و ملت سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حضرات بھی تفسیرِ قرآن کے معاملہ میں حد درجہ احتیاط ہی رکھتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں "میں نے مدینہ طیبہ کے فقہاء کو دیکھا ہے۔ یہ حضرات تفسیر قرآن کے سلسلہ میں گفتگو کرنے کو بڑا اہم اور ذمہ داری کا کام سمجھتے تھے۔ سالم بن عبداللہ، قاسم بن محمد، سعید بن مسیب اور حضرت نافع ان ہی حضرات میں سے تھے۔" [۵]

یحییٰ بن سعیدؒ کا بیان ہے کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا سعید بن المسیب سے قرآن مجید

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲)

علاوہ بریں بعض الفاظ ایسے بھی تھے جن کی مراد حضرت ابن عباسؓ کو معلوم نہیں ہو سکی۔ خود ان کا بیان ہے "قرآن میں چار الفاظ کے معنی مجھکو دریافت نہیں ہو سکے۔ غسلین۔ حنان۔ اواہ۔ رقیم۔" (الاتقان ج ۱ ص ۱۱۳)

[۵] تفسیر ابن جریر ج ۱ ص ۲۸۔

کی کسی ایک آیت کی نسبت دریافت کر رہا تھا۔ مگر آپ نے جواب دیا "میں قرآن سے متعلق کچھ نہیں کہوں گا" ۵۱

حضرت شعبیؒ فرماتے تھے "تین چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق میں مرتے دم تک کچھ نہیں کہہ سکتا۔ قرآن۔ روح اور قیاس" ۵۲

اصمعیؒ کو کون نہیں جانتا، لغت و ادب کا کتنا بڑا امام تھا۔ برسوں تحقیق لغات۔ صحیح محاورات اور ان کے معانی کی فکر میں عرب کے جنگلوں کی خاک چھانتا پھرا ہے اور لفظ لفظ کے لئے عرب کے بدوؤں میں برسوں تک قیام کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن مجید کی تفسیر میں بالکل خاموش رہتا تھا۔ اس سے کسی آیت کی نسبت دریافت کیا جاتا تو کہتا "عرب اس کے یہ معنی بیان کرتے ہیں میں نہیں جانتا اس سے کیا مراد ہے؟" ۵۳

ابو طیب کہتا ہے "اصمعی بے حد خدا پرست تھا وہ قرآن کی کسی آیت کی تفسیر نہ کرتا تھا"

اس درجہ احتیاط کا سبب

غور کیجئے! آخر وہ کونسی بات تھی جس کی وجہ سے یہ اکابر علم و ادب اور ائمہ عربیت و لغت بھی قرآن مجید سے متعلق گفتگو کرنے میں اس درجہ احتیاط کرتے تھے۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ یہ حضرات تفسیر قرآن کی اہم ذمہ داری کا کامل احساس رکھتے تھے اور تفسیری اہلیت پیدا کرنے کے لئے جن صفات و اوصاف کی ضرورت ہے یہ حضرات ان میں خواہ کیسا ہی مرتبۂ کمال رکھتے ہوں۔ تاہم انھیں تفسیر قرآن کی عظیم الشان ذمہ داری کے پیش نظر اپنے متعلق پورا بھروسہ نہیں ہوتا تھا اور اس بنا پر اس باب میں جارت سے کام لیتے ہوئے ان کو تردد ہوتا تھا اور حتی الوسع وہ اس سے سبکدوش رہنا چاہتے تھے۔

تفسیر بالرائے پر وعید اور اس کا مطلب

اس موقع پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ بعض لوگ صحابہ کی اس احتیاط کا سبب ان احادیث و آثار کو بناتے ہیں جن میں اپنی رائے سے قرآن مجید کے بارہ میں کلام کرنے سے منع کیا گیا ہے یہ شدید قسم کی غلط فہمی ہے جس کے ازالہ کے لئے ہم ذیل میں

---

۵۱ و ۵۲ تفسیر ابن جریر طبری ج ۱ ص ۲۸ - ۵۳ المزہر ج ۲ ص ۴۰۲

یہ روایتیں نقل کرتے ہیں اور پھر ان کا مطلب لکھیں گے۔

ان احادیث میں سب سے زیادہ مشہور وہ روایت ہے جو ابوداؤد، ترمذی، اور نسائی میں ہے اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

من تکلم فی القرآن بغیر علم	جو شخص علم کے بغیر قرآن کے بارہ میں کچھ کہتا ہے اس کو
فلیتبوأ مقعدہ من النار	چاہیئے کہ دوزخ کو اپنا ٹھکانہ بنالے۔

ابوداؤد سے ایک اور روایت اسی مضمون کی مذکور ہے جس میں بجائے تکلم کے قال ہے دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔ اسی طرح کی ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے انھیں لفظوں سے مروی ہے جو ابن جریر ج اص ۲۶ پر مذکور ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ قول بھی اس سلسلہ میں بہت مشہور ہے۔

ای ارض تقلنی وای سماء	مجھکو کون سی زمین اٹھائیگی اور کون سا آسمان
تظلنی اذا قلت فی القرآن	مجھ پر سایہ گستر ہوگا جبکہ میں قرآن میں وہ بات
مالا اعلم (ابن جریر ج اص ۲۶)	کہوں جسے میں نہیں جانتا۔

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن مجید کے معانی میں غور و خوض اور اس سے احکام و مسائل کا استنباط ہی سرے سے ممنوع کر دیا گیا ہے کیونکہ قرآن نے خود جگہ جگہ اپنی آیات میں غور و تدبر کی دعوت دی ہے اور ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو ان میں انہماک رکھتے اور قرآن کے حقائق پر غور کرتے ہیں ارشاد ہے۔

کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ	یہ وہ مبارک کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل
لِیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَكَّرَ	کی ہے تاکہ لوگ اس کے آیات میں تدبر کریں اور عقلمند
اُولُوا الْاَلْبَابِ۔	اس سے نصیحت پذیر ہوں۔

اس کے بالمقابل جو لوگ قرآن مجید میں تدبر نہیں کرتے ان کی مذمت کی گئی ہے فرمایا گیا ہے

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ	کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا دلوں پر تالے

Marfat.com

أَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ پڑے ہوئے ہیں۔

اس بنا پر جس حدیث میں قرآن مجید کے متعلق علم کے بغیر گفتگو کرنے کی ممانعت کی گئی ہے اس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ جو لوگ فہم قرآن کا سلیقہ نہیں رکھتے یعنی اس کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے اور جو فہم قرآن کے باب میں مبادی اور اصولِ موضوعہ کا حکم رکھتی ہیں وہ ان سے بے خبر ہیں۔ ان لوگوں کو محض قیاس و تخمین سے قرآن مجید کے احکام و مسائل یا حقائق و معانی کے بارہ میں گفتگو کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

غور کیجئے دونوں روایتوں میں "بغیر علم" کے الفاظ ہیں۔ اس بنا پر روایت کا مطلب یہی ہوگا کہ جو لوگ نہ جاننے کے باوجود قرآن کے بارہ میں آزادی کے ساتھ لاابالیانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں وہ اللہ کی وعید کے مستحق ہیں۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس بنا پر اس قدر شدید وعید کی گئی ہے ورنہ ہر شخص جانتا ہے کہ بغیر علم کے ایک قرآن کیا کسی مسئلہ پر بھی گفتگو کرنا شیوۂ دانشمندی سے بعید ہے۔ ایک عام اور مشہور شعر ہے۔

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند ... در جہلِ مرکب ابد الدہر بماند[1]

فہم قرآن کے شرائط

بات ذرا طویل ہو گئی۔ بہر حال اب یہ حقیقت ذہن نشین ہو گئی ہو گی کہ فہم قرآن کا معاملہ ایسا آسان نہیں ہے کہ ہر شخص خواہ اہل ہو یا نہ ہو کلام الٰہی کی نسبت طبع آزمائی کرنے لگے۔ لامحالہ دنیا کے عام قاعدہ و قانون کے مطابق اس کے لئے بھی کچھ شرائط اور اصول ہوں گے جن کو حاصل کر لینے کے بعد ہی ایک شخص قرآن مجید میں غور و تدبر اور فکر و تامل کا اہل ہو سکتا ہے۔ اب ہمیں انھیں امور پر غور کرنا ہے جن کے بغیر فہم قرآن کی سعادت کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ بنیادی

---

[1] علامہ سید محمود آلوسی نے ابو داؤد، ترمذی اور نسائی کی ان روایتوں پر اسنادی حیثیت سے کلام کیا ہے اور المدخل کے حوالہ سے ان کو ضعیف کہا ہے۔

(روح المعانی ج ۱ ص ۶)

لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ اگر ان روایتوں کو صحیح مان لیا جائے تب بھی ان سے مطلقاً تکلم فی القرآن کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی۔

طور پر یہ چیزیں دو قسم کی ہیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق علوم وفنون سے ہے جو کسب واکتساب سے حاصل ہوتی ہیں اور دوسری قسم کی چیزوں کا تعلق عمل اور کردار سے ہے۔ اب ہم ان دونوں کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

عربیت قرآن کو سمجھنے کے لئے پہلی اور ابتدائی شرط عربیت ہے کیونکہ ظاہر ہے قرآن عربی میں نازل ہوا۔ اور اس کے اولین مخاطب عرب ہی تھے۔ قرآن میں خود متعدد مواقع پر اس کا اظہار کیا گیا ہے۔

(۱) إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا ۔ ۲/۱۲ — ہم نے اس کتاب کو عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے۔

(۲) وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۳۷/۱۳ — اسی طرح ہم نے اس کو عربی میں حکم بنا کر اتارا ہے۔

(۳) بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۱۹۵/۲۶ — کھول کر بیان کرنیوالی عربی زبان میں اتارا ہے۔

(۴) إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۳/۴۳ — بے شبہ ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر اتارا ہے تاکہ تم سمجھو۔

(۵) فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۵۸/۴۴ — ہم نے اس کو تیری زبان میں آسان کر دیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

(۶) وَهَٰذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا ۔ ۱۲/۴۶ — اور یہ ایک کتاب ہے جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرنیوالی ہے اور عربی زبان میں ہے۔

ذوق لسانی لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ عربیت سے مراد عربی زبان کی صرف اتنی استعداد نہیں ہے کہ کوئی شخص عربی سے اردو میں یا کسی اور زبان میں ترجمہ کر سکے۔ صرف اتنی استعداد سے ایک شخص قرآن کی اجمالی مراد تو سمجھ سکتا ہے لیکن جب تک اس کا ذوقِ عربیت پختہ نہیں ہوگا اور امام شافعیؒ کے بقول جب تک اس میں کسی عربی عبارت کو عربی کے ہی انداز فہم وتعبیر کے مطابق سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی وہ قرآن مجید کے بلیغ اسلوب بیان اور اس کے مخصوص انداز تعبیر سے واقف نہیں ہو سکیگا اور اس بنا پر قرآنی مفہوم ومطلب کے بہت سے گوشے اور پہلو ایسے ہوں گے جو اس کے

عقل وفہم کی گرفت میں نہ آسکیں گے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کوئی عربی کی ہی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہر زبان کا یہی قاعدہ ہے کسی زبان کو جاننے اور بولنے والے سب کے سب یکساں نہیں ہوتے۔ وہی ایک سادہ سا فقرہ اور جملہ ہوتا ہے کہ ایک عامی اور بدذوق اردو داں اسے سنتا ہے اور اس پر خاک اثر نہیں ہوتا۔ لیکن ایک صاحبِ ذوق اسے سنتا ہے تو بے اختیار ہو کر سر دھننے لگتا ہے۔ اور اس جملہ میں اس کو حقائق و معانی کا ایک دفتر نظر آتا ہے۔ استاد مومن کا یہ شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کتنے لوگوں نے پڑھا ہوگا لیکن مرزا غالب نے سنا تو کہنے لگے اے کاش! مومن یہ ایک شعر مجھے دیدیتے اور اس کے عوض میں میرا پورا دیوان مجھ سے لے لیتے۔

عربی ادب کی عام کتابوں میں ہے کہ ایک مرتبہ عربی لغت وادب کا مشہور امام "اصمعی" نے ایک لڑکی سے سنا یہ دو شعر پڑھ رہی تھی۔

استغفر اللہ لذنبی کلہ　　قتلت انسانا بغیر حلہ

مثل غزال ناعم فی دلہ　　وانتصف اللیل ولم اصلہ

ترجمہ۔ میں خدا سے اپنے تمام گناہوں کی معافی طلب کرتی ہوں کہ میں نے ایک انسان کو بغیر جواز کے قتل کر دیا — میں ایک خوش عیش ہرن کی طرح نازوانداز میں رہی۔ رات آدھی ہوگئی اور میں اس سے نہیں ملی۔

اصمعی نے یہ شعر سنکر کہا "او ہو! تم کس قدر فصیح و بلیغ ہو۔ لڑکی بولی" تم پر افسوس ہے! کیا ان شعروں کو بھی فصیح کہا جا سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا قول۔

وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی اَنْ اَرْضِعِیْہِ　　ہم نے حضرت موسیٰ کی ماں پر وحی کی کہ تم اس کو
فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْہِ فَاَلْقِیْہِ فِی الْیَمِّ　　دودھ پلاؤ اور جب تم کو ان کے متعلق اندیشہ ہو تو اسے
وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَادُّوْہُ　　سمندر میں ڈالدو اور اسپر نہ خوف کرنا اور نہ غمگین ہونا

إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ   ہم بے شبہ اس کو تمہاری طرف لوٹا ئینگے اور پیغمبر بنائیں گے

ان آیات کو پڑھنے کے بعد لڑکی نے کہا "اصمعی! تم دیکھتے نہیں ان میں خدا نے کس طرح دو امر، دو نہی اور دو بشارتیں جمع کر دی ہیں۔

بہر حال فہم قرآن کے لئے صرف عربی دانی کافی نہیں۔ بلکہ عربیت کا ذوقِ صحیح درکار ہے اور خوب اچھی طرح یاد رکھئے کہ یہ ذوق محض مقاماتِ حریری، دیوانِ متنبی اور دیوان حماسہ، یا ایم اے عربی کورس پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ایک مدت دراز درکار ہے۔ ذوق سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو عربی کلام پڑھتے وقت وہی لذت وسرور حاصل ہو جو اس کو خود اپنی زبان کا اچھا شعر سن کر حاصل ہوتا ہے۔ وہ عربی کے تمام محاورات، ان کے مواقع استعمال سے پورا واقف ہو۔ ایک مفہوم کو مختلف طریقہائے بیان سے ادا کیا جا سکتا ہے، وہ جانتا ہو کہ ایک طریقہ کو دوسرے طریقہ بیان پر کیا تفوق حاصل ہے۔ فرض کیجئے ایک جملہ تین لفظوں سے مرکب ہے۔ زید آیا اور آج۔ ہر صاحبِ ذوق جانتا ہے کہ ان میں ترتیب بدل دیجئے تو جملہ کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ ذوق سے غرض یہ ہے کہ وہ ان باریک باریک فروق سے بھی واقف ہو۔

بعض اوقات کسی کلام میں کوئی لفظ محذوف ہوتا ہے اور اس بنا پر مختلف معنی مراد لئے جا سکتے ہیں، لیکن اہلِ زبان کے نزدیک اس کا صرف ایک ہی مفہوم ہو سکتا ہے اور وہاں وہی مراد ہوتا ہے۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور واقعہ ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ اپنے ایک پشاوری مرید سے فرمایا جس کو دہلی میں رہتے ہوئے ایک مدت ہو گئی تھی "میاں ذرا صراحی اٹھا لانا اور دیکھنا پیٹ پکڑ کر اٹھانا" سمجھدار مرید نے کیا کیا۔ ایک ہاتھ سے صراحی کی گردن پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے اپنا پیٹ پکڑا۔ اور اس شان سے صراحی حضرت شیخ کے سامنے لا کر رکھدی۔

اس واقعہ سے آپ کو زبان دانی اور ذوقِ زبان کا فرق بیّن طور پر معلوم ہو جائیگا۔ یہ پشاوری مرید عرصہ سے دہلی میں رہنے کے باعث اردو کا زبان داں ضرور ہو گیا تھا لیکن زبان کے ذوق سے

بالکل بے بہرہ تھا۔ ورنہ اسے معلوم ہوتا کہ حضرت مرزا کے جملہ "پیٹ پکڑ کر اٹھانا" میں اگرچہ یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ پیٹ کس کا ہوگا۔ صراحی کا یا خود اس کا اپنا" تاہم اہلِ زبان کے نزدیک اس کا صرف ایک ہی مفہوم ہو سکتا ہے اور وہ ہے "صراحی کا پیٹ" اور اس کو جاننے کے لئے محض زبان دانی کافی نہیں بلکہ ذوقِ لسانی درکار ہے۔

اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ بولا جاتا ہے لیکن کسی خاص موقع پر اس سے مراد اس کے اصل معنیٰ نہیں ہوتے بلکہ اس کے برخلاف اس کی ضد مراد ہوتی ہے۔ مثلاً آپ ایک مریض کے پاس اس کی عیادت کے لئے جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کیا حال ہے؟ مریض جواب میں کہتا ہے "اچھا ہوں"

اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں کہ اس جملہ کے دو متضاد مفہوم ہو سکتے ہیں فرق صرف لب و لہجہ کا ہے۔ اگر مریض نے بیماری کی درازی اور صحت سے مایوسی کے عالم میں حسرت آمیز لہجہ سے "اچھا ہوں" کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اچھا نہیں ہوں۔ اس وقت مریض کا یہ اچھا کہنا شعر ذیل کا مصداق ہے

پوچھنے والوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ۔ جس نے پوچھا حالِ دل کہنا پڑا کچھ بھی نہیں

اور اگر بیمار نے انبساطِ خاطر کے ساتھ اپنے تئیں اچھا کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ واقعی وہ اب اچھا ہے۔

بسا اوقات جملہ استفہامیہ بولا جاتا ہے اور اس سے غرض کسی شے کے متعلق کچھ دریافت کرنا بھی ہو سکتا ہے اور استفہام انکاری کے طور پر کسی سے انکار کرنا یا بطور استفہام اقراری کسی بات کا اقرار کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک شخص جو زبان کے ذوق سے بہرۂ وافر رکھتا ہے اس جملہ کو سنتے ہی معلوم کر لیتا ہے کہ یہاں متکلم کی مراد کیا ہے۔

ہر کلام کا صحیح مفہوم ایک ہی ہوتا ہے

علماءِ بلاغت نے اسی بناء پر سچ کہا ہے کہ الفاظ میں ترادف ہے ہی نہیں اور ایک کلام کا مطلب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، غیر زباں داں طرح

طرح کی تاویلیں اور دور از کار توجیہیں کرتا ہے لیکن صحیح مخاطب جب اس کلام کو سنتا ہے تو فوراً ایک ہی مفہوم متعین کر لیتا ہے اور اس کو توجیہاتِ مختلفہ کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے پھرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

بلاغت کے مختلف مدارج و مراتب

یہاں اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ بلاغت کے مدارج و مراتب لا محدود ہیں یعنی کسی کلام کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس پر بلاغت ختم ہے، کیونکہ بلاغت کی تعریف ہے کلام کا مقتضئ حال کے مطابق ہونا، اور ذرا ذرا سے فرق سے حال اور مقتضئ حال کی مطابقت کی اس قدر قسمیں پیدا ہوتی ہیں کہ ان کا کوئی شمار ہی نہیں ہو سکتا اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ فلسفۂ اخلاق میں کسی قوت کے اعتدال سے جو ملکہ پیدا ہوتا ہے، فضیلت کہلاتا ہے اور اس کے برخلاف قوت کی افراط یا تفریط سے جو ملکات پیدا ہوتے ہیں، رذائل کہلاتے ہیں لیکن کسی ملکہ کا اچھا یا برا ہونا ایک دوسرے کے اعتبار سے ہی متصور ہو سکتا ہے درحقیقت اس کے اقسام کی تحدید و تعیین نہیں کی جا سکتی۔ تھوڑے تھوڑے فرق و امتیاز سے اور قوتِ اعتدال کی کمی و بیشی کے لحاظ سے جس طرح رذائل بے شمار نکل آتے ہیں فضائل بھی ان کے بالمقابل لاتعداد پیدا ہوتے جاتے ہیں، ٹھیک یہی حال بلاغت کے مدارج و مراتب کا ہے ایک کلام خواہ کتنی ہی بلاغت رکھتا ہو، کسی دوسرے کلام سے کمتر ہو سکتا ہے، ایک طرف بلاغت کے مدارج کا لامحدود ہونا پیشِ نظر رکھئے اور دوسری طرف علماء بلاغت کا یہ فیصلہ دیکھئے کہ قرآن بلاغت کے اس انتہائی مرتبہ کو حاوی ہے جو کسی کلام کے لئے انتہائی سے انتہائی مرتبہ ہو سکتا ہے۔

اس بیان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ عربیت کے ذوقِ صحیح سے مراد کیا ہے؟ مقصد یہ ہے کہ ائمۂ عرب کے کلام کی مزاولت و ممارست سے ایک ایسا پختہ ذوق پیدا ہو جائے کہ وہ عربی کلام کے مدلول و منطوق کو پورے طور پر سمجھ سکے، اس کے اشارات و کنایات سے واقف ہو، الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کر سکے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کو فصیح و بلیغ کلام سن کر حقیقۃً حظ آئے، اور برے کلام سے اس کے ذوق کو صدمہ پہنچے۔

Marfat.com

بس یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص کا ذوق جس قدر زیادہ لطیف و پاکیزہ ہوگا اسی قدر وہ کلام بلیغ کی مخلوظ و شاد کام ہوگا اور اس کو اس میں زیادہ سے زیادہ باریکیاں نظر آئیں گی۔

اس طرح کا ذوقِ عربیت سالہا سال کی عرق ریزی، محنت و کاوش عمیق و وسیع مطالعہ اور بہترین دماغی و ذہنی صلاحیتوں کے کارآمد بنانے کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے اور چونکہ قرآن مجید بلاغت کے مرتبۂ قصویٰ پر حاوی ہے، اس لئے کوئی شخص بجز ان بزرگانِ کرام کے جن کو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مشکوٰۃِ نبوت سے منور کیا ہو، دعوی کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی آیت کا مطلب وہی ہے جو اس نے سمجھا ہے۔

دنیوی امور میں ماہرین کی طرف مراجعت کی جاتی ہے

جو لوگ دین کے معاملہ میں اس درجہ متساہل واقع ہوئے ہیں غور کریں دنیوی معاملات میں خود ان کی تقلید کا کیا عالم ہے۔ آپ کسی شخص کو اس وقت تک ڈاکٹر تسلیم نہیں کرتے جب تک اس نے باقاعدہ کسی اسکول یا کالج میں ڈاکٹری کا کورس پورا نہ کیا ہو کسی شخص کے قانونی مشورہ کو اس وقت تک در خورِ اعتنا نہیں سمجھتے جب تک اس نے باقاعدہ وکالت یا بیرسٹری کا امتحان پاس نہ کیا ہو۔ پھر ڈگری کی حیثیت کے اعتبار سے ڈگری یافتہ کے اعزاز و اکرام میں بھی فرقِ مراتب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، ہندوستان کے ایم بی ایس یا ایل ایل بی کے قول کا وہ وزن نہیں ہوتا جو انگلینڈ کی کسی طبی ڈگری یا بیرسٹری کے ڈپلومے والے کا ہوتا ہے "نیم حکیم" کے قول کو آپ ہمیشہ "خطرۂ جان" سمجھتے ہیں۔ پھر حیرت ہے کہ دین کے معاملہ میں آپ "نیم مولوی" کے فتوے کو "خطرۂ ایمان" قرار نہیں دیتے۔ ترجمہ کی مدد یا عربی کی معمولی شُد بُد حاصل کر لینے سے کسی کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ مدعیانہ رنگ میں ان لوگوں کے مقابل آئے جنھوں نے اپنی عمریں ان ہی علوم اسلامیہ کی خدمت میں بسر کی ہیں اور جنھوں نے اپنی زندگی کی تمام راحتوں اور آسائشوں کو برباد کر کے قرآنی حقائق و معانی کی چھان بین میں خونِ جگر پیا ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ آپ سائل کی حیثیت سے اپنے شکوک و شبہات کو علمائے کرام کے سامنے پیش کریں اور ان سے جواب کے طالب ہوں، لیکن آپ کے لئے یہ کبھی جائز نہیں ہو سکتا کہ چند

Marfat.com

مخصوص خیالات کو ذہن میں رکھکر عربیت سے بالکل ناواقف ہونے کے باوصف آپ مجتہدانہ انداز میں کلام کرنے کی جسارت کریں، اور جب امام کی بات آپ کے خیال کے مطابق نہ ہو آپ اس پر بے تکلف تبرا شروع کردیں۔ پس آپ کے لئے دو صورتوں کے سوا کوئی اور تیسری صورت نہیں ہے یا خود عربیت کا ذوق پیدا کیجئے علوم اسلامیہ کی تحصیل کرکے ان میں بصیرت و نظر حاصل کیجئے اور اگر یہ نہیں ہے تو ائمۂ اسلام پر اعتماد کیجئے اور ان کی بات مانئے۔ آج ہر وہ شخص جو فہم قرآن کا مدعی ہے اس کو بتانا چاہئے کہ وہ کہاں تک اس دعوے کا اہل ہے۔ قرآن بیشک آسان ہے لیکن کسی شے کے آسان ہونے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس کے سمجھنے کے لئے نہ اس کے مبادی جاننے کی ضرورت ہے اور نہ اس کے لئے کچھ اصولِ موضوعہ ہیں جن کو سمجھنا اور جن پر غور کرنا ضروری ہو۔

تفسیر کی تعریف ابو حیان الاندلسی صاحبِ بحر المحیط نے تفسیر کی تعریف اس طرح کی ہے۔

ھو علم یبحث فیہ عن کیفیۃ النطق	وہ ایک ایسا علم ہے جس میں قرآن مجید کے
بالفاظ القرآن ومدلولاتھا واحکامھا	الفاظ کی کیفیت نطق سے۔ الفاظ کے مدلولات
الافرادیۃ والترکیبیۃ ومعانیھا	اس کے احکام افرادی وترکیبی اور ان کے
التی یحمل علیھا حالۃ الترکیب	ان معانی سے جن پر الفاظ بحالتِ ترکیب
وتتمات لذالک۔	محمول کئے جاتے ہیں بحث کی جاتی ہے۔ اور
	ان کے علاوہ چند اور تتمات بھی ہیں جن کا علم مفسر کیلئے ضروری ہے

علامہ سید مرتضیٰ زبیدی اس قول کو احیاء العلوم للامام الغزالی کی شرح میں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"ابو حیان کے اس قول میں علم جنس ہے اور اس کے بعد جو قیود آئی ہیں وہ بمنزلہ فصل ہیں چنانچہ یبحث فیہ عن کیفیۃ النطق بالفاظ القرآن" سے مراد علم قرأت ہے۔ و مدلولاتھا" سے مراد انھیں الفاظ قرآن کے مدلولات ہیں اس کا مصداق متن علم لغت ہے

جس کے بغیر الفاظِ قرآن کے مدلولات کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ "احکامها الافرادیة والترکیبیة" اس کے لئے علم تعریف، بیان اور بدیع کی ضرورت ہے "معانیها" سے مراد یہ ہے کہ مفسر کو معانی پر الفاظ کی دلالتِ حقیقی اور دلالتِ مجازی سے واقفیت ہو۔ کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ترکیب اپنے ظاہر کے اعتبار سے کسی چیز کا اقتضا کرتی ہے لیکن اس کے لئے کوئی مانع ہوتا ہے تو اب لفظ سے کوئی معنی مجازی مراد لینے پڑتے ہیں۔

پھر آخر میں ابو حیان نے "وتتمات" جو کہا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ مفسر کو نسخ اور سببِ نزول وغیرہ کا علم ہونا چاہئے تاکہ قرآن میں جو باتیں مبہم ہیں وہ معلوم ہو سکیں۔ لـه

ابو حیان کا یہ بیان تو قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق عام شرائط پر مشتمل ہے۔ اب ہم ذیل میں خاص عربیت کی شرط سے متعلق بعض ائمہ عربیت کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ

دو اماموں کی رائے

امام ابو بکر الباقلانی فرماتے ہیں۔

من زعم انه یمکنه ان یفهم	جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ وہ خود بلاغت
شیئاً من بلاغة القرآن بدون	کی مشق و ممارست کئے بغیر قرآن مجید کی
ان یمارس البلاغة بنفسه فهو	بلاغت کو تھوڑا بہت سمجھ سکتا ہے وہ جھوٹا
کاذبٌ مُبطِلٌ۔ لـه	اور باطل گو ہے۔

امام موصوف نے تو صرف بلاغتِ قرآن تک ہی بات محدود رکھی ہے، علامہ سید رشید رضا نے "تفسیر المنار" میں لکھا ہے کہ عربیت کے بغیر کوئی شخص قرآن مجید سے نصیحت پذیر بھی نہیں ہو سکتا کہتے ہیں:-

لایتّعظُ الانسانُ بالقرآن	کوئی شخص قرآن مجید سے نصیحت پذیر نہیں ہو سکتا
فتطمئن نفسه بوعده و	بایں معنی کہ کچھ اس کا نفس قرآنی وعدوں پر مطمئن ہو جائے
تخشعُ لوعیده الا اذا عرف	اور وعید سے لرز جائے جب تک کہ اس کے معانی کو

لـه ج ۴ ص ۵۲۶۔ لـه الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی

Marfat.com

معانیہ وذاق حلاوۃ — سمجھنے کی اہلیت پیدا نہیں کر لیتا اور اس کے طریقہائے
اسالیبہ — بیان کی شیرینی محسوس کرنے نہیں لگتا۔

بیہقیؒ بیان کرتے ہیں امام مالکؒ فرماتے تھے کہ اگر میرے پاس کوئی ایسا شخص لایا جائے جو عربی زبان سے واقف نہ ہو اور اس کے باوجود کلام اللہ کی تفسیر کرتا ہو تو میں اس شخص کو سزا دونگا۔[۱]

مجاہدؒ کا مقولہ ہے جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اللہ کی کتاب کے متعلق کلام کرے۔ اگر وہ لغاتِ عرب کو نہیں جانتا۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا جو شخص عربیت سے ناواقف ہے وہ بسا اوقات ایک آیت پڑھتا ہے اور اس طرح کسی لفظ کو پڑھتا ہے کہ وہ اس کے لئے باعثِ ہلاکت بنجاتا ہے۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید نے اپنی نسبت آسان ہونے کا دعویٰ کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے خود علم کے اعتبار سے لوگوں میں تفریق کی ہے۔ ارشاد ہے۔

لَعَلِمَہُ الَّذِینَ یَستَنبِطُونَہُ مِنھُم — اس کو وہی لوگ جانتے ہیں جو احکام کا استنباط کر سکتے ہیں۔

دیکھئے جہاں تک نصیحت حاصل کرنے کا تعلق ہے صاف طور پر فرمایا جاتا ہے "وَلَقَد یَسَّرنَا القُرآنَ لِلذِّکرِ" کسی عالم و غیر عالم کی تخصیص نہیں کی جاتی۔ لیکن جب اس کے علم کا ذکر کیا جاتا ہے تو اسے ان لوگوں کے ساتھ مخصوص کر دیا جاتا ہے جو مفہومِ کلام پر پورے طور سے حاوی ہو کر احکام کا استنباط کر سکیں۔ اور ظاہر ہے یہ سلیقہ ذوقِ عربیت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

کسی زبان کے ادب و بلاغت کا ذوق ایک نعمتِ خداداد ہے، تاہم اس کے استوار ہونے میں اس زبان کے علوم صرف و نحو، معانی و بلاغت سے بڑی مدد ملتی ہے۔ جب تک اسلام عرب میں محدود رہا اس وقت تک علومِ عربیہ میں سے نہ کوئی علم و فن مدون ہوا تھا اور نہ کسی علم کی ضرورت تھی۔ قواعد زبان سے بنتے ہیں نہ کہ زبان قواعد سے۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ صحابہ میں قرآن مجید کی

---

[۱] شرح احیاء العلوم للمرتضیٰ الزبیدی ج ۲ ص ۵۲۹۔

Marfat.com

تفسیر کے متعلق اختلاف بہت کم نظر آتا ہے لیکن جب قرآن کی اشاعت عربی زبان نہ جاننے والے ملکوں میں ہوئی اور وہ لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے تو اب ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کو قرآن فہمی کے قابل بنانے کے لئے عربیت کے علوم وفنون کو مدون کیا جائے۔ چنانچہ صرف ونحو اور دوسرے علوم کی تدوین عمل میں آئی۔

غور کرنا چاہیئے جب تک معاملہ اہل زبان تک محدود رہا کسی علم وفن کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی لیکن جب ان سے گذر کر عجمی اقوام تک اس کی رسائی ہوئی تو محض قرآن مجید کو صحیح پڑھنے اور اس کو سمجھ سکنے کے لئے ان تمام علوم وفنون عربیہ کی داغ بیل پڑی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب تک کوئی شخص عربیت کے تمام علوم جن کی تعداد علماء نے چودہ لکھی ہے بدرجۂ کمال حاصل نہیں کرے گا اسے حق نہیں ہے کہ قرآن کی کسی آیت کے متعلق اپنی ذاتی رائے پیش کر سکے اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ خود مریض ہے تو اطباء پر اعتماد کرے اور ان کے تجویز کئے ہوئے نسخہ کو اپنے لئے پیام شفا سمجھے۔

یہاں یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے لئے صرف عربی زبان وادب پر عبور حاصل کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ اس سلسلہ میں الفاظ مفردہ جو قرآن مجید میں آئے ہیں ان کے حقائق سے پورے طور پر باخبر رہنا ضروری ہے یعنی ان الفاظ کے لغوی معانی سے گذر کر معلوم کرنا چاہیے کہ نزول قرآن کے زمانہ میں یہ الفاظ کن معانی میں استعمال ہوتے تھے۔ مثلاً تاویل کا لفظ ہے کہ نزول قرآن کے بہت بعد تفسیر کے معنی میں بولا جانے لگا لیکن خود قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں نہیں آیا ہے۔ مثلاً آیت ذیل میں۔

هَلْ يَنظُرُونَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ (الاعراف)

کیا یہ لوگ اس بات کے منتظر ہیں کہ فساد وبدعملی کے جس نتیجہ کی اس میں خبر دی گئی ہے اس کا مطلب وقوع میں آ جائے جس دن اس کا مطلب وقوع میں آئیگا اس دن وہ لوگ کہ اسے پہلے سے بھول گئے تھے کہیں گے بے شبہ ہمارے پاس ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس شخص کو بھی تفسیر بالرائے کی وعید کا مستحق بتایا ہے جو علوم عربیت سے ناآشنا ہونے کے باوجود تفسیر کی جرأت کرتا ہے۔ چنانچہ تفسیر بالرائے کا مطلب اور اس کا مصداق و مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

الثانی ان یتسارع الی تفسیر القرآن	تفسیر بالرائے کا دوسرا مصداق یہ ہے کہ کوئی
بظاہر العربیۃ من غیر استظہار	شخص لفظوں کی محض ظاہری شکل و صورت کو
بالسماع والنقل فیما یتعلق بغرائب	دیکھکر تفسیر قرآن کی جرأت کرے اور قرآن مجید
القرآن وما فیہ من الالفاظ المبہمۃ	میں جو غرائب ہیں اور ان کے علاوہ جو الفاظ
والمبدلۃ وما فیہ من الاختصار۔	مبہم، مبدلہ یا اور جو اختصار ہے ان کے حل کرنے
	میں سماع اور نقل سے مدد نہ لے۔

کتنے ہی لفظ ہیں جن کے معنی نزولِ قرآن کے وقت کچھ اور تھے اور دو ایک صدیوں کے بعد وہ کسی اور معنی میں مستعمل ہونے لگے۔ پس جو شخص فہم قرآن کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کے کسی لفظ سے وہی معنی مراد لے جو عہد نبوت میں اس سے مراد لئے جاتے تھے۔

اصوات و لہجاتِ عرب کا علم

عربیت اور اس سے متعلقہ علوم و فنون کے ساتھ فہم قرآن کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان تمام لہجوں اور آوازوں سے واقفیت پیدا کی جائے جو نزول قرآن کے وقت عرب میں مستعمل تھے اور پھر اس کا سراغ لگایا جائے کہ قرآن ان میں سے کس کس لہجہ اور آواز پر نازل ہوا ہے ورنہ اس علم کے بغیر فہم قرآن کی کوشش گمراہی کا سبب بن سکتی ہے مثلاً سورۂ نمل میں حضرت سلیمانؑ کے قصہ میں ہے "اولا اذبحنہ" جو شخص قراءِ عرب کی قراتوں اور ان کی خصوصیتوں سے واقف نہیں ہے وہ اس فقرہ کا ترجمہ نفی کے ساتھ کریگا یعنی یہ کہ "میں اس کو (ہدہد) ذبح نہیں کروں گا" لیکن اس کے برخلاف لہجاتِ عرب سے باخبر شخص فوراً سمجھ لیگا کہ دراصل یہ "لا" لائے نافیہ نہیں ہے بلکہ لام کے فتحہ کو ذرا کھینچ دینے کی وجہ سے صورت "لا" کی ہوگئی ہے

اور اسی لہجہ کے مطابق اس لفظ کی قرآن میں کتابت بھی ہوئی ہے۔

لہجہ کا اختلاف تو ایک ایسی چیز ہے کہ خود صحابۂ کرام کو بعض مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں استفسار کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ صفوان بن عسال سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو "یا یحییٰ" پڑھتے ہوئے سنا تو عرض کیا "یا رسول اللہ! آپ امالہ کر رہے ہیں حالانکہ یہ تو قریش کا لغت نہیں ہے" آپ نے فرمایا "لیکن ان کے ماموں بنو سعد کا لغت ہے"[1]

دوسری شرط ان علومِ رسمیہ میں کمال حاصل کرنے کے ساتھ دوسری چیز جو قرآن کے مطالب کو بصیرت کے ساتھ سمجھنے کے لئے ازبس ضروری ہے، وہ نورِ بصیرت ہے، یا دوسرے لفظوں میں اسے "ذوقِ قرآنی" کہہ سکتے ہیں۔ ایک قرآن پر ہی کیا موقوف ہے، دنیا کا کوئی علم و فن ایسا نہیں ہے جس میں کمال اور مجتہدانہ نظر پیدا کرنے کے لئے عام فطانت و ذکاوت کے علاوہ اس علم کے ساتھ ایک فطری لگاؤ ضروری نہ ہو۔ علی گڈھ سے ہزاروں نے بی اے اور ایم اے کا امتحان پاس کیا، لیکن محمد علی مرحوم کی طرح انگریزی کے بہترین ادیب کتنے پیدا ہوئے۔ دیوبند نے ہزاروں علماء کو سندِ فراغت تقسیم کی۔ لیکن ان میں ایسے کتنے ہیں جو حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہؒ کی سی نظرِ بصیرت رکھتے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی انسان کو کسی خاص فن کے ساتھ دلچسپی ہوتی ہے تو اس کی نظر اس فن کے مسائل کے لئے ایک بیگانہ کی نہیں بلکہ آشنائے دیرینہ کی نظر ہوتی ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کام میں کامیابی کا مدار ایک بڑی حد تک اس سے دلچسپی اور فطری لگاؤ پر ہوتا ہے۔ ڈاکٹری کا اعلیٰ سے اعلیٰ امتحان پاس کرنے والے کیا سب ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ پھر بیرسٹری کی ڈگری رکھنے والے کیا حذاقتِ فن اور کمالِ پیشہ اور مہارتِ قانون کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے؟

یہ چیز مزید بحث و نظر کی محتاج نہیں ہے۔ ہر شخص بداہۃً اس کو جانتا ہے مگر کیا کیجئے

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۹۱۔

اس زمانہ میں جس طرح بعض پرانی نظری باتیں بدیہی بن گئی ہیں۔ اس کے برخلاف بعض بالکل بدیہی اور مسلم حقیقتیں بھی نظر و فکر کے حجاب میں پوشیدہ ہوتی جارہی ہیں۔

کسی فن کے ساتھ یہ فطری لگاؤ اور اس کا ذوقِ صحیح بالکل خداداد بات ہے۔ یہ نعمت ہر ایک شخص کے حصہ میں نہیں آسکتی۔ اس بنا پر اگر ہم اس فن کے کسی ماہر خصوصی کی طرف نسبت کر کے یوں کہہ دیں کہ ہر شخص اس جیسا نہیں ہوسکتا تو کوئی شبہ نہیں کہ ہمارا یہ کہنا بالکل درست اور بجا ہوگا۔ اسی طرح ہم اگر یوں کہیں کہ قرآن مجید کو ہر شخص حضرت ابن عباسؓ یا حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کی طرح نہیں سمجھ سکتا تو اہلِ انصاف جانتے ہیں ہمارا یہ کہنا سراسر حق ہے کوئی شخص اس کی تکذیب نہیں کرسکتا، اب اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھئے اور دیکھئے ایک برخود غلط گریجویٹ کس قدر مضحکہ انگیز بات کہتا ہے۔

"قرآن سب سے زیادہ آسان کتاب ہے۔ نہ یہ ما بعد الطبیعۃ کا فلسفہ ہے، نہ ریاضی کی کتاب کہ اس کے لئے تحقیق کی جائے، انسان جس کو خدا نے دو آنکھیں اور دو کان اور ایک صحیح دماغ دیا ہے، وہ قرآن کے سمجھنے کا اتنا ہی اہل ہے جتنا کہ ایک علامۃ اللوذعی، قرآن کے سارے احکام پر ہمارا عمل ہونا چاہیے، نہ اس میں کسی تاویل کی ضرورت اور نہ کسی تفسیر کی۔"

اس تقریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فہم قرآن کے لئے اولین طور پر دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک علوم عربیہ کی مہارت اور دوسرا ذوق قرآنی۔ پہلی چیز کسبی ہے اور دوسری وہبی۔ جس طرح کوئی شخص شعر و ادب کے فطری ذوق کے بغیر شاعر و ادیب نہیں ہوسکتا۔ ٹھیک اسی طرح "ذوق قرآنی" کے بغیر فہم قرآن کا اہل بھی نہیں ہوسکتا۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

علامہ سید رشید رضا نے اسی حقیقت کو اس طریقہ پر بیان کیا ہے:۔

"وہ حق جس کے اندر کوئی شک و شبہ نہیں ہوسکتا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

Marfat.com

وہ تمام قرآن لوگوں تک پہنچادیا جو آپ پر نازل ہوا تھا۔ اور اس کو آپ نے وضاحت کے ساتھ بیان بھی کردیا۔ آپ نے علمِ دین کی کسی شے کے ساتھ کسی کو مخصوص نہیں کیا ہے اور نہ علمِ دین میں کسی کو کسی پر فوقیت ہو سکتی ہے البتہ صرف فہمِ قرآن کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جاسکتی ہے اور یہ فہمِ قرآن دو چیزوں سے حاصل ہوتا ہے ایک ان میں کسبی ہے دوسری وہبی۔ کسبی علوم یہ ہیں مثلاً علم السنت، آثار علماء، صحابہ، تابعین، اور صدرِ اول میں جو علماء امصار تھے ان کے اقوال اور مفردات لغت اور اس کے اسالیب وطرق اور اسی طرح دوسرے علوم وفنون ہیں مثلاً علمِ فطرت تاریخ عالم، نفسیاتِ انسان۔ ان سب علوم سے قرآن کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور یہ سب علوم مکتسبہ ہیں جو کوشش اور جد وجہد سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

اور دوسری قسم وہبی ہے اور یہ وہی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے کہ فہمِ قرآن ایک خاص نعمت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے خاص خاص بندوں کو ہی نوازتا ہے۔" اور اس قسمِ ثانی کی وجہ سے ہی علومِ کسبیہ میں مہارت رکھنے والے علماء ایک دوسرے پر باہمی فضیلت وبرتری رکھتے ہیں۔ مگر جو شخص علمِ عربیت سے ناآشنا اور سُنن وآثار سے ناواقف ہے اس کو علمِ وہبی سے بھی کوئی حصہ نہیں ملتا ہے۔ کیونکہ علمِ کسبی تو اصل ہے جو علمِ وہبی کو بطور نتیجہ پیدا کرتا ہے۔"

تیسری شرط اتقاء دنیا کے مختلف علوم وفنون اور مختلف زبانوں میں مہارت اور بصیرت پیدا کرنے کے لئے خاص خاص شرائط ہوتی ہیں، اگر وہ طالب میں پائی جائیں گی تو اس کو اس علمِ خاص میں مہارت پیدا ہو سکے گی ورنہ نہیں۔ شیخ بو علی سینا نے اپنی مشہور کتاب "اشارات" کے آخر میں بڑے زور سے اپنے شاگرد کو نصیحت کی ہے کہ "میری یہ کتاب ہر شخص کو نہ پڑھائی جائے بلکہ ان ہی لوگوں تک اس کو محدود رکھا جائے جو اہلِ جدل وسفسطہ نہیں ہیں اور اگر اس کے خلاف

کیا گیا تو میں خدا کے ہاں تمہارا دامن پکڑوں گا" پس اسی طرح قرآن مجید کے مطالب کو واقعی طور پر سمجھنے کے لئے علوم و فنون کی دستگاہ اور زبانِ عربی کے لطیف ذوق کے علاوہ تیسری اہم چیز "اتقاء" ہے۔

اتقاء سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص روحانی اعتبار سے اس بات کی صلاحیت رکھتا ہو کہ کلام الٰہی کو سن کر اس کا اثر قبول کر سکے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی دوا کتنی ہی مفرح اور مقوی ہو لیکن اگر جسم تندرست نہیں ہے اور معدہ و جگر کے فاسد ہونے کی وجہ سے قوتِ ہاضمہ بے کار اور تولیدِ دم کی صلاحیت مفقود ہو گئی ہے تو وہ دوا اپنا اثر نہیں کر سکتی۔ بلکہ بسا اوقات مضر نتائج کے پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ اسی پر عالمِ روحانی و نفسانی اور اس کے امراض و طرقِ علاج کو قیاس کر لینا چاہیے۔

قرآن مجید نے اپنے تئیں "ھُدًی" "بُشْرٰی" "تذکرہ" اور "نور" کہا ہے مگر ساتھ ہی ان اوصاف کو مطلق نہیں رکھا۔ بلکہ متعدد مواقع پر فرمایا گیا ہے کہ یہ ان ہی لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو ہدایت کے طلبگار ہوں۔ جو مومن و مسلم ہوں اور جو طہارت و پاکیزگی کی زندگی بسر کرتے ہوں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ج	یہ کتاب ہے اس میں شک کی گنجائش نہیں ان
هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ	پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے جو غائب چیزوں
بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ	پر ایمان لے آتے ہیں نماز پڑھتے ہیں اور ہم نے انکو
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ہ وَالَّذِيْنَ	جو رزق دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں اور وہ
يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا	لوگ جو ایمان لاتے ہیں ان چیزوں پر جو آپ پر
أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ج وَبِالْآخِرَةِ	اور آپ سے پہلے لوگوں پر نازل کی گئیں اور
هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ (البقر)	آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

دوسرے مقام پر فرمایا گیا۔

Marfat.com

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ	اور کچھ شک نہیں ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے
عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً	ہیں جس کو ہم نے علم کے ساتھ ایماندار لوگوں کے لیے
لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (الاعراف)	ہدایت اور رحمت بنا کر مفصل بیان کیا ہے۔

ایک مقام پر ھُدی وبشرٰی للمسلمین اور دوسری جگہ شفاءٌ ورحمۃٌ للمومنین اور ایک جگہ ان فی ذلك لرحمۃ وذکری لقوم یومنون اور ایک مقام پر ھو للذین اٰمنوا ھُدی وشفاء فرمایا گیا ہے۔

ان صلحار، اتقیار اور مومنین قانتین کے برعکس وہ لوگ ہیں جو فسق وفجور میں مبتلا رہ کر اعمالِ بد کرتے ہیں اور دن رات سرکشی میں مصروف رہتے ہیں ان کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ قرآن سے ان کے دلوں میں نور علم وہدایت پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس سے ان کی گمراہیاں اور بڑھتی ہیں۔ ارشاد ہے۔

وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا	اور قرآن مجید ظالموں کے لئے نقصان کو ہی بڑھاتا ہے
وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّا اُنْزِلَ	اور اے نبی جو آپ پر اترا ہے وہ ان لوگوں میں سے
اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا	بہتوں کی سرکشی اور کفر کو زیادہ کرنے والا ہے۔

ایک آیت میں ایمانداروں اور بے ایمانوں میں فہم قرآن اور اس کے اثرات کے اعتبار سے جو فرق ہے بالکل صراحت کے ساتھ یکجائی طور پر بیان کر دیا گیا ہے فرماتے ہیں۔

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ	اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ قرآن مجید ایمان والوں کیلئے
شِفَآءٌ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ	ہدایت اور شفا ہے اور وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے
فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ	ان کے کانوں میں گرانی ہے۔ اور وہ ان پر اندھا
عَمًى اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ	ہے۔ یہی لوگ ہیں جو دور کے فاصلے سے پکارے
مَّكَانٍ بَعِيْدٍ۔ (حم سجدہ)	جاتے ہیں۔

ایک آیت میں صاف طور پر فرما دیا گیا ہے کہ جو لوگ بد عمل ہیں اور تکبر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ

ان کو آیاتِ قرآنی کے فہم سے محروم کر دیگا۔ ارشاد ہے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ — جو لوگ زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں، میں ان کو اپنی
یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ — آیات سے روگرداں کر دونگا۔

قرآن سے دو مختلف الطبائع اشخاص پر دو متضاد اثر ہوتے ہیں۔

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا — اللہ نے سب سے اچھی بات اتاری ہے یعنی
مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ — یکساں کتاب دہرائی جانے والی۔ اس سے
جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ — ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے
ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ — پروردگار سے ڈرتے ہیں، پھر اللہ کے ذکر کیلئے
اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَی — ان کی کھالیں نرم ہو جاتی ہیں اور ان کے دل
اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ — بھی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جسے چاہتا ہے ہدایت
وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ — دیتا ہے اور جسے اللہ گم کرے اسے کوئی ہدایت
هَادٍ۔ (الزمر) — دینے والا نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار و اشرار کو قرآن مجید سے اعراض کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو طبعی طور پر رنج ہوتا تھا۔ کیونکہ آپ رحمۃ للعالمین تھے، قرآن سرچشمۂ سعادت و فیض تھا آپ چاہتے تھے دنیا کا کوئی فرد اس سے سیراب ہوئے بغیر نہ رہے۔ لیکن یہ ہو کس طرح سکتا تھا، مریض میں دوا کے اثر کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہ رہی ہو تو طبیب حاذق کیا کرے۔ مرزا غالب نے کیا خوب کہا ہے

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم — ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کرے

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو خطاب کر کے فرمایا:۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤی ۙ — ہم نے آپ پر قران اس لئے نازل نہیں کیا
اِلَّا تَذْکِرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی ۙ — کہ آپ مشقت اٹھائیں، مگر ہاں یہ نصیحت ان
(سورۂ طٰہٰ) — لوگوں کیلئے ہے جو ڈرتے ہیں۔

Marfat.com

صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے جو عموماً خطبوں میں پڑھی جاتی ہے اس میں ارشاد ہے :۔

القرآن حجۃ لك او علیك قرآن تیرے حق میں دلیل بن کر مفید ہو یا تجھ پر حجت ہو

اس سے مراد یہ ہے کہ اگر قرآن مجید پر عمل کیا جائے، اس کی تعلیم وارشاد کے مطابق انقار و طہارت کی زندگی بسر کی جائے تو وہ یقیناً ہدایت کا بہترین سرچشمہ ہے، اور اگر ایسا نہیں ہے تو دوسرے لوگ قرآن مجید کی حقیقی مراد کے خلاف اس سے استنباطِ احکام کریں گے اور گمراہ ہوں گے، وہ الفاظ کے حقیقی مفہوم کو توڑ موڑ کر ان کو ایسے معانی پہنائیں گے جو ہرگز قرآن کی مراد نہیں ہوں گے اس کے برخلاف وہ لوگ ہیں جو دلوں میں خوفِ خدا رکھتے ہیں۔ روحانیات اور عالم مابعد الموت کے منکر نہیں، زندگی کا مقصد دنیوی شہوات ولذات میں مبتلا رہنا ہی نہیں جانتے، بلکہ اخلاقِ جمیلہ اور فضائلِ حمیدہ کی روشنی اپنے اندر پیدا کر کے روحانی کمالات حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس طلبِ صادق، اور اعمالِ صالحہ کے صدقہ میں اللہ تعالیٰ ان کے دل میں ایسا نور پیدا کر دے گا جس سے عالمِ غیب کی حقیقتیں خود بخود برافگندہ نقاب ہو جائیں گی اور مادی کثافتوں کے باعث جن غیر مرئی چیزوں پر ایمان لانا ہمارے لئے دشوار ہوتا ہے، وہ خود بخود ان کے آئینۂ قلب میں اس طرح جلوہ ریز ہوں گی کہ ان سے انکار نہیں کیا جاسکے گا اور اس وقت صحیح معنی میں ان کا اعتقاد بالغیب ایمان کی صورت اختیار کرلے گا۔

انقار کی ایک عقلی توجیہ

فلسفۂ یونان کے طلبا رجانتے ہیں، علم کی تعریف میں کتنا زبردست اختلاف ہے۔ کوئی اس کو حصولِ صورت کہتا ہے، کسی کے نزدیک حاضر عند المدرک کا نام علم ہے، اور کوئی قوتِ مدرکہ کو ہی علم بتاتا ہے اور کسی کے خیال میں علم ایک معنی اضافی ہے جو عالم اور معلوم کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ حکما اشراقیین فرماتے ہیں "علم ایک نور ہے، جو اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں پیدا کر دیتا ہے اور وہ معلومات کے ادراک کا منشار بنتا ہے۔ ہماری رائے میں یہی قول درست ہے اور اسلامی نقطۂ نظر بھی اس کی ہی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ امام شافعیؒ کے دو شعر مشہور ہیں۔

Marfat.com

شکوت الیٰ وکیع سوء حفظی فاوصانی الیٰ ترک المعاصی

"میں نے اپنے استاد وکیع سے اپنے بد حافظہ ہونے کی شکایت کی تو انھوں نے گناہوں کے ترک کردینے کی ہدایت فرمائی"

لان العلم نورٌ من الٰہٖ ونور اللہ لا یعطیٰ لعاصٖ

اور کہا کہ علم خدا کا ایک نور ہے ، جو کسی گناہگار کو نہیں دیا جا سکتا

فلسفہ کے نقطۂ نظر سے غور کیجیے تب بھی یہی درست معلوم ہوتا ہے، فلاسفہ نے ادراک کے جو مدارج بتائے ہیں ان میں سب سے اعلیٰ درجہ عقل بالفعل، یا عقل مستفاد ہے۔ اس مرتبہ پر پہنچ کر انسان کو عقل فعال کے ساتھ جو صور معقولہ کا خزانہ ہے، غایت قرب واتصال حاصل ہو جاتا ہے اور اس اتصال کی بنا پر عقل فعال کی جانب سے جن صور معقولہ کا فیضان ہوتا ہے انسانی ذہن و دماغ ان کو آسانی کے ساتھ قبول کرنے کی صلاحیت واستعداد پیدا کر لیتا ہے۔ شیخ بو علی بن سینا نے اس نفس کو آئینہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح آئینہ اپنے مقابل کی صورت کو قبول کر لیتا ہے اور جب تک وہ اس چیز کے مقابل رہے گا اس کی صورت برابر اس میں عکس فگن رہے گی، یہاں تک کہ اگر آئینہ منحرف ہو جائے تو اس انحراف کے مطابق اس چیز کی صورت کے انعکاس میں بھی فرق پیدا ہو جائے گا۔ ٹھیک یہی حال نفسِ انسانی کا ہے وہ جس قدر مادیت سے بعید اور روحانیت سے قریب ہوگا۔ اسی قدر اس میں عقلِ فعال کے ساتھ اتصال کی وجہ سے عالمِ غیب کے حقائق کو قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوگی اور اس کے برخلاف نفس کو مادیت میں جتنا زیادہ انہماک ہوگا اسی قدر اس کو عقلِ فعال سے بُعد زیادہ ہوتا جائے گا۔ اور غیب کی باتیں اس کیلئے ناقابلِ فہم ہوتی جائیں گی۔

پس قرآن مجید کی تصریحات کے مطابق نفسِ انسانی میں یہ جلا اور نورانیت اعمالِ صالحہ اور اتقاء و طہارت سے پیدا ہوتی ہے، اور اس کے بعد اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ قرآن مجید کی روحانی تعلیمات کی حقیقی غرض و غایت کو سمجھ سکے اور اس کے مطالب کو کما ینبغی جان سکے اور اگر یہ نہیں ہے بلکہ اعمالِ فاسدہ کے حجابات اس کے آئینۂ دماغ و قلب پر پڑے

Marfat.com

ہوئے ہیں تو اس شخص سے صحیح فہم قرآن کی توقع عبث ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن مجید نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا	ان کے پاس دل تو ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں،
وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا	اور ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں،
وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا	اور ان کے پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں،
أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ	یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی
أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔	زیادہ گمراہ یہی لوگ غافل ہیں۔

چوتھی شرط

فہم قرآن کے لئے چوتھی شرط یہ ہے کہ ایک آیت میں ایک لفظ کو دیکھ کر ہی اُس کی تفسیر و تاویل کی جرأت نہ کی جائے بلکہ تمام قرآن مجید کا مطالعہ بنظرِ عمیق کر کے قرآن کی زبان اور اس کے طرزِ ادا و طریقۂ بیان کے ساتھ ایک ایسی مناسبت پیدا کر لی جائے کہ تعیین مراد میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اور ایک جگہ جو کسی لفظ کے معنی مراد لئے گئے ہوں وہ کسی دوسرے مقام کے منافی نہ ہوں۔

اس کی تفصیل یوں سمجھئے، ہر متکلم کے مخصوص طرقِ بیان ہوتے ہیں اور جب تک کوئی شخص متکلم کی اس خصوصیت سے واقف نہیں ہوگا وہ اس کے کلام کی مراد واقعی طور پر نہیں سمجھ سکے گا۔ مثلاً قرآن مجید میں طہارت کے باب میں ہے۔

وَإِن كُنتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا ۚ	اور اگر تم ناپاک ہو تو خوب پاک ہو جاؤ اور اگر تم
وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ	بیمار ہو یا مسافر ہو یا تم میں سے کوئی قضاء حاجت
أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ	سے فارغ ہو کر آیا ہو، یا تم نے عورتوں سے
أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ (الآیہ)	مقاربت کی ہو۔

"لمستم النساء" کی مراد میں علماء مختلف ہیں، ایک طبقہ کہتا ہے کہ "ملامستہ" سے مراد محض بدن کا چھونا ہے اور مباشرت نہیں اور اس کی دلیل یوں بیان کرتے ہیں کہ لمس کے معنی حقیقی

چھونا ہے اور جب تک معنی حقیقی کا مراد لینا دشوار نہ ہو، معنی مجازی کی طرف رجوع کرنا درست نہیں ہے. علماء کا دوسرا گروہ ہے جو اس کو صحیح تسلیم نہیں کرتا اور لامستہ کے معنی یہاں مباشرت مراد لیتا ہے. ہمارے خیال میں اس موقع پر اس بحث میں پڑنا کہ لمس کے معنی حقیقی کیا ہیں اور معنی مجازی کیا؟ اور پھر معنی مجازی اس وقت تک مراد نہیں لئے جا سکتے جب تک کہ معنی حقیقی کے مراد لینے میں تعذر نہ ہو چنداں مفید مطلب نہیں بلکہ ضرورت یہ دیکھنے کی ہے کہ لمس اور اس کے ہم معنی لفظ مس لغت کے اعتبار سے کس معنی میں مستعمل ہوتے ہیں، یہ معلوم کرنے کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں کتنے مقام پر آئے ہیں اور وہاں ان سے کیا مراد لی گئی ہے

اس سلسلہ میں تحقیق و تلاش سے کام لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ زن و شوئی کے تعلقات بیان کرنے میں قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب ہے کہ وہ ان مواقع پر تصریح سے کام نہیں لیتا بلکہ کنایۃً ان چیزوں کو بیان کرتا ہے. مثلاً ایام حیض میں مجامعت سے منع کرنا منظور تھا تو فرمایا گیا۔

فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ (البقر) عورتوں سے بحالتِ حیض الگ رہو۔

طلاق کے احکام میں ہے

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ (البقر) اگر تم عورتوں کو ان کو چھونے سے قبل طلاق دو، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

یہاں لفظ مس ارشاد فرمایا گیا ہے مگر مراد مباشرت ہے اسی سلسلہ میں دوسرے مقام پر ہے

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُوْنَ (البقر) اور اگر تم نے ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دیدی ہے اور تم ان کا مہر بھی مقرر کر چکے ہو تو جو تم نے مقرر کیا ہے اس کا آدھا دیدو، مگر ہاں اس وقت نہیں جبکہ یہ عورتیں معاف کر دیں۔

اس جگہ بھی مس فرمایا گیا ہے مگر مراد مجامعت ہے۔

Marfat.com

پھر عدت کے بیان میں ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ	اے مومنو تم مومنہ عورتوں سے نکاح
الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ	کرنے کے بعد اگر ان کو چھونے سے
قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَیْهِنَّ	قبل طلاق دیدو تو ان کے ذمہ تمہارے
مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا (الاحزاب)	لئے عدت نہیں ہے۔

یہ آیت اس باب میں تصریح ہے کہ مس سے مراد مباشرت ہی ہے کیونکہ عدت استبراءِ رحم کے لئے ہوتی ہے اس کے نہ ہونے کا حکم اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ فقدانِ مباشرت کے باعث استبراء کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

ایک جگہ اسی تعلق کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ جبکہ تم میں سے ایک نے اپنے تئیں دوسرے کے حوالہ کر دیا ہو،

ان آیتوں کے مطالعہ اور ان میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس کے طرز ادا کے معلوم کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ "لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ" میں بھی لمس سے مراد محض چھونا نہیں ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ان آیاتِ مذکورہ میں تو مس کا لفظ متعدد بار آیا ہے اس لئے یہ لمس کے معنی کے لئے کس طرح حجت بن سکتا ہے، جواب یہ ہے کہ لغت میں مس کے معنی چھونا ہیں اور لمس کے معنی ٹٹولنا ہیں یعنی لمس کے مفہوم میں بہ نسبت مس کے مخالطت میں شدت پائی جاتی ہے پس جب مس سے مراد مباشرت ہے تو لمس سے مراد مباشرت بطریقِ اولیٰ ہو سکتی ہے۔

اس طرح اگر قرآن مجید کے کسی لفظ کی مراد کو متعین کرنے کے لئے خود قرآن مجید سے مدد لی جائے تو غالباً وہ اختلاف و تشتت نہ پیدا ہو جو عموماً تفسیروں میں نظر آتا ہے۔ اور نہ وہ گمراہی پیدا ہو جو قرآن مجید کے طرز خطاب و طریقۂ بیان سے واقفیت و مناسبت بہم پہنچائے بغیر کسی آیت کی تفسیر سے پیدا ہوتی ہے اور غالباً اسی بنا پر فرمایا گیا۔

Marfat.com

القرآن یفسر بعضہ بعضاً قرآن مجید کا بعض خود اس کے بعض کی تفسیر کرتا ہے۔

ذکر کی بحث | ایک دوسری مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں آیت ہے۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ اور تم چند گنے چنے دنوں میں اللہ کو یاد کرو، اور
فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ جس شخص نے دو دنوں میں جلدی کی اس پر کوئی
عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ گناہ نہیں ہے اور جس نے تاخیر کی اس پر بھی
لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ ان کے لئے ہے جو خدا
اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ سے ڈرتے ہیں۔ تم اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تم
(البقرہ) اس کے ہی پاس جمع ہوگے۔

اس آیت میں جو لفظ ذکر آیا ہے اس سے مراد تمام ائمۂ تفسیر کے نزدیک ایام حج میں بمقام منیٰ رمیِ جمار کرنا ہے۔ اور "ایام معدودات" سے مراد ایام تشریق ہیں یعنی ماہ ذی الحجہ کی ۱۱، ۱۲، اور ۱۳ تاریخیں۔ اب ایک کج بحث آدمی کہہ سکتا ہے کہ لغت میں تو ذکر کے معنی فقط یاد کرنا ہیں آپ کس طرح ذکر سے مراد ایک مخصوص فعل عبادت (رمی جمار) لے سکتے ہیں۔ اسی طرح معدودات جمع قلت کا صیغہ ہے جو تین سے نو تک پر بولا جاتا ہے، اس میں چند خاص دنوں کا ذکر نہیں اگر اس پر الف لام تعریف کا داخل ہوتا تو اس کو عہد کا مراد لے کر تخصیص پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن ایام اور معدودات دونوں نکرہ ہیں۔ پھر ان سے کیونکر چند خاص دن مراد ہو سکتے ہیں پس اگر کسی شخص نے سال کے چند غیر معین ایام میں بھی خدا کو کسی طرح یاد کر لیا ہے تو اس نے اس آیت کا حکم پورا کر دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں بیشک لغت میں ذکر کے معنی یاد کرنا ہی ہیں لیکن قرآن مجید کا یہ انداز خاص ہے کہ وہ خاص خاص عبادتوں کا نام نہیں لیتا بلکہ ان کی جو اصل روح ہے اس کا ذکر کر دیتا ہے۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس عبادت کی اصل غرض معلوم ہو جائے اور وہ اس سے کسی وقت میں بھی غافل نہ ہوں۔ دیکھئے! عرفات سے واپس ہو کر مزدلفہ میں قیام

کرنے کا حکم ہے۔ اس کو یوں بیان فرمایا گیا۔

فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ وَاذۡكُرُوۡهُ كَمَا هَدٰٮكُمۡ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيۡنَ۔ (البقر)	پھر جب تم عرفات سے لوٹو تو اللہ کو مشعر الحرام کے پاس یاد کرو، اور جس طرح اللہ نے تم کو بتایا ہے اس طرح یاد کرو، اگرچہ تم پہلے سے بے خبر تھے۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ محض زبان سے خدا کو یاد کرلینا یا غیر شرعی اعمال کرکے ذکر اللہ کے فریضہ سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرنا بالکل بے سود بلکہ گمراہی ہے، ذکر وہی معتبر ہے جو خدا نے اپنے رسولِ برحق کے ذریعہ مخصوص طرقِ عبادت کے ساتھ لوگوں کو بتایا ہے اسی مضمون کی طرف آیتِ ذیل میں توجہ دلائی گئی ہے۔

فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ۔ (البقر)	جب تم مامون ہوجاؤ تو اللہ کو یاد کرو اس طریقہ کے مطابق جو اللہ نے تم کو بتایا ہے ایک ایسا طریقہ جو تم نہیں جانتے تھے۔

صبح وشام کی نمازوں کو بھی ذکر سے تعبیر کیا گیا ہے، ارشاد ہے۔

وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا	تم صبح شام اللہ کے نام کو یاد کرو،

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ قرآن مجید میں متعدد مقام پر ذکر سے مراد کوئی خاص عبادت نہیں بلکہ صرف یاد کرنا ہے جیسے آیات ذیل میں۔

(۱) وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَثِيۡرًا لَّعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ	اور اللہ کو تم کثرت سے یاد کرو تاکہ فلاح پاؤ،
(۲) وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلۡ اِلَيۡهِ تَبۡتِيۡلًا۔	تم اللہ کو یاد کرو اور اس کی طرف یکسو ہوجاؤ۔
(۳) رِجَالٌ ۙ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ۔	وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کو اللہ کی یاد سے نہ تو تجارت غافل کرتی ہے اور نہ خرید وفروخت۔

Marfat.com

لیکن قرآن مجید میں جہاں جہاں لفظِ ذکر آیا ہے ان سب مقامات کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن مواقع میں ذکر مطلق نہیں بلکہ کسی خاص زمانہ یا مکان کی قید کے ساتھ آیا ہے وہاں مطلقاً یاد کرنا نہیں بلکہ کوئی خاص طریقۂ عبادت مراد ہوتا ہے پھر وہ طریقۂ عبادت کیا ہوتا ہے؟ اس کی تفصیل یا تبیین یا خود قرآن مجید کرتا ہے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قول یا عمل سے اس کا بیان کر دیتے ہیں۔ صورتِ ثانی میں یہ ماننا لازمی ہوگا کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مراد متعین کر دی ہے جس سے انحراف کرنا کسی طرح جائز نہیں ہوگا اور اس فعلِ نبوی کو عمل میں لائے بغیر اگر قرآن مجید کے لفظوں کو لغوی معانی کے اعتبار سے کوئی عملی شکل دی گئی تو وہ یقیناً نامعتبر ہوگی۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آیت زیرِ بحث یعنی "واذکروا اللہ فی ایام معدودات" میں ذکر کو چونکہ "ایامِ معدودات" کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، اس لئے یہاں ذکر سے مراد صرف زبان و قلب سے یاد کر لینا نہیں بلکہ کوئی مخصوص طریقِ عبادت ہے، وہ کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے اقوالِ مبارکہ اور عملِ مقدس سے واضح کر دیا ہے کہ وہ "رمی جمار" ہے۔

اب رہی "ایام معدودات" کی بحث تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ دونوں لفظ اگرچہ نکرہ ہیں لیکن آیت کا سیاق و سباق بتاتا ہے کہ ان سے مراد چند خاص دن ہیں، وہ دن کون سے ہیں؟ ان کا بیان بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، اس بنا پر اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ "تم ایامِ تشریق میں رمی جمار کرو" پس وہ شخص جو اس آیت کو اس کے ظاہری معنی پر محمول کر کے یہ سمجھتا ہے کہ خدا کو کسی طرح بھی چند دنوں میں یاد کر لینا اس آیت کے حکم کو پورا کر دیتا ہے اور اس کے لئے رمی جمار و ایامِ تشریق کی کوئی قید نہیں وہ یقیناً فہمِ قرآن سے بہت بعید ہے اور راہِ حق سے بے شبہ منحرف ہے۔

Marfat.com

احکامِ قرآنی میں بصیرت

پھر جس طرح قرآن مجید کے مفرد الفاظ کے معنی کی تعیین کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ لفظ قرآن میں جہاں جہاں آیا ہے ان سب مواقع کو پیش نظر رکھا جائے سی طرح کسی آیت سے کوئی حکم استنباط کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ حکم قرآن مجید میں جتنے مواقع میں بیان کیا گیا ہے۔ ان سب کو ملحوظ رکھا جائے اور ہر ایک موقع کے سیاق و سباق پر مبصرانہ نگاہ ڈال کر اس حکم کی اصل روح تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

اس موقع پر یہ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ قرآن مجید کی مثال جدید زمانہ کی کسی مرتب و مہذب قانونی کتاب کی نہیں ہے، جس میں تمام احکام مختلف ابواب اور پھر ہر باب کے ذیل میں مختلف دفعات کے ماتحت ترتیب اور ایک خاص نظم و نسق کے ساتھ بیان کر دیئے جاتے ہیں بلکہ اس کی مثال اس طبیب حاذق کی سی ہے جو مریض کے لحظہ بہ لحظہ متغیر ہونے والے احوال کو دیکھ کر نسخہ میں ترمیم و تنسیخ کرتا رہتا ہے اور یا وہ فوج کے اس قائد کی طرح ہے جو طریق جنگ کی مصلحتوں اور فریقِ مخالف کی مورچہ بندیوں اور اصول اقدام و تاخر کے پیش نظر کبھی فوج کو کسی محاذ پر لڑنے کی ہدایت کرتا ہے اور کبھی کسی دوسرے محاذ پر جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے کبھی وہ تلوار استعمال کراتا ہے اور کبھی بندوق یا توپ، کبھی وہ آگے بڑھنے کا حکم دیتا ہے اور کبھی فوج کو مصلحتاً پیچھے ہٹاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب احکام اپنی اپنی جگہ نہایت ضروری اور واجب العمل ہیں۔ سطحی طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک حکم دوسرے حکم کے منافی ہے یا ایک نسخہ دوسرے نسخہ کی ضد ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باہمی تضاد اور منافات کے باوجود ان میں کا ہر ایک حکم اور نسخہ اپنے مخصوص موقع و محل کے اعتبار سے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ دوسرا اپنے موقع و محل پر۔ اگر ایک کو دوسرے کی جگہ پر رکھ دیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز تباہی اور بربادی کے اور کیا ہو سکتا ہے اور حق یہ ہے کہ جو دین دنیا میں آخری بن کر آیا ہو اس میں ایسی لچک اور تنوع احکام کا ہونا ضروری بھی تھا۔

انسان کی تمام انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں پر شامل ہونے کی یہی وہ صفت قرآنی ہے

Marfat.com

جس کو حکمت سے تعبیر فرمایا گیا ہے:۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ
یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہے:۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (بنی اسرائیل)
یہ اس حکمت میں سے ہے جو آپ کے پروردگار نے آپ پر نازل کی ہے۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ (ال عمران)
یہ وہ آیتیں اور حکمت والا ذکر ہے جو ہم تم پر پڑھتے ہیں۔

قرآن مجید کی صفتِ جامعیت کو ایک دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا گیا۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (النحل)
اور ہم نے آپ پر قرآن مجید نازل کیا جو ہر چیز کو کھول کر بیان کرتا ہے اور جو مسلمانوں کیلئے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے۔

لیکن جن لوگوں کی طبیعت میں کجی ہوتی ہے وہ اس توسعِ احکام کو برداشت نہیں کر سکتے ان کی قوتِ فکر مختلف احکام کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنے سے قاصر ہوتی ہے تو وہ کسی ایک طرف جھک جاتے ہیں اور اپنی طرف سے کسی ایک قطعی حکم کا یقین کر لیتے ہیں اسی قسم کے لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (البقر)
کیا تم قرآن مجید کے بعض حصوں پر ایمان لاتے ہو اور بعض سے کفر کرتے ہو، تو کیا نہیں ہے اس شخص کی جزا جو تم میں سے ایسا کرتا ہے مگر دنیا کی زندگی میں ذلیل ہونا اور قیامت کے دن وہ لوگ شدید ترین عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

Marfat.com

نکتہ | یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں رسوا ہونے کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے ابھی ذکر کی۔ یعنی یہ کہ لوگ جب قرآن مجید کے مختلف احکام میں باہمی توازن و تناسب کو قائم نہیں رکھ سکیں گے اور کسی ایک جہت کی طرف مائل و راغب ہو کر ایک ہی حکم کو معمول بہ بنالیں گے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہوگا کہ انسانی اور اجتماعی ضرورتوں کے دوسرے گوشے تشنۂ تکمیل رہ جائیں اور وہ اس بنا پر دنیوی تباہ حالی کے قعرِ عظیم میں جا پڑیں، جو مریض طبیبِ حاذق کی تجویز کے مطابق نو بنو نسخوں کو استعمال نہیں کرتا اور صرف ایک ہی نسخہ کے استعمال پر جمود کر کے بیٹھ جاتا ہے اس کی امیدِ شفا معلوم!

ناسخ و منسوخ | احکام کے ظاہری تعارض کو دیکھکر بہت سے مفسرین آیاتِ قرآنی میں ناسخ و منسوخ کے قائل ہو گئے ہیں اور اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ بعض علماء نے اس موضوع پر بھی مستقل کتابیں تصنیف کر ڈالی ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں" خاص اس موضوع پر اتنے لوگوں نے تصنیفات کی ہیں جن کا شمار نہیں ہو سکتا[۱]" پھر ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ نے کسی قاضی سے پوچھا "تم ناسخ و منسوخ کو جانتے ہو"؟ اس نے کہا "نہیں" آپ نے فرمایا "تم خود بھی ہلاک ہو گئے اور دوسروں کو بھی ہلاک کرو گے" ہماری رائے میں اگر یہ مقولہ درست ہے تو اس سے مراد نسخ کے اصطلاحی معنی نہیں ہیں بلکہ موارد احکام مراد ہیں۔

نسخ سے مفسرین کی مراد | لیکن اگر ناسخ و منسوخ کی معنوی تنقیح کی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مفسرین نے اگر کسی آیت پر ناسخ و منسوخ کا اطلاق کیا ہے تو محض مجازاً کیا ہے ورنہ دراصل کوئی آیت عام اصطلاحی معنی کے اعتبار سے منسوخ نہیں ہے "نسخ" کے معنی حقیقی ہیں زائل کر دینا۔ اس بنا پر ایک آیت دوسری آیت کے لئے صحیح معنی میں ناسخ اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ منسوخ آیت پر عمل کرنا مطلقاً ناجائز قرار دیدیا جائے، حالانکہ قرآن کی کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس پر مطلقاً عمل کرنا ناجائز ہو۔ مثلاً قرآن مجید میں ایک جگہ مسلمانوں کو

---

[۱] الاتقان ج ۲ ص ۲

Marfat.com

حکم دیا گیا ہے کہ انھیں کفار کے ہاتھوں سے جو اذیت پہنچے اس پر صبر کرنا چاہئے۔ مگر دوسرے مواقع میں نہایت پرزور طریقہ پر جہاد کی ترغیب دی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ	اے نبی آپ کفار و منافقین کے ساتھ جہاد
وَالْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ (توبہ)	کیجئے اور ان پر سخت ہو جائیے۔
یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ	اے مومنو! تم ان کفار سے جنگ کرو جو
یَلُوْنَکُمْ مِنَ الْکُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا	تم سے قریب ہیں اور چاہئے کہ وہ تم میں
فِیْکُمْ غِلْظَۃً (توبہ)	سختی محسوس کریں۔

مفسرین نے آیتِ صبر علی الایذاء اور آیاتِ جہاد میں تعارض دیکھکر آیات جہاد کو آیتِ صبر کے لئے ناسخ کہا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ حقیقتاً نسخ ہے؟ صبر کرنے کا حکم اس زمانہ میں تھا جبکہ مسلمان کمزور تھے اور وہ کفار کو جواب ترکی بہ ترکی نہیں دے سکتے تھے مگر جب خدا نے ان کو طاقت و قوت عطا فرمادی اور وہ جنگ کے قابل ہو گئے تو انھیں جہاد کا حکم دیدیا گیا۔ اس بنا پر ان دونوں آیتوں کے ملادینے سے دو حکم ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) اگر مسلمان کمزور ہوں تو انھیں کفار کے مصائب پر صبر کرنا چاہئے اور اندرونی طور پر کوشش کرنی چاہئے کہ وہ قوی ہو جائیں۔

(۲) پھر جب مسلمان قوی ہو جائیں تو انھیں جہاد کرنا چاہئے۔ اب خاموش بیٹھا رہنا اور کافروں کے مصائب برداشت کرتے رہنا ان کے لئے ناجائز ہے۔

غور کیجئے جب دونوں آیتوں سے مختلف حالات کے مناسب دو مختلف احکام مستنبط ہوتے ہیں تو اب ان میں سے کسی ایک کو دوسرے کے لئے ناسخ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کسی ایک حکم کو دوسرے حکم کے اعتبار سے منسوخ زمانی یعنی ہنگامی طور پر منسوخ کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح طبیب ایک نسخہ کو ملتوی کرکے دوسرا نسخہ لکھتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اب پہلے نسخہ کا استعمال سراسر ممنوع قرار دے دیا گیا ہے اور وہ کسی حالت میں

Marfat.com

بھی قابلِ استعمال نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اب مریض کی موجودہ حالت کے پیشِ نظر اس کو یہ نسخہ استعمال نہیں کرنا چاہئے، لیکن اگر اس کی حالتِ اولیٰ عود کر آئے تو ظاہر ہے کہ اس کو پھر وہ پہلا ہی نسخہ استعمال کرایا جائے گا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ "سورۃ الکافرون" کی آیت "لکم دینکم ولی دین (تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے) منسوخ التلاوۃ نہیں منسوخ الحکم ہے، لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو اس کو منسوخ کہنا ہی درست نہیں ہے۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کافروں کے اپنے دین پر قائم رہنے پر رضامندی کا اظہار کیا جا رہا ہے جو اس کو منسوخ الحکم قرار دیا جائے بلکہ صورت یہ ہے کہ توحید کا داعی برحق کافروں کو اسلام کی دعوت دیتا ہے اور ایک مرتبہ نہیں بار بار دیتا ہے یہ لوگ اس دعوت کو سن کر صرف اسے قبول کرنے سے انکار ہی نہیں کرتے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں اور گستاخانہ برتاؤ برتتے ہیں اور الٹا خود آپ کو اپنا مذہب اختیار کر لینے کی دعوت دیتے ہیں اس پر آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان سے صاف صاف کہہ دیجئے کہ اگر تم دعوتِ اسلام کو قبول نہیں کرتے ہو مت کرو۔ میں بہر حال تمہارے بتوں کی پرستش نہیں کر سکتا۔ تم جانو تمہارا کام "تم کو تمہارا مذہب مبارک ہو اور مجھ کو میرا دین" اب اس تقریر کو ذہن میں رکھ کر پوری سورت پڑھ جایئے اور بتایئے کہ کیا کسی ایک لفظ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار کو اپنے دین پر قائم رہنے کی اجازت دیدی گئی ہے۔ اس سورت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا حاصل اس مضمون سے زیادہ نہیں جو من شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر یا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم میں بیان فرمایا گیا ہے، پس اس سورت کی کسی آیت پر عام اصطلاحی معنی کے اعتبار سے نسخ کا اطلاق صحیح ہو ہی نہیں سکتا۔

علامہ محمود آلوسی نے اسی سورت کی آخیر آیت میں کئی احتمالات بیان کئے ہیں۔ پہلے احتمال کی بنا پر تو انھوں نے صاف کہا ہے۔

والآیۃ علی ماذکر محکمۃ غیر منسوختہ اس احتمال پر آیت محکم غیر منسوخ ہے۔

Marfat.com

دوسرا احتمال انھوں نے وہی بیان کیا ہے جو ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں اور اس کے متعلق بھی آگے چل کر فرماتے ہیں وعلیہ کا نسخ ایضاً اور اس احتمال پر بھی نسخ نہیں ہے۔

اس گفتگو سے مقصد یہ ہے کہ اگر اسی طرح تمام ان آیات میں غور کیا جائے جن کے متعلق نسخ کا ادعا کیا گیا ہے تو یہ حقیقت صاف روشن ہو جائے گی کہ قرآن مجید کی کوئی ایک آیت کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ یا تو لوگوں نے آیت کے کسی لفظ سے کوئی خاص معنی مراد لے کر کوئی حکم خاص استنباط کر لیا ہے اور اس حکم کو چونکہ منسوخ قرار دیدیا گیا ہے اس لئے انھوں نے خیال کیا کہ آیت ہی سرے سے منسوخ ہو گئی ہے، مثلاً قرآن مجید میں ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ	تم نے جن عورتوں سے تمتع کیا ہے تم
اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النسا)	ان کو ان کے مقررہ مہر دے دو۔

اس آیت کے لفظ "استمتعتم" سے بعض لوگوں نے نکاح متعہ مراد لیا اور اس کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اس لئے انھوں نے کہا کہ یہ آیت بھی منسوخ الحکم ہے، حالانکہ "استمتعتم" سے مراد لطف اندوز ہونا ہے، متعہ سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی حکم عام بیان کیا جاتا ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری آیت آتی ہے جس میں حکم کی کسی خاص موقع و محل کے اعتبار سے تخصیص کر دی جاتی ہے بعض حضرات اس تخصیص پر بھی نسخ کا اطلاق کر دیتے ہیں، مثلاً عدت کے متعلق ایک آیت ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ	اور وہ لوگ جو تم میں سے مر جائیں اور
اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ	بیویاں چھوڑیں ان پر اپنی بیویوں کے لئے
مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ	وصیت کرنا ہے کہ سال بھر تک ان کو فائدہ
(البقر)	دیں، گھر سے نہ نکالیں۔

اس سے بظاہر ثابت ہوتا ہے کہ عدتِ وفات ایک برس ہے۔ ایک دوسری آیت ہے

Marfat.com

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ	اور تم میں سے جو مر جائیں اور بیویاں چھوڑیں
اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ	تو بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن تک
اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ	(بطور عدت) روکے رکھیں، پھر وہ جب اس
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ	مدت کو پورا کرلیں تو وہ جو کار خیر ہو کریں ان پر
اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ - (البقرہ)	کوئی الزام نہیں ہے

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عدتِ وفات ایک سال نہیں بلکہ چار ماہ دس دن ہے۔ اب ان دونوں میں تعارض دیکھکر بعض اربابِ تفسیر نسخ کے قائل ہو گئے ہیں حالانکہ اگر ذرا تعمق سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، کہ نسخ یہاں بھی نہیں ہے۔ پہلی آیت میں شوہروں کو حکم کیا جا رہا ہے کہ وفات کے وقت اپنے ورثا کو اس بات کی وصیت کر جائیں کہ اگر ان کی بیویاں سال بھر تک گھر میں رہنا چاہیں تو انھیں رہنے دیا جائے، اس مدت میں وہ اپنے اعزا و اقربا سے مشورہ کر کے اپنے لئے کوئی اچھا انتظام کرلیں گی۔ اخلاقی اعتبار سے یہ بات کس قدر بُری ہے کہ ایک عورت جو اپنے شوہر کی رفیقۂ حیات بن کر عرصہ دراز تک ایک گھر میں ساتھ رہی ہے شوہر کی وفات کے بعد اس کے ساتھ ایسی بیگانگی کا معاملہ کیا جائے کہ غریب کو اس گھر میں ایک سال تک بھی قیام کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

اب رہا یہ امر کہ عورت کب تک عدت میں بیٹھے اور وہ کب تک کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتی تو اس کے متعلق دوسری آیت میں صاف طور پہ بتا دیا گیا کہ عورت کی مدتِ عدت چار ماہ دس دن ہے (اگر وہ حاملہ نہیں ہے)۔

اب غور فرمائیے! ان دونوں میں کیا تعارض ہے جس کی وجہ سے نسخ کا قائل ہونے کی ضرورت ہو۔ چنانچہ حضرت مجاہد بن جبیرؒ جو مشہور مفسر ہیں ان دونوں آیتوں میں نسخ کے قائل نہیں[1] تھے۔

---

[1] بخاری کی کتاب التفسیر

Marfat.com

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ "الفوز الکبیر فی علوم التفسیر" میں ان ہی آیات پر کلام کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ کا قول والذین یتوفون الآیہ جمہور مفسرین کے نزدیک اربعۃ اشھر وعشرا والی آیت سے اور وصیتِ میراث، و سُکنیٰ کے حکم سے منسوخ ہے، لیکن ان دونوں میں تطبیق اس طرح دی جا سکتی ہے کہ متوفی کے لئے تو وصیت کرنا مستحب یا جائز ہے، البتہ عورت پر یہ واجب نہیں ہے کہ وہ وصیت کے مطابق رہے۔ حضرت ابنِ عباسؓ بھی اسی کے قائل تھے اور یہی توجیہہ آیت سے ظاہر ہوتی ہے۔" (ص ۱۹)

قرآن میں نسخ کی حقیقت خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کسی آیت کو کسی آیت کے لئے ناسخ کہنے سے اگر مراد یہ ہے کہ منسوخ آیت کا حکم بالکل زائل ہو چکا اور اب اس پر عمل کرنا قطعی طور پر ممنوع قرار دیدیا گیا ہے تو جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اس معنی کے اعتبار سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہے اور اگر بر سبیلِ مجاز تخصیصِ عام، یا تعیینِ مدت، یا تفصیلِ اجمال پر نسخ کا اطلاق کیا جا سکتا ہے تو ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں عذر نہیں کہ اس معنی کے لحاظ سے نسخ کا اطلاق ہو سکتا ہے اور غالب یہ ہے کہ علمائِ اسلام جو نسخ بولتے ہیں اس سے وہ دوسرے معنی ہی مُراد لیتے ہیں۔

حافظ ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں۔

مراد عامۃ السلف بالناسخ والمنسوخ	ناسخ و منسوخ سے عام سلف کی مراد کبھی حکم کا
رفع الحکم بجملتہ تارۃً وھو اصطلاح	تمامہ مرفوع ہو جانا ہوتا ہے، یہ متاخرین کی اصطلاح
المتاخرین ورفع دلالۃ العام المطلق	ہے اور کبھی نسخ سے مراد ہوتی ہے عام، مطلق ظاہر
والظاھر وغیرھا تارۃً اما بتخصیص	وغیرہ کا رفع کر دینا۔ خواہ وہ تخصیص کے ذریعہ ہو
او تقیید او حمل مطلق علی مقید و	یا تقیید کے یا مطلق کو مقید پر محمول کرنے اور
تفسیرہ وتبیینہ حتی انھم یسمون	اس کی تفسیر و بیان کے ذریعہ یہاں تک کہ حضرات
الاستثناء والشرط والصفۃ نسخاً	استثناء، شرط اور صفت کو بھی نسخ کہہ دیتے ہیں

Marfat.com

لتضمن ذلك رفع دلالة الظاهر و	کیونکہ یہ لالت ظاہر کے رفع اور بیانِ مراد کو
بیان المراد فالنسخ عندھم و فی	متضمن ہوتا ہے، پس نسخ ان کے نزدیک اور ان
لسانهم هو بیان المراد بغیر ذالك	کی زبان میں اس لفظ کے غیر سے مراد کا بیان
اللفظ بل بامر خارج عنه ومن تامل	کر دینا ہے، اور غیر لفظ ہی نہیں بلکہ کبھی مراد کا
کلامهم رأی من ذلك فیه مالا	بیان کسی امرِ خارج سے بھی ہو جاتا ہے جو شخص ان
یحصی وزال عنه بها اشکالات	اسلاف کے کلام میں تامل کریگا اس کو اس
اوجبها حمل کلامهم علی الاصطلاح	میں غیر محدود فوائد نظر آئیں گے اور اس سے وہ
الحادث المتاخر۔	اشکالات زائل ہو جائیں گے جو نسخ کو اصطلاح
[1]	حادث ومتاخر پر محمول کرکے پیش آتے ہیں۔

علامہ ابنِ حزم ظاہری نے ایک اور نکتہ پیدا کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ نسخ کی حقیقت بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی چیز کسی مدت کے لئے حرام کرتا ہے (اگرچہ وہ مدت ہم کو نہیں بتائی جاتی لیکن وہ اللہ کے علم میں ہوتی ہے) پھر وہ اس کو مباح کر دیتا ہے یا اس کے برعکس کوئی چیز کچھ مدت کے لئے مباح ہوتی ہے۔ پھر اس کی مدت گذرنے پر اس کو حرام کر دیا جاتا ہے یعنی یہ نہ کہنا چاہئے کہ ایک حکم نے دوسرے کو منسوخ کر دیا بلکہ یہ تعبیر زیادہ صحیح ہوگی کہ ایک حکم کے بعد دوسرا حکم نازل ہوا کیونکہ نسخ بمعنی حقیقی تو یہ ہے کہ پہلا حکم باقی ہو اور پھر دوسرا حکم اس کو مرفوع کر دے اور ظاہر ہے کہ اس قول کے بموجب یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ علامہ کے اپنے الفاظ یہ ہیں

وما ههنا شئ اصلاً الا ان الله	اور یہاں بجز اس کے کوئی شے نہیں ہے کہ
تعالیٰ اراد ان یحرم علینا بعض	اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض مخلوق چیزوں کو ہم پر کچھ
ما خلق مدة ما ثم اراد تعالیٰ	مدت کیلئے حرام کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے
ان یبیحه واراد ان یبیح لنا	چاہا کہ اس کو مباح کر دے اور اللہ نے اپنی بعض

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۹۔

بعد ما خلق مدة ماثم اراد تعالیٰ مخلوق کو کچھ مدت کیلئے ہمارے واسطے مباح کرنیکا

ان یحرمہ علینا۔ ؎۵ ارادہ کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس کو ہم پر حرام کردے۔"

علامہ ابوبکر حصاص فرماتے ہیں" نسخ کے معنی لغت میں خواہ کچھ ہی ہوں بہر حال شرع میں اس کے معنی حکم یا تلاوت کی مدت کے بیان کر دینے کے ہیں۔ پھر آگے چل کر بعض متاخرین کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تم جانتے ہو قرآن مجید میں عام بھی ہے اور خاص بھی، محکم بھی ہے اور متشابہ بھی۔ پس وہ شخص جو قرآن میں نسخ کے وجود کا قائل نہیں ہے گویا وہ قرآن میں عام و خاص اور محکم و متشابہ کو ہی نہیں مانتا۔ کیونکہ اس کے قول کے مطابق تو یہ لازم آتا ہے کہ تمام آیات کا ورود ایک ہی شان کا ہو۔" ؎۵۲

اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات پر جب نسخ کا اطلاق کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ازالہ نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ فلاں آیت میں جو یہ حکم بیان کیا گیا تھا وہ فلاں وقت اور اس زمانہ کے مخصوص حالات کے اعتبار سے تھا۔ اب جبکہ حالات دوسرے ہیں۔ ان کے لئے حکم یہ ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ فلاں قسم کے احوال کے لئے فلاں حکم ہے اور فلاں قسم کے احوال کے لئے فلاں حکم۔ اس سے کسی ایک حکم کا مطلقاً ممنوع ہو جانا لازم نہیں آتا بلکہ یہ تفصیل و تشریح عین کمالِ دین کی دلیل ہے۔

اصل یہ ہے کہ تمام بحثیں ہوتی رہیں مگر کبھی نسخ کے معنی اور اس کی مراد کی تنقیح کما حقہ' نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جن بزرگوں نے نسخ کو مانا ہے وہ خود آیاتِ منسوخہ کی تعداد میں بیحد مختلف ہیں۔ پہلے عوام میں مشہور تھا کہ قرآن مجید میں پانچسو یا تین سو آیات منسوخ ہیں، کسی نے کہا کہ صرف پچیس آیات منسوخ ہیں، حضرت ابن عباسؓ سے بعض لوگوں نے روایت کی کہ بیس آیات منسوخ ہیں، جن کو علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بھی نظم کر دیا ہے۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ الدہلویؒ نے

؎۵ الاحکام فی اصول الاحکام ج ۴ ص ۱۵۹ ؎۵۲ احکام القرآن ج ۱ ص ۹۷۔

Marfat.com

"فوز الکبیر فی اصول التفسیر" میں نسخ پر مستقل ایک فصل میں بحث کی ہے۔ اس میں آپ علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب "الاتقان" کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ شیخ ابن عربیؒ کے قول کے مطابق تقریباً بیس آیات منسوخ ہیں، اس کے بعد فرماتے ہیں "فقیر را در اکثر بست نظر است" چنانچہ آپ نے ابن عربی کی پوری تقریر نقل کی ہے اور اس پر جابجا تعقبات کئے ہیں۔ ہم یہاں اس طویل تقریر میں سے صرف ایک آیت کا ذکر کرتے ہیں۔ ابن عربی فرماتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ کا قول وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ منسوخ ہے اور اس کے لئے ناسخ دوسری آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ہے"۔

حضرت شاہ صاحبؒ اس پر تعقب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اس کو نسخ کہنا صحیح نہیں۔ میرے نزدیک اصل صورت یہ ہے کہ "یطیقونہ" میں جو ضمیر منصوب ہے وہ صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام کی طرف راجع ہے اور فدیہ سے مراد فدیۂ صوم نہیں بلکہ صدقۃ الفطر ہے۔ اس بنا پر اس آیت کے معنی یہ ہوگئے کہ جو لوگ طعام مسکین دینے کی طاقت رکھتے ہیں، انھیں صدقۃ الفطر ادا کرنا ضروری ہے، طعام یہاں اگرچہ لفظوں میں متقدم نہیں ہے، لیکن رتبۃً مقدم ہے۔ اس لئے اضمار قبل الذکر بھی لازم نہیں آتا۔ حضرت شاہ صاحبؒ ابن عربیؒ کی تقریر پر اسی طرح تعقبات کرتے چلے گئے ہیں اور بالآخر فرماتے ہیں۔

میں کہتا ہوں ہماری تحریر کے مطابق نسخ صرف پانچ آیات میں ہے۔ (ص ۱۸-۲۱)	قلت وعلی ما حررنا لا یتعین النسخ الا فی خمس آیات۔

آپ کے بعد مفتی محمد عبدہٗ المصری کا زمانہ آیا تو انھوں نے کہا کہ قرآن مجید میں ایک آیت بھی منسوخ نہیں ہے۔

ہم سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ نسخ کے اصل مفہوم کی جتنی تنقیح ہوتی رہی، آیاتِ منسوخہ کی تعداد میں بھی اسی کے مطابق کمی واقع ہوتی رہی، یہاں تک کہ یہ حقیقت خود بخود واضح ہوگئی کہ دراصل قرآن مجید میں ایک آیت بھی منسوخ نہیں۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہماری تقریر سے یہ شبہ نہ ہونا

چاہیے کہ ہم نسخ کے بالکل قائل ہی نہیں ہیں، اصل یہ ہے کہ جس مذہب میں اشخاص اور قوموں کی تدریجی اور حالات ونفسیات کے مطابق اصلاح کا کامیاب اصول پیشِ نظر رکھا گیا ہو، اس میں نسخ کا ہونا ناگزیر ہے۔ نسخ کی دو قسمیں ہیں۔ نسخِ آیات اور نسخِ احکام، ہم اس میں سے دوسری قسم کے نسخ کے قائل ہیں۔ نسخِ آیات کے نہیں۔ پھر نسخِ احکام کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ ایک حکم دوسرے حکم کو بالکل رفع کردے جیسے کہ متعہ کی اباحت کا حکم جو قطعی طور پر زائل کر دیا گیا ہے، یا حضرت رسالتمآبؐ کا یہ ارشاد:-

کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور — میں پہلے تم کو قبروں کی زیارت سے منع

الا فزوروھا — کرتا تھا۔ اب تم ان کی زیارتیں کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آپ کے پہلے "حکم تحریمِ زیارتِ قبور" کے لئے ناسخ ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نسخ بمعنی تفصیلِ اجمال، تبیینِ مبہم اور تقییدِ مطلق ہو، نسخ احکام ان دونوں معنوں کے اعتبار سے سنت میں تو پایا جاتا ہے، لیکن قرآن مجید میں صرف دوسرے معنی کے ہی اعتبار سے یہ نسخ پایا جاتا ہے، جیسا کہ ہم ابھی بیان کر آئے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ آپ فرمائیں گے اگر ایسا ہی ہے تو قرآن مجید کی آیت

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا — ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے یا بھلا دیتے ہیں

نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا۔ — تو اس سے بہتر ایک آیت لاتے ہیں۔

کا کیا مطلب ہے؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیات میں نسخ موجود ہے، اس شبہ کے جواب کئی ہو سکتے ہیں۔ یہاں صرف دو کا ذکر کر دینا کافی ہوگا۔

پہلا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اٰیۃ کا لفظ مطلق ہے۔ اس سے صرف قرآن مجید کا حکم یا قرآن مجید کی کوئی آیت ہی مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہاں آیت سے مراد وہ احکام ہیں جو اسلام سے قبل دوسرے ادیان وشرائع کے موجود تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو منسوخ کر کے دوسرے احکام بیان کئے جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ یہ احکام بہ نسبت

احکامِ سابقہ کے بہتر ہوں گے۔

صاحب تفسیر المنار نے مفتی محمد عبدہٗ المصری کی ایک طویل تقریر آیت نسخ کی تفسیر کے ذیل میں نقل کی ہے ہم اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ اس سے ہماری تائید ہوتی ہے۔

"علماءِ انسار" کے فہم میں متحیر ہیں جیسا کہ انھوں نے بیان کیا ہے۔ یہانتک کہ بعض نے کہا ہے کہ "ننسھا" کے معنی بغیر نسخ کے آیت کو اس کی اپنی حالت پر چھوڑ دینا ہے اور تم جانتے ہو کہ یہ معنی اگر لغتہً صحیح بھی ہوں تب بھی اس کی تفسیر کے شایاں نہیں کیونکہ کسی آیت کو بغیر نسخ کے اس کو اپنی حالت پر چھوڑتے ہوئے اس سے بہتر کوئی آیت لانے کے معنی ہی کچھ نہیں صحیح معنی جو آیت کے سیاق کے ساتھ آخر تک متناسب رہتے ہیں یہ ہیں کہ یہاں آیت سے مراد وہ نشانیاں ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انبیاء کی تائید کرتا ہے، تو اب مراد یہ ہوئی کہ "ہم اگر کسی نبی کی نبوت پر دلالت کرنیوالی کسی دلیل کو ترک کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر کوئی دوسری دلیل اس کی جگہ قائم کر دیتے ہیں، یا اگر مدت دراز گذر جانے کے باعث ہم اس کو لوگوں کی یاد سے زائل کر دیتے ہیں تو اپنی قدرت کاملہ سے ایک ایسی دلیل اور پیدا کر دیتے ہیں جو پہلی دلیل سے بھی زیادہ قوی اور نبوت کو ثابت کرنیوالی ہو" یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس صرف ایک ہی دلیل نہیں ہے جو وہ تمام انبیاء کو عطا فرمائے۔[1]

دوسرا جواب یہ ہے کہ اچھا مان لیا کہ آیت سے مراد آیتِ قرآن ہی ہے لیکن "ننسخ" کے معنی حکم کو بالکل زائل کر دینے کے نہیں ہیں بلکہ تبدیلِ حکم کے معنی ہیں جیسا کہ اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ	اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت رکھتے
وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا	ہیں اور اللہ جس چیز کو نازل کرتا ہے اس کو بہتر جاننے
اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ (النحل)	والا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں آپ افترا باندھنے والے ہیں۔

[1] تفسیر المنار ج ۱ ص ۴۱۶۔

Marfat.com

اس تبدیل آیت بالا آیت کا مفہوم کیا ہے؟ یہ کہ ایک زمانہ میں کسی حکم خاص کے لئے کوئی آیت نازل ہوئی، پھر جب حالات بدل گئے تو دوسری آیت نازل ہوئی اور اس میں حکم جدید کا امر فرمایا گیا۔ اس کا مآل یہ ہوا کہ دو مختلف حالات کے اعتبار سے دو مختلف احکام نازل ہوئے، اور دونوں اپنی اپنی جگہ برحق اور درست ہیں۔ مسلمان کمزور تھے۔ کافروں اور مشرکوں کی مقاومت نہیں کر سکتے تھے تو صبر کا حکم نازل ہوا، پھر جب وہ قوی ہو گئے تو انھیں جہاد کرنے کا حکم دیدیا گیا یہ دو حکم ہیں جو جس طرح پہلے درست تھے اب بھی ہیں جس طرح قابلِ عمل پہلے زمانہ میں تھے اب بھی ہیں۔ تبدیل آیت بالا آیت کی حقیقت یہ ہے اور بس، کفار و مشرکین اس تنوع احکام کو برداشت نہیں کر سکتے۔ طعن و تشنیع کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ آپ کبھی کوئی حکم دیتے ہیں اور کبھی کوئی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو بہتر جانتا ہے، اسے معلوم ہے کہ کب اور کس وقت کونسا حکم ہونا چاہیئے اور کس وقت کونسا۔ پس دوسرے جواب کا لبِّ لباب یہ ہے کہ آیت بالا میں جو حقیقت بیان فرمائی گئی ہے وہی ما ننسخ والی آیت میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اس سے یہ اچھا ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں نسخ بمعنیٰ ازالہ حکم مطلقاً پایا جاتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر کے ماتحت جو تقریر کی ہے اس سے بھی اس کی ہی تائید ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

> "جاننا چاہیئے کہ احکامِ شرعیہ میں نسخ کا حال احکامِ تکوینی میں نسخ جیسا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام احکام الٰہیہ خواہ شرعی ہوں یا تکوینی لوحِ محفوظ میں موجود اور ثابت ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں، احکامِ خاص، احکامِ عام، پھر جو احکامِ خاص ہیں ان کی دو قسمیں ہیں وہ یا تو کسی ایک شخص یا چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہوں گے اور یا کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص ہوں گے، خواہ وہ زمانہ قلیل ہو یا کثیر، پس جو احکام کسی شخص کے یا زمانہ کے ساتھ مخصوص ہونگے وہ اس شخص اور زمانہ کے باقی رہنے تک باقی رہیں گے۔ احکام میں یہ تغیر و تبدل ہمارے اعتبار سے ہے ورنہ خدا کے نزدیک سب احکام برابر ہیں" (تفسیر عزیزی ۳۹۲)

Marfat.com

ناسخ و منسوخ کی بحث یہاں ضمناً آگئی ورنہ دراصل اس بحث کے لئے مستقلاً ایک ضخیم کتاب درکار ہے، مقصد صرف یہ ہے کہ وہ شخص جو فہمِ قرآن کی سعادت سے بہرہ اندوز ہونا چاہتا ہے اس کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ مفرداتِ قرآن کے معانی کی تعیین کے لئے خود قرآن کی طرف رجوع کرے، اسی طرح استنباطِ احکام کے لئے ضروری ہے کہ کسی چیز کے متعلق قرآن مجید میں جتنے احکام آئے ہیں ان سب کو یکجا کر کے ان میں باہمی تناسب و توازن پیدا کرنے کی کوشش کرے اور یہ معلوم کرے کہ کونسا حکم کس زمانہ کے لئے تھا اور کونسا کس زمانہ کے لئے، ایک کا مورد و محل کیا ہے اور دوسرے کا کیا؟ ایک کا کیا منشا ہے اور دوسرے سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید میں اگر غور کرنے والا احکام متنوعہ کے ان باہمی فروق کو نظر انداز کر کے ان میں ایک خاص توازن و تناسب پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا تو قدم قدم پر اس کو مشکلات پیش آئیں گی اور کہیں وہ "ناسخ و منسوخ" کہہ کر اپنی گلوخلاصی کا سامان کرے گا اور کہیں ایسی رکیک تاویل و توجیہ کرے گا جو قرآن کے منشا کے برعکس ہوگی۔

تفسیر و تاویل کا فرق اس موقع پر ضروری ہے کہ تفسیر و تاویل کا فرق بھی معلوم کر لیا جائے۔ تفسیر "فسر" سے مشتق ہے جس کے معنی کھولنے اور بیان کرنے کے ہیں۔ اور "تاویل" کا مادہ "اشتقاق" ہے "اول" جس کے معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ "ایالت" سے مشتق ہے جس کے معنی سیاست ہیں۔ تاویل کرنے والا بھی چونکہ کلام کی سیاست سے واقف ہو کر اس کو اپنے موضوع و محل میں رکھتا ہے، اس لئے اس متکلم کو "موؤل" اور اس کے اس فعل کو "تاویل" کہتے ہیں۔ لیکن یہ وجہ ضعیف ہے۔ کما لا یخفی علی من له بصیرة فی مناهج استعمال الالفاظ ابوعبید اور ایک گروہ کا خیال تو یہی ہے کہ تفسیر و تاویل باعتبار معنی ایک ہیں لیکن دراصل یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن حبیب نیشاپوری بر سبیل طنز کہتے ہیں۔

"ہمارے زمانہ میں ایسے مفسر پیدا ہو گئے ہیں کہ اگر ان سے تفسیر و تاویل میں فرق دریافت کیا جائے تو انھیں پتہ بھی نہ چلے۔ (شرح احیاء العلوم ج ۴ ص ۵۳۵)

امام راغب اصفہانی تفسیر وتاویل میں عام خاص مطلق کی نسبت بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تفسیر کا اطلاق بیشتر الفاظ ومفرداتِ کلام پر ہوتا ہے اور تاویل کا جملوں اور معانی پر۔ اور دوسرا فرق یہ بیان کرتے ہیں کہ تاویل عموماً کتب الٰہیہ میں ہوتی ہے اور تفسیر کتبِ الٰہیہ وغیر الٰہیہ دونوں میں۔ لیکن ہمارے خیال میں زیادہ دلپسند اور صحیح فرق وہ ہے جو ابوطالب الثعلبی نے بیان کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ تفسیر کے معنی لفظ کی وضع کا بیان کر دینا ہے خواہ وہ حقیقت ہو یا مجاز مثلاً "صراط" کے معنی راستہ "صیب" کے معنی بارش اور "کفر" کے معنی انکار۔ اور تاویل کہتے ہیں باطن لفظ کی تفسیر کرنے کو۔ گویا تاویل کے معنی ہیں حقیقتِ مراد کی خبر دینا، اور تفسیر کے معنی ہیں دلیلِ مراد کی خبر دینا، کیونکہ لفظ کاشفِ مراد ہونے کے لحاظ سے دلیلِ مراد ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ اس کی تفسیر تو یہ ہے کہ "مرصاد" رصد سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں گھات میں رہنا اور نگرانی رکھنا۔ اس لئے مطلب یہ ہوا کہ تمہارا رب تمہارے اعمال کی دیکھ بھال رکھتا ہے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ ہم کو برے اعمال سے بچنا چاہئے اور احکامِ خداوندی کی تعمیل میں تکاسل وتہاون سے کام نہ لینا چاہئے۔

بعض لوگوں نے اس مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قرآن مجید میں جو چیز بیان کی گئی اور صحیح سنت میں جس کی تعیین کی گئی ہے اس کو ظاہر کر دینا تفسیر ہے۔ کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے اجتہاد سے ان میں کوئی جدت پیدا کرے ورنہ وہ تفسیر بالرائے ہو جائیگی۔ جس کی ممانعت کی گئی ہے اور تاویل ان احکام کو کہتے ہیں جن کا استنباط وہ علما کرتے ہیں جو خطاب کے نشیب وفراز سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اور جو علوم وفنون میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں۔ علامہ بغوی وغیرہ نے تاویل کی تعریف یہ کی ہے۔

التاویل صرف الآیة الی معنی	تاویل آیت کا لوٹا دینا ہے ایک ایسے معنی کی
موافق لما قبلها وما بعدها تحتمله	طرف جو ماقبل اور مابعد کے موافق ہو اور وہ
الآیة غیر مخالف الکتاب والسنة	معنی قرآن وسنت کے مخالف نہ ہوں اور ایسے

Marfat.com

من طریق الاستنباط [۱] معانی پیدا کرنا از راہ استنباط ہوگا۔

سطورِ بالا میں تفسیر و تاویل سے متعلق جو اقوال نقل کئے گئے ہیں، ان سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ تفسیر کا دارومدار بڑی حد تک علمِ لغت، معانی اور ادب پر ہے مگر تاویل یعنی قرآن مجید کی آیت کا صحیح مصداق متعین کرنے کے لئے صرف ان ہی علوم کی ضرورت نہیں بلکہ ضروری ہے کہ تاویل کرنے والا شریعت کے اسرار و حِکم، رموز و غوامض اور اس کے احکام و مسائل سے پوری طرح واقف ہو اور استنباطِ مسائل کے جو اصول ہیں ان میں مہارت و کمال کا مرتبہ رکھتا ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ شعرائِ فارس اپنے کلام میں تصوف کے مضامین کثرت سے بیان کرتے ہیں۔ لیکن بقول مرزا غالب

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہ شعرائِ متصوفین شراب بولتے ہیں اور اس سے شرابِ معرفت، ساقی سے مرشد کامل اور شاہد سے شاہدِ حقیقی مراد لیتے ہیں، اس بنا پر جو شخص فارسی شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بعہد ترقی اور شعراء کے اسالیبِ کلام سے واقف ہوگا اس کو شاعر کی صحیح مراد سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئیگی۔ اس کے برخلاف وہ شخص جو ان اسالیب سے واقف نہیں اور صرف زبانِ فارسی جانتا ہے وہ اشعار کا مطلب وہی سمجھے گا جو ان کے ظاہری و لغوی معانی سے مفہوم ہوتا ہے۔ پس اسی طرح دراصل تاویل کا اہل وہی شخص ہے جو شریعتِ اسلام کے تمام سرچشموں سے باخبر ہے اس کے بغیر اگر کوئی فہم قرآن کا ادعا کرتا ہے تو اس کا لغزشوں اور ٹھوکروں سے بچا رہنا نہایت مشکوک ہے، قرآن مجید میں ایک آیت ہے:۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ (الانعام)

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، ان ہی کے لئے امن ہے اور وہ سیدھے راستہ پر ہیں۔

---

[۱] الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۱۷۳۔

Marfat.com

اس آیت میں جو لفظ "ظلم" آیا ہے اس سے اگر لغوی معنی مراد لئے جائیں یعنی وضع الشیٔ فی غیر محلہٖ تو ہر گناہ صغیرہ و کبیرہ اس کے ماتحت داخل ہو جاتا ہے اور سوائے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کون ہے جس نے ایک مرتبہ بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا ہو تو اب اشکال پیش آتا ہے کہ پھر اس آیت کا مصداق کون لوگ ہیں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ظلم کے معنی لغوی مراد نہیں ہیں۔ اب لامحالہ ظلم کے معنی کی تعیین کرنے کے لئے آپ خود قرآن یا سنت کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ ایک روایت ملتی ہے کہ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت نے اس آیت کو سن کر سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہ کیا ہو" آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے مراد "شرک" ہے۔

ہم اپنی بحث کے اس حصہ کو حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ایک عبارت پر ختم کرتے ہیں جس میں پوری بحث کا خلاصہ بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ آگیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔

"قرآن عربی زبان میں براہ راست نازل ہوا۔ اہلِ عرب اپنے خداداد سلیقہ کے مطابق منطوقِ کلام کو سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتے تھے جیسا کہ خود قرآن مجید میں ارشاد ہے" والکتٰب المبین" کھلی اور واضح کتاب" ایک اور جگہ ارشاد ہے" قرآناً عربیاً لعلکم تعقلون" ایک مقام پر ہے" اُحکمت اٰیاتہ ثم فصّلت" یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات کے معانی و مطالب کے سلسلہ میں صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کم سوال کرتے تھے لیکن جب یہ طبقہ ختم ہو گیا اور عجم کا عمل دخل بڑھا۔ وہ پہلی زبان (خالص عربیت) متروک ہو گئی تو قرآن مجید کے بعض مقامات کا سمجھنا اور ان کا حل کرنا دشوار معلوم ہونے لگا۔ اب علم نحو اور لغت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سوالات جوابات کی نوبت آئی اور تفسیر میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔"

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کے فہم میں کن کن وجوہ و اسباب کی بنا پر دقت و دشواری یا غلطی پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ لکھتے ہیں:۔

Marfat.com

"قرآن مجید کے کسی لفظ کی مراد تک نہ پہنچ سکنے کے چند وجوہ ہوتے ہیں مثلاً (۱) کبھی نادر الاستعمال لفظ کا استعمال۔ اس کا علاج یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین اور دوسرے اربابِ معانی سے رجوع کر کے اس لفظ کے معنی معلوم کئے جائیں (۲) منسوخ اور ناسخ میں امتیاز نہ کرنا (۳) اسبابِ نزول کا یاد نہ رکھنا (۴) مضاف یا موصوف کے محذوف ہونے کے باعث (۵) ایک چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ یا ایک حرف کا کسی دوسرے حرف کے ساتھ ایک اسم کا دوسرے اسم، ایک فعل کا کسی دوسرے فعل کے ساتھ بدل جانا، یا جمع کی جگہ مفرد، مفرد کی جگہ جمع کا رکھا جانا۔ غائب کی جگہ مخاطب۔ یا اس کے برعکس ہونا۔ کبھی تقدیم ما حقہ التاخیر اور تاخیر ما حقہ التقدیم، انتشار ضمائر، ایک لفظ سے متعدد معانی کا مراد لیا جا سکنا (۶) کبھی قرآن مجید کے فہم میں دشواری کا باعث تکرارِ مضمون۔ اطناب یا اختصار و ایجاز ہوتا ہے۔ (۷) کبھی کنایہ، تعریف، متشابہ اور مجاز عقلی اس صعوبت فہم کا باعث ہوتا ہے۔"[1]

بہر حال اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن مجید کی فہم کا مرحلہ صرف لغت، ادب اور معانی و بیان کی روشنی میں کسی آیت کے مفہوم سمجھ لینے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی حقیقی مراد و مصداق کو متعین کرنے کے لئے سخت ضرورت ہے کہ فہم قرآن کا طالب شریعتِ اسلام کے اصل سرچشموں سے کماحقہ واقف ہو، اور ان میں مبصرانہ نگاہ رکھتا ہو، اس واقفیت کے بغیر قرآن مجید کو سمجھنے کی سعی کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص امراء القیس کے اشعار عہدِ جاہلیت کی تاریخ معاشرت، تہذیب و تمدن، روایات، مزعومات و توہمات کو جانے پہچانے بغیر سمجھنا چاہے۔

کیا قرآن مجید بغیر سنت کے صحیح معنی میں سمجھ میں آسکتا ہے؟

ہندوستان میں اب ایسے حضرات کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے جو مطالبِ قرآنی کے صحیح فہم کے لئے احادیث کے علم کو شرط قرار نہیں دیتے۔ ان کی رائے میں احادیث ناقابلِ اعتبار و استناد ہیں اور اس بنا پر ان میں یہ صلاحیت

---

[1] الفوز الکبیر ص ۱۷

Marfat.com

ہی نہیں کہ تشریع احکام یا تفسیر قرآن میں ان سے مدد لی جا سکے، اس وجہ سے ضرورت ہے کہ اس خاص مسئلہ پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ کلام کیا جائے۔

سنت سے احتجاج کا انکار ہمارے دورِ نامسعود کی ہی خصوصیت نہیں بلکہ اس سے قبل بھی کچھ لوگ تھے جو سنت کو قابلِ احتجاج تسلیم نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ علامہ ابن حزم اندلسی نے اپنی کتاب احکام الاحکام[۱] میں فتنۂ انکار حدیث کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی اور فتنہ نہیں ہو سکتا کہ آدمی قرآن مجید کو کتابِ الٰہی مانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بھی قائل ہو لیکن اس کے باوجود وہ احادیث و اخبار کی حجیت سے انکار کرے۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے نویں صدی ہجری کے آخر میں "مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج بالسنۃ" نامی کتاب اسی طرح کے ایک منکرِ حدیث کے رد میں تصنیف فرمائی تھی جو مصر سے شائع ہو چکی ہے۔ لیکن زمانہ کے اوصاف و اطوار کے اختلاف کی وجہ سے ہمارے عہد میں اور اس عہد میں فرق یہ ہے کہ زمانۂ گذشتہ میں چونکہ ایمان کامل اور عقائد پختہ اور تمسک بالشریعت کا جذبہ مستحکم تھا، اس لئے منکرِ حدیث پر گوشۂ عافیت تنگ ہو جاتا تھا۔ اس کی آواز صدا بہ صحرا ہو کر گمنامی و عدم قبول کی فضاؤں میں گم ہو جاتی تھی اور عام مسلمانوں میں اس کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن آج ایک شخص کھڑا ہو کر ڈنکے کی چوٹ احادیث نبوی کا انکار کرتا ہے، ان کی تشریعی و احکامی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ معاذ اللہ کتبِ حدیث کو "جھوٹ کا مواج دریا" کہتا ہے، ان کا استہزاء اور تمسخر کرتا ہے۔ سگرٹ کے پف ہوا میں اڑاتے اور اپنے ہونٹوں کو ایک اعوجاجی جنبش دیتے ہوئے ان پر پھبتیاں کستا ہے اس کے باوجود اس کو لوگ عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس کے مضامین کو رسالوں میں جگہ دی جاتی ہے اور اس کو "مجدد ملت" "محیی شریعت" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

"وائے گر در پسِ امروز بود فردائے"

---

[۱] احکام الاحکام ج ۱ ص ۱۰۲۔

دین میں مداہنت اور شریعت کی پابندیوں میں تساہل برتنے والی طبیعتیں اس کی آواز پر لبیک کہتی ہیں۔ اور اس طرح وہ چند برگشتہ دماغ نوجوانوں کا ایک حلقہ تیار کر لیتا ہے۔

قرآن میں اتباعِ رسول کا حکم

ان حضرات سے خود ان کے عقیدہ کے مطابق پہلی بات یہ دریافت کرنی چاہئے کہ قرآن مجید کو تو آپ قابلِ استناد اور اس کے احکام کو واجب الاتباع مانتے ہی ہیں۔ اب یہ ارشاد ہو کہ اس باب میں قرآن کا ایک ایک لفظ ایک ایک آیت سب برابر ہیں یا ان میں کوئی فرق ہے۔ نیز یہ کہ قرآن مجید میں جو اوامر و احکام ارشاد فرمائے گئے ہیں، ان میں کیا بعض احکام ایسے بھی ہیں جن کا مصداق خارج میں موجود نہیں؟ اگر یہ فرمایا جائے کہ قرآن کی تمام آیات کا خارج میں مصداق موجود ہے اور وہ سب ہمارے لئے ضروری الاتباع ہیں۔ تو پھر اُن آیات کی نسبت کیا کہا جائیگا۔ جن میں صاف طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے اور آپ کے اقوال و افعال پر عمل کرنے کا امر فرمایا گیا ہے۔ مثلاً آیاتِ ذیل

(۱) فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ — ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔

(۲) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ — مومن صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ "ایمان بالرسول" کے معنی کیا صرف یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کا اقرار کر لیا جائے اور آپ کے اقوال و افعال سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ اگر ایمان بالرسول کے معنی صرف یہی ہیں تو ایمان باللہ کے معنی بھی یہی ہونے چاہئیں کہ اللہ کی وحدت اور اس کی ربوبیت کا اقرار کر لیا جائے اور اس کے اوامر و نواہی کی پروا نہ کی جائے ظاہر ہے کہ جس شخص کو اسلام کے ساتھ دور کا بھی لگاؤ ہے وہ ایمان باللہ و بالرسول کے یہ معنی ہرگز مراد نہیں لے سکتا بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کو واحد و رب مطلق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی برحق یقین کر کے دونوں کے اوامر و نواہی پر عمل پیرا ہونے کا عہد و پیمان کرتا ہے۔ ورنہ اگر ایمان بالرسول سے مراد صرف آپ کی نبوت و رسالت پر ایمان لانا ہو تو

آپ کی حیثیت محض ایک ایلچی اور پیغامبر کی رہ جاتی ہے حالانکہ خود قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اس کی صاف تصریح کر دی ہے کہ آپ صرف ایلچی نہیں بلکہ قرآن کی مراد کو بیان کرنے والے اور اس کے شارح ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ	اور ہم نے آپ پر کتاب نہیں نازل کی مگر اس لئے
إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي	کہ آپ ان لوگوں کے سامنے مراد بیان کر دیں
اخْتَلَفُوا فِيهِ۔	جو اس میں اختلاف کر رہے ہیں۔

اس آیت میں فیہ کی ضمیر مجرور کتاب یعنی قرآن کی طرف راجع ہے۔ اس لئے مطلب یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن محض اسی لئے نازل کیا گیا ہے کہ جب قرآن کے کسی لفظ کے معنی یا حکم میں کچھ لوگ باہم اختلاف کریں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی مراد بیان فرما کر اس اختلاف کا خاتمہ کر دیں یہ منصب آپ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔

پھر ایک مقام پر فرمایا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى	اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا حکم
اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ	فرمادیں تو اب کسی مومن مرد اور عورت کو اپنے
الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن	معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور جو
يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ	شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا
ضَلَالًا مُّبِينًا۔	ہے وہ کھلا ہوا گمراہ ہے۔

دیکھئے اس آیت میں جس طرح اللہ کے امر کو واجب الاطاعت اور اس سے سرتابی کو کھلی ہوئی گمراہی قرار دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح امر رسول کو بھی واجب الاطاعت اور اس کی عدول حکمی کو ضلال مبین فرمایا گیا ہے۔ پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض ایک ایلچی کی ہوتی تو ورسولہ کہنے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی اور نہ اللہ کی نافرمانی کے ساتھ رسول کی نافرمانی کا ذکر کر کے اس کو کھلی ہوئی گمراہی کہا جاتا۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ قرآن مجید پر عمل کرنا ہی اللہ اور

Marfat.com

اس کے رسول پر ایمان لانا ہے تو معلوم نہیں اس آیت کا کیا جواب دیا جائے گا جس میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان جتاتے ہوئے صاف طور پر فرمادیا ہے کہ رسول اللہ تمہارے پاس کتاب (قرآن مجید) اور حکمت لیکر آئے ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ	اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ اس نے
بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ	خود ان ہی میں سے ایک رسول پیدا کیا جو اُن پر
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ	اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے ان کا تزکیہ کرتا
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ	ہے ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ
كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ	وہ پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

"حکمت" کیا بعینہٖ کتاب ہے؟ اور کیا "حکمت" کا عطف کتاب پر عطف بیان ہی ہے؟ اربابِ بلاغت جانتے ہیں کہ یہاں موقع عطفِ بیان کا ہے ہی نہیں، کیونکہ یہاں احسان جتایا جا رہا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد اوصاف کو بیان کرنا مقصود ہے اگر کتاب اور حکمت سے ایک ہی چیز مراد لی جائے تو آنحضرتؐ کے اوصاف میں ایک کی کمی ہو جاتی ہے چنانچہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں "میں نے ان بزرگ سے جو اہلِ علم میں مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں، سنا ہے کہ اس آیت میں کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے" پس اگر حکمت سے مراد غیر کتاب اللہ کوئی دوسری چیز ہے اور از روئے بلاغت حکمت سے کتاب اللہ مراد ہو ہی نہیں سکتی تو بتایا جائے وہ کہاں ہے اور کیا ہے؟ اور کیا وہ اقوال و افعال نبویؐ کے سوا کوئی دوسری چیز ہو سکتی ہے؟

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ	اے ایمان والو تم اطاعت کرو اللہ کی اور
وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ	اطاعت کرو اس کے رسول کی اور اپنے اولی الامر
مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ	کی۔ اور اگر کسی بات میں جھگڑ بیٹھو تو اس کو اللہ
اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔ (النساء)	اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔

Marfat.com

اس آیت میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے الگ الگ صیغہ "اطیعوا" لایا گیا ہے لیکن "اولی الامر" کے لئے الگ کوئی صیغہ نہیں لایا گیا بلکہ اس کو صرف "رسول" پر معطوف کر دیا گیا ہے۔ اس میں خاص نکتہ ہے؟ ہو سکتا تھا کہ صرف ایک "اطیعوا" بصیغۂ امر لایا جاتا اور رسول اور اولی الامر دونوں کو اللہ پر معطوف کر دیا جاتا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن تھا کہ تینوں کے لئے الگ الگ تین صیغے "اطیعوا" کے لائے جاتے، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار نہیں فرمایا گیا اور اللہ اور اس کے رسول کے لئے توجدا جدا "اطیعوا" ارشاد ہوا "اولی الامر" کے لئے نہیں۔ اس میں نکتہ بلیغ یہ ہے کہ قرآن مجید کو اصل میں دو مجموعۂ قوانین کی طرف اشارہ کرتا ہے ایک وہ جو اللہ کی طرف منسوب ہو کر "کتاب اللہ" اور دوسرا وہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہو کر سنتِ رسول اللہ کہلاتا ہے اور چونکہ اولی الامر (ان سے مراد حکام وولاۃ ہوں یا علماء و مجتہدین) کی اطاعت کے لئے الگ کوئی مجموعۂ قوانین نہیں ہے بلکہ ان کی اطاعت کے احکام وہی ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ماخوذ ہیں اس بنا پر ان کے لئے الگ صیغہ "اطیعوا" نہیں فرمایا گیا چنانچہ آیت کا اخیر حصہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ کہ اگر تم آپس میں جھگڑا کرو (تم میں حاکم اور محکوم دونوں شامل ہیں) تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو، مطلب یہ ہے کہ ان سے فیصلہ طلب کرو۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ ہمارے لئے قابلِ احتجاج دو چیزیں ہیں، ایک اللہ کا فرمان اور دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، اگر صرف اللہ کا فرمان یعنی "وحی متلو" ہی لائق استناد ہوتا تو "الرسول" فرمانے کی کیا وجہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ درحقیقت رسول کا فرمان بھی اللہ کا ہی فرمان ہے تب بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ "اللہ" کے ساتھ "رسول" کے ذکر کا سبب کیا ہے؟

اب ان آیتوں پر غور فرمائیے جن میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور آپ کے احکام و اوامر کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

Marfat.com

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى	تیرے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مؤمن نہیں
يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ	ہوں گے جب تک کہ یہ اپنے اختلافات میں آپ کو
لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا	حَکَم نہیں بنائیں گے اور پھر اس کے بعد آپ کے حکم کے
مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا	متعلق وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی محسوس نہیں کرینگے
(النساء)	اور پورے طور پر اس کو تسلیم نہیں کریں گے۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن زبیر سے روایت ہے کہ ایک انصاری نے حضرت زبیر سے درخت کو سیراب کرنے کے لئے پانی کے معاملہ میں جھگڑا کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو آپ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا "تم اپنی زمین کو سیراب کرلو، اور اس کے بعد پانی اپنے پروسی کے لئے چھوڑ دو، اس پر انصاری بولا" زبیر آپ کے پھوپی زاد بھائی ہیں نا" یہ سن کر سرور کائناتؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آپ نے فرمایا" اے زبیر! تم زمین کو سیراب کرو پھر پانی روک دو، یہاں تک کہ وہ دیواروں پر چڑھ جائے۔ زبیرؓ نے فرمایا میں گمان کرتا ہوں کہ یہ آیت فلا وربك لا يؤمنون الآية اسی واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔[1] ؎۲

؎۱ بخاری کتاب التفسیر سورۃ النساء۔ ؎۲ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ ایک مقام پر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر بیعت کرنے کو بعینہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرنا ہی قرار دیا گیا ہے اور جو لوگ بیعت کرنے کے بعد نقضِ عہد کریں ان کے لئے وعیدِ شدید اور بیعت کے مطابق عمل کرنے والوں کے لئے اجرِ عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ	بے شبہ وہ لوگ جو آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ
اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَنْ	خدا سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں
نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ وَمَنْ	پر ہے پھر جو شخص قول توڑتا ہے وہ اپنے نقصان
أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيهِ	کیلئے ہی توڑتا ہے اور جو اس چیز کو پورا کرتا ہے
أَجْرًا عَظِيمًا۔ (فتح)	جس کا اس نے اللہ سے اقرار کیا ہے تو اللہ اس کو اجرِ عظیم دیگا۔

Marfat.com

ان آیات سے یہ امر بالکل صاف ہوجاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی پر عمل کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ قرآن پر لیکن فرق یہ ہے کہ قرآن نقلِ متواتر کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس بنا پر وہ قطعی الثبوت ہے۔ اور احادیث کا حال یہ نہیں ہے ان میں بہت کم ایسی حدیثیں ہیں جن کو متواتر کہا جاتا ہے۔ پس یہ فرق محض نقل کی قوت وضعف کی وجہ سے ہے ورنہ اگر کسی حدیث کی نسبت کسی ذریعہ سے بالکل قطعی طور پر یہ ثابت ہوجائے کہ وہ بعینہٖ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تو وجوبِ عمل کے اعتبار سے اس میں اور قرآن کی آیت میں کوئی فرق نہیں ہوگا کیونکہ خود قرآن آپ کے متعلق شاہد ہے۔ وما ینطق عنِ الھویٰ۔ انْ ھوالّا وحیٌ یوحیٰ۔

حدیث کی تشریعی حیثیت ان آیات کا مطالعہ غور سے کرو اور دیکھو کہ منکرینِ حدیث میں سے جو لوگ حدیث کی تاریخی حیثیت کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کو تشریعِ احکام میں موثر نہیں مانتے انھیں بتانا چاہئے کہ اگر سنت کی حیثیت محض تاریخی ہے تشریعی نہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحکیم اور آپ کے فیصلہ کا واجب الاطاعۃ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ آخر آیت میں کس تاکید سے فرمایا گیا ہے کہ "تیرے رب کی قسم یہ مومن ہی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ کے فیصلہ کو بغیر کسی بددلی کے پورے طور پر تسلیم نہیں کرلیں گے۔"

اب دریافت طلب یہ ہے کہ یہ حکم آج بھی موجود ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے اور صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ تک کے لئے تھا تو چونکہ آپ کی حیات میں وحی برابر نازل ہوتی رہتی تھی اور جو بات اہم پیش آتی تھی اس کا جواب قرآن سے مل جاتا تھا اس لئے اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ آپ کو حکم بنانے اور آپ کے ارشادِ سامی کو تسلیم کرنے کا حکم دیا جاتا۔ لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ "ردوہ الی اللہ والرسول" اور آنحضرتؐ کے فیصلہ کو بے چون وچرا تسلیم کرنے کا حکم آج بھی ایسا ہی موجود ہے جیسا کہ آپ کے عہد میں تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر سنت کا تمام ذخیرہ (معاذ اللہ) ناقابلِ احتجاج ہے تو پھر "قضار

رسول" کو ادنیٰ پس وپیش کے بغیر تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرنے کی صورت کیا ہے؟ اور نزاع برپا ہونے کے وقت ردالی اللہ کے ساتھ رد الی الرسول کیونکر ممکن ہے؟

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ علامہ ابنِ قیم کے بہ قول "سنت" کا تعلق قرآن کے ساتھ تین طرح کا ہے۔ ایک یہ کہ سنت قرآن کے ساتھ پورے طور پر موافق ہو تو اب اس صورت میں قرآن اور سنت کا ایک حکم پر توارد ایسا ہی ہے جیسا کہ مختلف دلیلوں کا کسی ایک مدعا کے لئے جمع ہو جانا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سنت میں اس چیز کا بیان ہو جو قرآن میں مذکور ہے اور اس کی تفسیر ہو، تیسری صورت یہ ہے کہ قرآن مجید جس حکم کے ایجاب یا تحریم سے خاموش رہا ہو، اس کو سنت میں واجب یا حرام قرار دیا گیا ہو۔

علامہ ابن قیم ان تینوں صورتوں کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ سنت ان تین اقسام سے خارج نہیں ہے۔ اس بنا پر اس کو قرآن کے ساتھ کسی قسم کا تعارض نہیں۔ پس جو سنت قرآن پر کسی طرح بھی زائد ہو گی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک مستقل تشریع ہے۔ اور اس کی اطاعت واجب اور معصیت حرام ہے اور اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سنت کو کتاب اللہ پر تقدم حاصل ہے بلکہ آپ کے ارشادِ گرامی کی تعمیل تو بعینہ خدا کے فرمان کی بجا آوری ہے جو اس نے اپنے رسول کی اطاعت کے متعلق دیا ہے اور اگر اس قسم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ کی جائے تو پھر آپ کی اطاعت کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے اور جو طاعت حضورؐ کے ساتھ مختص ہے وہ کالعدم ہو جاتی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت صرف احکامِ قرآنی میں ضروری قرار دی جائے اور جس حکمِ نبوی کے متعلق قرآن خاموش ہو، اس کی اطاعت ضروری نہ ہو تو مخصوص طاعتِ رسول باقی نہیں رہے گی۔[1] حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔

---

[1] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۳۲۔

Marfat.com

جو "محققین" و "مجددین" حدیث کو محض ایک تاریخی حیثیت دیتے ہیں انھیں آیتِ ذیل بار بار پڑھنی چاہئے۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ	تم رسول کے بلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا کہ تم میں
كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ	کا ایک دوسرے کو بلالیتا ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ
الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا	تم میں سے ان لوگوں کو جانتا ہے جو کترا کر نکل
فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ	جاتے ہیں، وہ لوگ جو رسول کے امر سے اعراض
اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ	کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہئے کہ کہیں انھیں کوئی
عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔	فتنہ یا عذابِ الیم نہ پہنچ جائے۔

آپ نے دیکھا! اس آیت میں کس وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ کا ارشاد عام بات چیت یا عام ملفوظات کی طرح نہیں ہے کہ ان سے محض تاریخ کا کام لیا جائے بلکہ وہ واجب الاتباع ہے اور یخالفون کے صلہ میں "عن" واقع ہو رہا ہے۔ اس لئے معنی یہ ہوئے کہ جو لوگ امرِ رسول سے کترا کر نکل جاتے ہیں ان کو فتنہ یا شر پہنچنے کا اندیشہ ہے، کہاں حدیث کی محض تاریخی حیثیت اور کہاں یہ تاکید اکید۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا!

ایک دوسری آیت ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ	اور اتاری ہم نے تجھ پر یہ یادداشت تاکہ تو کھول دے
لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ۔	لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتری ان کیلئے۔

یہاں "یادداشت" سے مراد قرآن مجید ہے جو امم سابقہ کے شرائع و احوال کا محافظ، انبیائے سابقین کے علوم کا جامع اور احکامِ الٰہی اور فلاحِ دارین کے طریقوں کو یاد دلانے والا ہے اس آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے۔ حضور! آپ کا کام یہ ہے کہ تمام انسانوں کے لئے اس کتاب کے مضامین خوب کھول کھول کر بیان فرمائیں جو چیز قابلِ تشریح ہے اس کی تشریح فرمادیں۔ جو

مجمل ہے اس تفصیل کر دیں۔ یہ آیت اس حقیقت پر دلیل قاطع ہے کہ آیات قرآنی کا وہی مطلب قابلِ اعتبار ہے جو حضور کی بیان فرمودہ حدیثوں کے مطابق ہو۔

ان آیات بینات کے سوا ایک اور آیت ہے:۔

وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ	جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دیں اس کو
وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ۔	لے لو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ۔

اس آیت میں دو باتیں لائق توجہ ہیں۔ اول یہ کہ اس میں مَا فرمایا گیا ہے جو عام ہونے کے اعتبار سے ہر اس چیز کو شامل ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو دیں خواہ وہ قرآن مجید ہو یا ارشاداتِ نبوی۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کو قبول کر لیں اور پھر جس چیز سے آپ روکیں اس سے رک جائیں۔

ایتاء اور نہی کی اسناد مجازی ہے یا حقیقی

دوسری بات یہ ہے کہ "اتی" اور "نھی" ان دونوں فعلوں کی اسناد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو رہی ہے۔ اب گفتگو یہ ہو سکتی ہے کہ اسناد حقیقی ہے یا مجازی؟ اسناد مجازی کی صورت یہ ہوگی کہ دراصل "ایتاء" اور نھی کا فاعل یا مَاھُوَ لَہٗ

لے اس آیت کی وجہ سے بعض صحابہ تو فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی کتاب اللہ کا اطلاق مجازاً کر دیتے تھے۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے ہاتھوں کے گودنے اور گدوانے والی۔ اور بالوں کو نوچنے والی اور حسن کو نمایاں کرنے والی اور قدرتی پیدائش کی وضع کو بدلنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی۔ ایک عورت ام یعقوب کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ آئی اور کہنے لگی "مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اس اس طرح لعنت بھیجی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا "میں کیوں اس شخص پر لعنت نہ بھیجوں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملعون کیا ہو اور پھر وہ کتاب اللہ میں بھی ہو" عورت کہنے لگی "میں نے پورا قرآن پڑھا ہے لیکن مجھ کو تو کہیں پر لعنت کا حکم ملا نہیں۔ آپ نے فرمایا" اگر تم نے قرآن پڑھا ہوتا تو یہ ارشاد ضرور مل جاتا۔ کیا تم نے آیت وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا" پڑھی ہے ام یعقوب بولی ہاں! یہ آیت تو پڑھی ہے۔ ابنِ مسعودؓ نے فرمایا" تو پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی نمود و نمائش اور زیبائش و آرائش سے منع فرمایا ہے (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الحشر)۔

تو ہے خداوند تعالیٰ کی طرف لیکن مجازِ عقلی کے متعدد علاقوں میں سے کسی ایک علاقہ کے متحقق ہونے کی وجہ سے فعل کی اسناد بجائے اللہ کے رسول کی طرف کردی گئی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہاں اسناد حقیقی ہے اور اسناد مجازی ماننے کے لئے کوئی قوی وجہ موجود نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اس قسم کے موقع پر اگر کوئی بات بڑھا چڑھا کر پُرعظمت طریقہ سے بیان کرنی منظور ہوتی ہے تو وہاں اسنادِ مجازی سے کام لیا جاتا ہے مثلاً آپ اگر جامع مسجد دہلی کی کی عظمت بیان کرنا چاہتے ہیں تو کہیں گے" یہ مسجد شاہ جہاں بادشاہ نے بنائی ہے" پس اگر آیتِ بالا میں واقعی ایتاء اور نہی کا فاعل اللہ تعالیٰ ہوتا تو اس سے عدول کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی بلکہ حکم کی عظمت اور اس کے قبول کرنے کو بتاکید بیان کرنے کا مقتضیٰ یہ تھا کہ بجائے رسول کے اللہ کو ہی فاعل بنایا جاتا۔ کیونکہ" اللہ کا حکم" بہرحال" رسول کے حکم" سے زیادہ عظمت رکھتا ہے لیکن ایسا نہیں کیا گیا بلکہ رسول اللہ کو دونوں فعلوں کا فاعل بنایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت اٰتیٰ اور نہیٰ کی اسناد، اسناد حقیقی ہے مجازی نہیں۔ اس بنا پر اب آیت کے صاف معنیٰ یہ ہوگئے کہ رسول اللہ بذات خود جو چیز تم کو دیں اس کو قبول کرو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ۔[1]

---

[1] حضرت ابورافع کی ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں جو اپنے تخت پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو اور جب اس کے پاس کوئی ایسا حکم آئے جس میں میں نے کسی کام کے کرنے کا امر یا نہ کرنے کی نہی کی ہو تو وہ کہے کہ میں اسے نہیں جانتا میں تو وہی جانتا ہوں جس کو کتاب اللہ نے بیان کیا ہے" (ابوداؤد) جامع ترمذی میں مقدام بن معدی کرب کی حدیث ہے کہ کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں تو صرف کتاب اللہ کے حلال وحرام کو ہی مانتا ہوں۔ خبردار ہو کہ جس کو رسول اللہ نے حرام کیا ہے وہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کی طرح ہے۔ ان روایات میں حمار اہلی (گدھے) درندوں اور لقطۂ معاہد کی حرمت کا ذکر ہے جسے ہم آگے تفصیل سے بیان کریں گے۔ انہی احادیث کے بعض طریقوں میں یہ الفاظ بھی ہیں الا من بلغہ عنی حدیث فکذب بہ فقد کذب اللہ ورسولہ والذی حدثہ یعنی اچھی طرح سن لو کہ جس کے پاس میری حدیث پہنچے اور اس کے باوجود اسے جھٹلائے تو حقیقت میں اس نے اللہ تعالیٰ کو، اللہ تعالیٰ کے رسول کو اور اس کو جھٹلایا جس نے اس سے یہ حدیث بیان کی (مجمع الزوائد للہیثمی)

Marfat.com

خلاصہ یہ ہے کہ یہ اور اسی طرح کی متعدد آیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے احکام کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت ضروری ہے۔ اب بحث یہ ہے کہ قرآن مجید کی یہ آیات قطعی الثبوت اور قطعی الحکم ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو ان کا خارج میں کوئی مصداق موجود ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ اور کیا وہ سنت کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے؟

یہاں تک جو گفتگو تھی وہ قرآن مجید کی ان چند آیات کے پیش نظر تھی جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور آپ کے ارشاداتِ گرامی پر عمل پیرا ہونے کا حکم تھا۔ اب آئیے یہ دیکھیں کہ قرآن مجید حقیقی طور پر "سنت" کے بغیر سمجھ میں آبھی سکتا ہے یا نہیں اور اس کا صحیح مفہوم و مطلب بغیر سنت کے متعین ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟

آیاتِ قرآنی کا صحیح مفہوم سنت کے بغیر متعین نہیں ہوسکتا

اصل یہ ہے کہ اگر قرآن کو سمجھنے کی کوشش میں سنت سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے تو قرآن مبہم اوامر و نواہی اور قصص کا ایک مجموعہ ہو کر رہ جائے گا۔ اور اسلام کے مکمل و مفصل دستورِ اساسی ہونے کی حیثیت بڑی حد تک باطل ہو جائیگی مثلاً "اقیموا الصلوٰۃ" کے معنی و مصداق کی تحقیق میں اگر سنت سے مدد نہ لی جائے تو اس حکم کی تعمیل میں عجیب قسم کا انتشار نظر آئے گا۔ صلوٰۃ کے لغوی معنی دعا، یا عبادت گاہ ہیں۔ پس کوئی صاحب تو اس حکم کی تعمیل محض دعا کریں گے اور اس کے لئے بھی کوئی خاص شکل اور کوئی خاص وقت نہیں ہوگا وارکعوا مع الراکعین کے امر کی تعمیل میں بھی اسی طرح ہڑبونگ نظر آئے گی۔ رکوع کے معنی لغۃً مطلق انحناء (جھکنا) ہیں۔ اب اگر رکوع کو اس کی حقیقت شرعیہ (جس کا ثبوت صرف سنت سے ملتا ہے) سے الگ کرلیا جائے تو یہ معلوم ہی نہیں ہوسکتا کہ وارکعوا مع الراکعین کے معنی کیا ہیں؟ اور اس کا مقصد کیا ہے۔ ایک صلوٰۃ و رکوع پر کیا موقوف ہے، زکوٰۃ، حج، اوقات و ارکانِ صلوٰۃ، ربوٰ وغیرہ کسی کی صحیح حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اور پورے قرآن کو پڑھنے کے بعد بھی عبادات و معاملات کا کوئی مکمل جامع نقشہ مرتب نہیں ہوسکتا۔

Marfat.com

حضرت عمران بن حصینؓ کا استدلال

امام بیہقیؒ نے اپنی سند سے شبیب بن فضالۃ المکی سے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ عمران بن حصینؓ نے چند لوگوں کے سامنے شفاعت کا بیان کیا ایک شخص بولا "اے ابو النجید تم ہمارے سامنے وہ حدیثیں بیان کرتے ہو جن کی اصل ہم کو قرآن میں نہیں ملتی" عمران یہ سنکر غضبناک ہو گئے اور آپ نے اس شخص سے فرمایا "تم نے قرآن پڑھا ہے؟" اس نے کہا "ہاں"۔ فرمایا "کیا تم نے قرآن میں کہیں یہ پڑھا ہے کہ عشار کی فرض رکعتیں چار، مغرب کی تین، فجر کی دو، ظہر اور عصر کی چار چار ہیں" بولا "نہیں" حضرت عمران بن حصینؓ نے فرمایا "کہاں ان سب رکعتوں کا علم تم نے ہم سے حاصل نہیں کیا۔ اور کیا ہم نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سیکھا ہے؟" پھر عمران بن حصین نے سوال کیا "کیا تمہیں قرآن میں کوئی ایسی آیت ملی ہے جس میں بتایا گیا ہو کہ چالیس بکریوں میں ایک بکری زکوٰۃ کی، اور اتنے اونٹوں میں ایک اونٹ اور اتنے دراہم میں ایک درہم زکوٰۃ کا ادا کرنا ہوگا" اس شخص نے کہا "نہیں" آپ بولے "کیا زکوٰۃ کی ان تمام مقادیر اور نصاب کا علم تم نے ہم سے اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سیکھا ہے؟" اس کے بعد عمران نے فرمایا "قرآن مجید میں ہے ولیطوفوا بالبیت العتیق تو کیا قرآن نے تم کو یہ بھی بتایا ہے کہ سات طواف کیا کرو اور اس سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت ادا کرو" پھر فرمایا کہ تم نے قرآن میں یہ بھی دیکھا ہے؟

لا جلب ولا جنب ولا شغار فی الاسلام (مشکوٰۃ شریف) اسلام میں نہ جلب ہے نہ جنب اور نہ شغار[1]

کیا تم نے سنا نہیں قرآن ہی خود کہتا ہے وما اتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا۔ اس تقریر کے بعد عمران بولے یہ اسلامی احکام (جو عبادات و معاملات سے متعلق ہیں) سب کے سب ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لئے ہیں اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کا تم کو علم نہیں

---

[1] زکوٰۃ کی اصطلاح میں جلب اور جنب یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے والا زکوٰۃ کے مویشیوں سے دور خیمے گاڑ کر زکوٰۃ دینے والوں کو اپنے پاس مویشیوں اور زکوٰۃ کی رقم کے لئے مجبور کرے اور شغار کے معنی ہیں اپنی بیٹی کا دوسرے کے بیٹے سے اس شرط پر نکاح کرنا کہ وہ اپنی بیٹی اس کے بیٹے سے بیاہ دے۔ اسلام میں دونوں باتوں کی ممانعت ہے۔

Marfat.com

یعنی قرآن مجید کی تلاوت کرنے کے باوجود۔[۵۱]

سنت اور لغت اگر فہم قرآن میں سنت سے مدد نہ لی جائے تو اس سے نہ صرف یہ کہ منقولاتِ شرعیہ (یعنی وہ الفاظ جو لغتاً کسی معنی میں مستعمل ہوئے تھے لیکن شریعت نے ان کے معانی مخصوص و متعین کردیئے ہیں مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، اعتکاف، طواف وغیرہ) کو ہم نہیں سمجھ سکتے بلکہ لغت کی روشنی میں بھی بعض آیات کے مفہوم کو صحیح طور پر متعین نہیں کرسکتے۔[۵۲]

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام زباں داں اور عربی فصاحت و بلاغت سے پورے طور پر واقف ہونے کے باوجود بعض آیات کا مطلب نہیں سمجھتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے تھے۔ آیتِ حج وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا نازل ہوئی تو ایک صحابی نے دریافت کیا العامنا ھذا یا رسول اللہ الخ یہ حکم اسی سال کے لئے ہے یا ہر سال کے لئے؟ پھر آپ نے اس کی تشریح فرمائی کہ ایک شخص پر عمر بھر میں ایک مرتبہ حج کرنا فرض ہے۔ بشرطیکہ اس میں فرضیتِ حج کی شرائط پائی جائیں۔

تیمم سے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا اگر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرلو۔

تو صحابہ کرام کو واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ تیمم صرف وضو کی ضرورت کے وقت کے لئے ہے یا غسلِ ضروری کے لئے بھی۔ چنانچہ ایک صحابی کو سفر میں غسل کی ضرورت پیش آگئی اور وہاں پانی تھا نہیں انھوں نے اجتہاداً اپنے تمام بدن کا مٹی سے تیمم کرلیا۔ آنحضرت صلی اللہ

---

۵۱ مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج بالسنۃ ص ۲۰۵۔ حکم بن آبان نے حضرت عکرمہؒ سے ام ولد کے متعلق دریافت کیا عکرمہ نے فرمایا وہ آزاد ہیں، حکم کہتے ہیں میں نے پوچھا کس حکم سے (یعنی یہ حکم کہاں ہے) فرمایا قرآن میں، میں نے کہا قرآن کی کونسی آیت میں فرمایا یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔

۵۲ علامہ شاطبیؒ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔ ولتعلم بذلک ان بیان السنۃ ھو مراد اللہ تعالیٰ من تلک الصیغ فاذا طرحت واتبع ظاھر الصیغ بمجرد الھوی صار صاحب ھذا النظر ضالا فی نظرہ جاھلا بالکتاب خابطا فی عمیاء الخ (الموافقات فی اصول الشریعۃ ج ۴ ص ۲۰)۔

علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو فرمایا "جو تیمم وضو کا قائم مقام ہے وہی غسل کا بھی قائم مقام ہے۔" اس طرح کی بہت سی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کا صحیح مفہوم متعین نہ فرما دیتے تو صحابہ کرام میں سخت اختلاف پیدا ہو جاتا اور قطعی طور پر ان کے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا۔

بعض دفعہ کلام کی مراد بجز مخاطب کے کوئی دوسرا متعین نہیں کر سکتا

پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ کرنی چاہیئے کہ بعض اوقات کسی کلام کا صحیح مفہوم صرف مخاطب کے ذریعہ ہی متعین ہو سکتا ہے، مثلاً فرض کیجئے آپ اپنے کسی بیمار دوست کی عیادت کے لئے گئے ہیں اور اس سے مزاج کی کیفیت دریافت کرتے ہیں تو وہ اکتائے ہوئے لہجہ سے کہتا ہے "اچھا ہوں" اس جملہ کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ اب وہ تندرست ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ بیمار دوست نے جو "اچھا ہوں" کہا تھا وہ کس لہجہ کے ساتھ کہا تھا اور اس بنا پر اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو اس کے الفاظ سے ظاہری طور پر متبادر ہوتا ہے بلکہ دراصل مقصد یہ ہے کہ بیماری کو اتنا امتداد ہو گیا ہے کہ اب میں اپنے مرض کے متعلق کیا کہوں؟ بس یہی کہنا چاہیئے کہ اچھا ہوں۔

پس جب آپ روزمرہ کی گفتگو میں بعض جملوں کا مطلب ان کے ظاہر المعنی ہونے کے باوجود مخاطب کی امداد کے بغیر نہیں سمجھ سکتے تو قرآن مجید کو سنت سے الگ کر کے کس طرح سمجھ سکتے ہیں جبکہ یہ معلوم ہے کہ قرآن مجید تشریعِ احکام کی کتابِ سماوی ہے اور اس کا نزول ایک خاص ماحول میں وقت کے پیش آمدہ مسائل کے جواب میں ایک خاص قسم کی نفسیات و طبائع رکھنے والی قوم کی زبان میں نجماً نجماً ہوا ہے اور جس میں اخلاق و کردار کی اصلاح کے نفسیاتی اصول کو کہیں نظر انداز نہیں کیا گیا۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں "کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں نہ ہو، لیکن بات یہ ہے کہ ہماری سمجھ اس کے فہم سے قاصر ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

Marfat.com

خطاب کر کے فرماتا ہے:۔

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ۔ (النحل)

تاکہ جو چیزیں آپ پر نازل کی گئی ہیں آپ لوگوں کے سامنے ان کی تشریح کر دیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں" سنتِ ثابتہ قرآن کے منافی نہیں بلکہ اس کی مؤید ہے اگرچہ قرآن میں سنت کے الفاظ کی نصِ صریح نہ ہو کیونکہ کوئی شخص قرآن کو ایسا نہیں سمجھ سکتا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سمجھا ہے۔

حضرت مکحول الدمشقی فرماتے تھے:۔

القرآن احوج الی السنۃ من السنۃ الی القرآن۔ [1]

قرآن کو سنت کی زیادہ احتیاج ہے بہ نسبت اس کے کہ سنت کو قرآن کی ضرورت ہو

یحییٰ بن ابی کثیر کہتے تھے:۔

السنۃ قاضیۃ علی الکتاب و لیس الکتاب قاضیا علی السنۃ

سنت کتاب اللہ پر حکم کرنے والی ہے اور کتاب سنت پر حکم نہیں کرتی

ایک غلط فہمی کا ازالہ اس سے اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہئے کہ سنت قرآن کے تابع نہیں اور قرآن سنت کے تابع [2] ہے۔ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی حیثیت متن کی اور سنت کی حیثیت شرح کی ہے۔ قرآن میں خفی بھی ہے، مشکل اور مجمل بھی، سنت ان سب کا بیان کرتی ہے اور ان کی تفصیل کرتی ہے۔ اس بنا پر سنت سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے اس سے فہمِ قرآن میں مدد لی جا سکتی ہے اور سنت چونکہ شرح کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں خفا، اجمال اور اشکال نہیں ہے اس لئے قرآن مجید کو اس کے لئے اصل تو کہا جائے گا مبین نہیں

---

[1] حافظ ابو عمر بن عبد البرؒ فرماتے ہیں۔ مکحول کا مطلب ان الفاظ سے یہ ہے کہ کتاب اللہ کیلئے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبین ہے یعنی اس کی مراد واضح کرتی ہے انھا تقضی علیہ وتبین المراد منہ۔ (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹۱)

[2] امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں" السنۃ قاضیۃ علی الکتاب" کی جگہ یوں تعبیر ہونی چاہئے ان السنۃ تفسر الکتاب وتبینہ (جامع بیان العلم ج ۲)

کہا جا سکتا۔ چنانچہ جن لوگوں نے سنت سے قطع نظر کرکے عبادات کے اوقات اور ارکان، اور ان کے طریقے خود قرآن سے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے عجیب طرح کی مضحکہ انگیز تاویلوں سے کام لیا ہے۔ اور پھر بھی وہ عبادات کو اس منظم طریقہ پر قائم نہیں رکھ سکے جس پر اب تک امتِ محمدیہ کا عملِ متواتر رہا ہے۔ اور اگر ان کی توجیہہ و تاویل تعاملِ امت کے مطابق ہوتی بھی ہے تو وہ اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ سب کا اس پر متفق ہونا مشکل ہے۔ یہاں ہم صرف اس کی ایک مثال پر کفایت کریں گے۔

قرآن مجید میں "اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ" فرما کر اس کا حکم دیا گیا ہے کہ جمعہ کے دن نماز کی اذان ہو تو اللہ کے ذکر کے لئے دوڑو۔ اب اگر آپ سنت سے بالکل قطع نظر کرلیں تو محض اس آیت کو دیکھکر یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ حکم جمعہ کے دن کی کس نماز کے لئے ہے اور اگر جمعہ کی الگ کوئی نماز ہوتی ہے تو وہ کس وقت پڑھی جاتی ہے۔ ایک منکرِ حدیث کے سامنے اس کا ذکر آیا تو اس نے کہا کہ سنت سے استمداد کی ضرورت نہیں ہے وذروا البیع تم بیع چھوڑ دو" اور "وابتغوا من فضل اللہ" یہ دونوں ٹکڑے اس بات کی دلیل ہیں کہ جمعہ کی نماز ظہر کے وقت ہوتی ہے کیونکہ بیع و شرا اور ابتغاء فضل اللہ یعنی رزق کے طلب کرنے کا وقت دوپہر کا ہی ہوتا ہے۔

اب غور کیجئے یہ توجیہہ کس قدر کمزور ہے، آپ تصور کیجئے اگر آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اور مسلمانوں کا تعامل معلوم نہ ہوتا تو کیا اس وقت بھی محض وذروا البیع اور وابتغوا من فضل اللہ کو سامنے رکھکر جمعہ کی نماز کا وقت قطعیت کے ساتھ متعین کر سکتے تھے اور کیا آپ کو یہ خیال نہ آتا کہ دوپہر کو لوگ عموماً آرام کرتے ہیں خرید و فروخت کا اور طلبِ رزق کا وقت صبح اور شام ہی ہے جیسا کہ بالعموم ہندوستان میں دیکھا جاتا ہے۔

یہاں ہم نے صرف ایک مثال نقل کی ہے، سنت سے الگ رہ کر قرآن مجید سے آپ عبادات وغیرہ کی جو شکلیں، ارکان و آداب اور اوقات و شرائط مستنبط کریں گے، ان سب کا

Marfat.com

حال یہی ہوگا۔ اور آپ مسلمانوں کو کسی ایک قطعی نظام کے ساتھ وابستہ نہیں کر سکیں گے جس کے باعث ان میں گمراہی پھیلے گی تشتت اور افتراق پیدا ہوگا اور ان کا شیرازۂ جمعیت پریشان ہو کر رہ جائیگا۔ اسی قسم کی گمراہیاں ہیں جن سے محفوظ رکھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

انی قد ترکت فیکم شیئن لن	میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جن کے بعد
تضلوا بعدھما ابدا کتاب اللہ	تم کبھی بھی گمراہ نہیں ہوگے۔ ایک کتاب اللہ اور دوسری
وسنتی ولن یفترقا حتی یردوا	میری سنت اور یہ دونوں حوضِ کوثر پر وارد ہونے
علی الحوض۔ [1]	تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔

مالک بن انسؓ سے منقول ہے کہ سید کونین ؐ نے حجۃ الوداع میں فرمایا۔

امران ترکتھما فیکم لن تضلوا	دو امر ہیں جن کو میں تم میں چھوڑے جاتا ہوں جبتک
ما تمسکتم بھما کتاب اللہ و	تم ان سے تمسک کروگے گمراہ نہیں ہوگے، ایک
سنۃ نبیہ۔	کتاب اللہ اور دوسری سنتِ نبی۔

صحابۂ کرام اور سنت کا احترام یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام بعض اوقات کسی مسئلہ کی نسبت کوئی حکم صادر فرما دیتے لیکن انھیں بعد میں معلوم ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فتوی اس کے خلاف ہے تو فوراً اس سے رجوع کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ بنو ثقیف کے ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ بیت اللہ کی زیارت کرنے کے بعد اگر کسی عورت کو حیض آجائے تو وہ کوچ کرے یا نہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس پر ثقفی بولا کہ اس قسم کی ایک عورت سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو آپ کے فتوے کے خلاف فتوٰی دیا تھا۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ کھڑے ہوگئے اور ثقفی کو دُرّہ سے مار کر فرمایا "جس چیز کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتوٰی دے چکے ہیں تم اس کے متعلق مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو"۔ حضرت عمرؓ دریافت فرماتے تھے کہ "دیت عاقلہ کے لئے ہے اور کسی عورت کو شوہر کی دیت میں سے وراثت نہیں مل سکتی۔ ضحاک بن سفیانؓ

[1] مستدرک حاکم عن ابی ہریرۃ کتاب العلم ج ص ۹۳۔

Marfat.com

نے انھیں بتایا کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو لکھا تھا کہ اشیم الضبی کی بیوی کو اس کی دیت میں سے حصہ دیدیا جائے حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اپنے قول سے رجوع کر لیا۔[۵۱]

اسی طرح جنین (حمل) کی دیت کے بارہ میں حضرت عمرؓ کا قیاس یہ تھا کہ عام دیتوں کی طرح اس میں بھی گائے بکری وغیرہ دینی ہوگی لیکن جبکہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے آپ کو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ میں ایک غلام یا باندی کے آزاد کرنے کا حکم دیا ہے تو آپ نے حضرت مغیرہ سے ان کی روایت پر ایک شاہد طلب کیا اور جب محمد بن مسلمہ نے شہادت دیکر اس کی توثیق کر دی تو حضرت عمرؓ کو اطمینان ہو گیا اور پھر آپ نے اس حدیث کی روشنی میں ہی دیتِ جنین کے متعلق فیصلہ کیا۔[۵۲]

بعض روایتوں میں تو یہاں تک آتا ہے کہ اسی قسم کے ایک معاملہ میں حضرت عمرؓ نے ایک صحابی کی زبانی حدیث سن کر ارشاد فرمایا "اگر ہم یہ روایت نہ سنتے تو قریب تھا کہ اپنی رائے سے کام لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف کوئی حکم صادر کر بیٹھتے"۔

صحابہ اگر کسی چیز پر عامل ہوتے اور ان کو معلوم ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل اس کے خلاف ہے تو فوراً اس سے تائب ہو جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ ایک مرتبہ شام تشریف لے جا رہے تھے۔ مقام سرغ پر پہنچکر انھیں معلوم ہوا کہ وہاں وبا پھیلی ہوئی ہے۔ اب آپ بڑے متردد ہوئے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اگر کسی شہر میں وبا پھیلی ہوئی ہو تو وہاں مت جاؤ اور اگر تم کسی شہر میں موجود ہو اور وہاں وبا پھیلنی شروع ہو جائے تو اس کے خوف سے بھاگو مت"۔ حضرت عمرؓ یہ سنکر سرغ سے واپس تشریف لے آئے۔

کسی مسئلہ میں اگر انھیں شک ہوتا تھا تو خود اقدام نہیں کرتے تھے پہلے اس کا حکم کتاب اللہ میں تلاش کرتے اگر وہاں نہ ملتا تو سنت میں تلاش کرتے تھے۔

---

[۵۱] معالم السنن ج ۴ کتاب الدیات ص ۱۰۵ و ۱۰۶۔ [۵۲] ایضاً ج ۴ ص ۳۲۔

Marfat.com

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس ایک عورت آئی جس کے نواسہ کا انتقال ہوچکا تھا۔ اس نے اپنے حقِ وراثت کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا "تمہارے لئے قرآن میں کوئی حکم نہیں ہے اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہے سنت میں بھی کچھ نہیں ہے، اب تم چلی جاؤ، میں لوگوں سے دریافت کرلوں۔ آپ نے صحابۂ کرام سے استفسار کیا تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے فرمایا" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا۔ آپ نے اسی طرح کے ایک معاملہ میں نانی کو چھٹا حصہ دلوایا تھا۔" حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا، تمہارا کوئی گواہ بھی ہے؟ محمد بن مسلمۃ الانصاریؓ کھڑے ہو کر بولے "میں ہوں" اور انھوں نے وہی فرمایا جو حضرت مغیرہ نے کہا تھا۔ یہ سن کر آپ نے عورت کو سُدس دیدینے کا حکم صادر کردیا[۵۱]

ابنِ خزیمہ کہتے تھے "اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت ہوجائے تو اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کو کچھ کہنا درست نہیں ہے۔[۵۲]

جو لوگ حدیث کو بھی نہیں مانتے وہ ائمۂ دین کے ان اقوال کو کیا مانیں گے۔ لیکن ہم نے ان کو اس غرض سے نقل کیا ہے کہ ان اقوال سے سنت کی اصل حیثیت پر روشنی پڑتی ہے ہم نے بجائے اس کے کہ سنت اور قرآن کے باہمی تعلق پر بحث کے لئے اپنے دلائل کے سلسلہ میں یہ چیزیں بیان کرتے، ان بزرگوں کے حوالہ سے انھیں بیان کردیا ہے۔

صحابۂ کرام جو زبان داں ہونے کے باوصف درسگاہِ نبوت سے براہِ راست فیضیاب ہونے کا شرف رکھتے تھے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیتیں مجمل ہیں، کہیں ان آیتوں میں ظاہری اعتبار سے اشکال اور خفا پیدا ہوگیا ہے، اگر اس اجمال و خفا کو دور کرنے کے لئے سنت سے کام نہ لیا جائے تو ظاہر ہے کسی مکمل ضابطۂ احکام اور مجموعۂ قوانین کی ترتیب دشوار ہوجائے مثلاً قرآن مجید میں ہے اقیموا الصلوٰۃ نماز پڑھو۔

---

۵۱ ابوداؤد کتاب الفرائض بابٌ فی الجدۃ۔ ۵۲ یہ سب اقوال وروایات مفتاح الجنۃ، جامع بیان العلم جلد ثانی لابن عبدالبرؒ اور مفتاح السنہ للخولی سے ماخوذ ہیں۔

آتوا الزکوٰۃ زکوٰۃ ادا کرو والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما۔ احل اللہ البیع وحرم الربوا۔

اللہ نے تمہارے لئے خرید و فروخت حلال کر دی اور سود کو حرام قرار دیدیا ہے۔ لیکن تمام قرآن میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ نماز کس طرح پڑھیں اور اس کے ارکان کیا ہیں اور ان میں کیا ترتیب ہے؟ زکوٰۃ کس کس مال پر واجب ہے اور کتنی، چور کا ہاتھ کاٹنے کے لئے کوئی نصاب مقرر ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو اس میں بڑا اختلال لازم آتا ہے۔ کسی نے ایک پیسہ چرا لیا اور اس کو دست بریدہ کر دیا گیا۔ اور اگر نصاب مقرر ہے تو وہ کتنا؟ پھر ایک چوری میں دونوں ہاتھ بیک وقت قطع کئے جائیں گے یا ایک ہی ہاتھ کاٹا جائے گا اور اگر ایک ہی ہاتھ قطع ہوگا تو دایاں یا بایاں۔ اسی طرح قرآن نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام تو بتا دیا لیکن لغت میں ربوا کے معنی صرف زیادتی کے ہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ اس زیادتی سے کیا مراد ہے؟ اور کس قسم کی اور کتنی زیادتی حرام ہے۔

اگر صرف قرآن پر ہی بایں معنی مدار شریعت ہے کہ احادیث کی بیان کی ہوئی تشریحات کو یک قلم نظر انداز کر دیا جائے اور الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی فرما کر جس دین کے اکمال کا مژدہ سنایا گیا ہے اگر اس کا منبع و مصدر صرف وہ قرآن ہے جس کے معانی و مطالب کی تفہیم میں صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو کوئی دخل نہ ہو تو ان تمام تنقیحاتِ بالا کا جواب اس میں ہونا چاہیئے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس میں نہیں ہے۔ ہاں سنت کو قرآن کے لئے بیان و تفسیر یا تفصیلِ اجمال قرار دیا جائے اور دونوں کو ملا کر تشریع احکام کا منشا کہا جائے تو بے شبہ قرآن مجید کا دعویٰ اتمام نعمت و اکمالِ دین درست ہے اور خود قرآن مجید کی تصریحات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ سنت اس کے لئے بمنزلہ بیان و تشریح ہے۔ آیت ذیل پر پھر غور کیجئے۔

ے حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں۔ والبیان منہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ضربین بیان المجمل فی الکتاب العزیز کالصلوات الخمس فی مواقیتھا وسجودھا ورکوعھا وسائر احکامھا وکبیانہ للزکوۃ وحدھا ووقتھا وما الذی توخذ منہ الاموال وبیانہ لمناسک الحج قال صلی اللہ علیہ وسلم اذ حج بالناس خذوا عنی مناسککم لان القرآن انما ورد بجملۃ فرض الصلوۃ والزکوۃ والحج دون تفصیل والحدیث مفصل جامع بیان العلم وفضلہ ج ۲ ص ۱۹۰

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ
ہم نے آپ پر نصیحت کی کتاب نازل کی تاکہ جو تعلیم لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہے آپ ان پر اسے اچھی طرح واضح کردیں۔

دیکھئے لِتُبَيِّنَ میں لام غایت کا ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو قرآن نازل کیا ہے اس کی غایت یہی ہے کہ آپ اس کو کھول کھول کر لوگوں کے سامنے بیان کریں یعنی آپ ہی اس کے بہترین شارح، مفسر اور اس کے معانی و مطالب کو بیان کرنے والے ہیں۔ کوئی شخص فہم قرآن میں آپ سے اور آپ کی بیان فرمودہ تشریحات سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔

مطرف بن عبداللہ سے کسی نے کہا "تم ہم سے سوائے قرآن کے اور کچھ بیان نہ کیا کرو" فرمایا "بخدا ہم قرآن کے بدلہ کسی اور چیز کو تمہارے سامنے پیش نہیں کرتے البتہ (احادیث سنا کر) اس ذاتِ گرامی کا ارادہ کرتے ہیں جو ہم سب سے زیادہ عالم بالقرآن تھے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم"[۵۱]

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت سعید بن جبیرؓ کے ساتھ پیش آیا۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک حدیث بیان کی۔ ایک شخص بولا "قرآن مجید میں تو اس کے خلاف ہے" سعید بن جبیرؓ نے فرمایا

"میں ایک حدیث بیان کرتا ہوں اور تم اس پر کتاب اللہ پیش کرتے ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری بہ نسبت کتاب اللہ کو زیادہ اچھی طرح جانتے تھے"[۵۲]

قرآن کے اجمال اور سنت کی حیثیتِ تفصیل و بیان کی بنا پر صحابۂ کرام سنت کے ساتھ بہت اعتنا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اسی کے ذریعہ قرآن کی آیات کے صحیح معانی و مطالب متعین ہوسکتے ہیں۔ حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے تھے۔

"عنقریب تمہارے پاس ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن مجید کے شبہات کے ساتھ تم سے مجادلہ کریں گے تم ان پر سنن کے ذریعہ گرفت کرنا کیونکہ اصحابِ سنن کتاب اللہ کے بڑے عالم ہوتے ہیں"[۵۳]

---

[۵۱] جامع بیان العلم ج ۲ و موافقات امام شاطبی ج ۴ ص ۲۶۔ [۵۲] مسند دارمی۔
[۵۳] موافقات امام شاطبی ج ۴ ص ۱۷۔ وعن ابن مسعودؓ ستجدون اقواما یدعونکم الی کتاب اللہ نبذوہ وراء ظھورھم فعلیکم بالعلم وعن عمرؓ انما اخاف علیکم رجلین رجل یتاول القرآن علی غیر تاویلہ و رجل ینافس (علی اخیہ) (ایضاً کتاب مذکور) ان آثار کو نقل کرنے کے بعد (باقی صفحہ ۹۳ پر ملاحظہ ہو)

بعینہ یہی مقولہ لالکائی نے حضرت علی بن ابی طالبؓ سے نقل کیا ہے۔

علامہ ابن سعدؒ نے "طبقات" میں بطریق عکرمہؒ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کو خوارج کے پاس بھیجا تو فرمایا "تم ان کے پاس جاؤ اور مباحثہ کرو، مگر دیکھنا قرآن کو درمیان میں نہ لانا کیونکہ وہ معانی مختلفہ کو محتمل ہوتا ہے۔ البتہ سنت سے احتجاج کرنا" ابن عباسؓ نے فرمایا "میں تو ان کی بہ نسبت قرآن کو زیادہ جانتا ہوں کیونکہ وہ ہمارے گھر میں ہی نازل ہوا ہے" حضرت علیؓ بولے "ہاں تم سچ کہتے ہو، لیکن القرآن حمّال ذو وجوہ (قرآن میں اجمال کی وجہ سے) مختلف معانی کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ تم بھی کہتے رہوگے اور وہ بھی کہتے رہیں گے، فیصلہ کچھ نہ ہوگا۔ اس لئے سنن سے استدلال کرنا، وہ اس سے بچ کر کہیں نہیں جاسکیں گے" چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے خوارج سے سنت کی روشنی میں مناظرہ کیا تو وہ لاجواب ہوگئے۔

دین کا مدار قرآن و سنت دونوں پر ہے

جیسا کہ ہم ابھی ضمناً اشارہ کرچکے ہیں۔ دراصل دینِ الٰہی کا مکمل نقشہ قرآن و سنت کے امتزاج ہی سے سامنے آسکتا ہے۔ قرآن بطریق متن اور سنت بطور تفسیر و تشریح ہے۔ اور تشریعِ احکام کا مبنیٰ دونوں ہیں۔ چنانچہ صحابہ کرام و تابعین عظام بھی یہی سمجھتے تھے۔ اور ان دونوں پر ہی دین کا مدار رکھتے تھے۔ میمون بن مہرانؒ سے ایک روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس کوئی خصومت لے کر آتا تھا تو آپ قرآن میں اس کے لئے حکم تلاش کرتے تھے اگر اس میں نہ ملتا تو سنت میں تلاش کرتے اور اگر اس میں بھی انھیں کوئی حکم دستیاب نہیں ہوتا تھا تو لوگوں کو جمع کرکے وہ مسئلہ پیش کرتے اور ان سے پوچھتے کہ آپ کو اس مسئلہ کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ یاد ہے یا نہیں؟ وہ لوگ جواب اثبات میں دیتے تو آپ فرماتے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۲) علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں۔ وهذا آثار فی هذا المعنی حملها العلماء علی تاویل القرآن بالرأی مع طرح السنن یعنی اس مضمون کے اور بہت سے آثار ہیں جن کا محمل علماء سلف کے یہاں یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی کے معنی سنن کو پس پشت ڈال کر اپنی رائے سے بیان کرنا۔

الحمد للہ الذی جعل فینا تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے ہم میں دین کی
من یحفظ علینا دیننا حفاظت کرنیوالے پیدا کئے اور انھیں باقی رکھا۔

جابر بن زیدؒ کہتے ہیں ایک مرتبہ طواف میں حضرت ابن عمرؓ ملے فرمانے لگے "ابوالشعثا، تم فقہاء بصرہ میں سے ہو، بجز قرآن ناطق اور سنت صحیحہ کے کسی اور چیز سے فتویٰ نہ دینا۔ اگر تم نے ان سے تجاوز کیا تو خود بھی ہلاک ہوگے اور دوسروں کو بھی ہلاک کروگے۔"

اسی طرح ابوسلمہؒ بصرہ میں تشریف لائے اور حسن بصریؒ ان سے ملنے آئے تو آپ نے حضرت حسنؒ سے فرمایا "مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہو، خبردار کبھی ایسا نہ کرنا جب تک تمہارے پاس مسئلہ مستفتی بہ سے متعلق کوئی سنت یا قرآنی آیت نہ ہو۔"

سعید بن المسیبؒ نے ایک شخص کو دیکھا کہ دو رکعتوں کے بعد بھی کچھ اور رکعتیں پڑھ رہا ہے اس شخص نے نماز سے فارغ ہو کر پوچھا "ابو محمد! کیا خدا مجھ کو اس نماز پر عذاب دے گا؟" فرمایا "نماز پر نہیں بلکہ سنت کا خلاف کرنے پر" سعید بن جبیرؒ فرماتے تھے "کوئی قول بغیر عمل کے اور کوئی قول و عمل بغیر نیت کے مقبول نہیں ہوتا اور قول و عمل اور نیت اس وقت تک مقبول نہیں ہوتے جب تک وہ سنت کے موافق نہ ہوں۔" حضرت حسن بصریؒ سے بھی اسی قسم کا ایک مقولہ مروی ہے۔

بہرحال اس طرح کے سینکڑوں آثار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سلف صالحین نے دینِ قیم کی ہدایتوں کا مرکز قرآن و سنت دونوں کو ہی سمجھا اور اس بنا پر جس طرح انھوں نے قرآن کی حفاظت اپنی جان فروشانہ قربانیوں سے کی اور اس کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لئے خون کے آخری قطرہ سے بھی دریغ نہیں کیا۵ ٹھیک اسی طرح انھوں نے سنتِ رسول اللہ

---

۵ مشہور و معروف عربی داں فاضل ڈاکٹر اسپرنگر نے الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ کے دیباچہ میں لکھا ہے "نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔"

Marfat.com

صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حرزِ جان بنا کر رکھا اور اس کی حفاظت میں انسانی کوشش وسعی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ فرمایا کرتے تھے "اگر میری گردن پر تلوار رکھدی جائے اور مجھکو یہ معلوم ہو کہ قتل ہونے سے پہلے ایک کلمہ بھی جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے لوگوں تک پہنچا سکتا ہوں تو میں اس امانت کو دوسروں تک ضرور پہنچا دوں گا"

حضرت ابوہریرہؓ نے رات کے تین حصے کر رکھے تھے، ایک میں سوتے تھے اور ایک حصہ عبادت وتلاوتِ قرآن میں بسر کرتے تھے اور ایک حصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث یاد کرتے تھے۔ آج جبکہ بنا بنایا مکمل دین آپ کے پاس ہے آپ کو انکارِ حدیث کی جسارت ہوتی ہے لیکن اس وقت کا تصور کیجیے جبکہ آپ کے پاس ایک حدیث بھی نہ ہوتی اور صرف قرآن مجید ہوتا تو کیا اس وقت بھی یہ دینِ برحق اپنی اس صورت میں آپ کو نظر آسکتا تھا؟

حدیث کی تشریعی حیثیت اور اُس سے غرض

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہم نے حدیث کی تشریعی حیثیت کا بار بار ذکر کیا ہے اور اس کو آیات بینات سے ثابت کر چکے ہیں لیکن یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ تشریع کے باب میں قرآن وحدیث دونوں ایک پلہ کے نہیں ہیں۔ قرآن قطعی الثبوت ہے اور حدیث ظنی پھر دونوں قوت وحکم کے اعتبار سے یکساں کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اس بنا پر اگر کوئی حدیث قرآن مجید کے کسی قطعی حکم کے خلاف ہو تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ سند والفاظِ حدیث کے لحاظ سے اس میں متعدد احتمالات ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کو اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول اور وما اٰتٰکم الرسول فخذوہ دیکھکر یہ شبہ ہو گیا ہے کہ قرآن کی طرح سنت بھی تشریع میں مستقل حیثیت رکھتی ہے یہ خیال درست نہیں کیونکہ قرآن مجید نے ہی خود اس کی بھی تصریح کی ہے کہ

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے
اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی	بلکہ وہ نازل شدہ وحی ہوتی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل وحی (قرآن) ہے اور نطق نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام

Marfat.com

اس سے نکلی ہوئی فرع، اس بنا پر لامحالہ نطقِ گرامی وحی متلو کے مطابق ہو گا۔ بالفرض اگر دونوں میں مطابقت کی کوئی صورت نہ ہو تو حدیث کو ترک کرنا پڑے گا۔ لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے بلکہ اس وجہ سے کہ قرآن کے ایک حکم ظاہرالدلالۃ سے متعارض ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس قول کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب ہی نادرست ہے۔

پس سنت کی تشریع سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی طرح اس باب میں مستقل حیثیت رکھتی ہے بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ سنت وحی الٰہی کے لئے بمنزلہ بیان اور تفصیل کے ہے اگر کسی صحیح الثبوت سنت سے کوئی ایسا حکم ملے جس کے متعلق قرآن میں سکوت ہو یا اس کے کسی ایک ہی پہلو کو بیان کیا گیا ہو، یا اس حکم کے بیان میں کسی قسم کا کوئی اشکال و خفارہ گیا ہو تو قرآن و سنت دونوں کو ملا کر ایک حکمِ مفصل کا استنباط کیا جائے گا اور اس وقت قرآن کی حیثیت متن کی اور سنت کی حیثیت شرح کی ہو گی۔ اب ہم ذیل میں اس کی چند مثالیں لکھتے ہیں تاکہ تشریع بالسنت کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

۱۔ قرآن میں صرف نماز کا حکم ہے لیکن رکعات کی تعداد نہیں بتائی گئی۔ سنت نے ان کو بیان کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص مغرب میں دو، فجر میں تین، ظہر، عصر اور عشاء میں پانچ پانچ یا دو دو اور تین تین رکعتیں پڑھے گا تو اس کی نماز بالکل نہیں ہو گی اور وہ نہ صرف سنت کا مخالف کہا جائیگا بلکہ قرآن کا بھی۔

۲۔ قرآن نے صرف اتنا بتایا ہے کہ نکاح حلال ہے اور زنا حرام، لیکن نکاح مشروع کے علاوہ نکاح غیر مشروع کون کون سے ہیں۔ قرآن میں ان کا تفصیلی ذکر موجود نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں ہے۔

ایما امراۃ نکحت بغیر اذن ولیھا	جس عورت نے بغیر اجازت ولی کے نکاح کر لیا
فنکاحھا باطل۔ [1]	اس کا نکاح باطل ہے۔

[1] ترمذی شریف باب ما جاء لا نکاح الا بولی۔

Marfat.com

یہاں اس سے بحث نہیں کہ عورت سے باکرہ ثیبہ دونوں مراد ہیں یا ایک اور ولی کون ہے اور ولایت کا مبنیٰ خیار بلوغ پر ہے یا بکارت پر۔ کہنا یہ ہے کہ آپ اس حدیث کو نظر انداز نہیں کر سکتے قرآن مجید نے نکاح کو اجمالاً بیان کیا ہے۔ احادیثِ صحیحہ میں نکاح کے جو شرائطِ صحت وغیرہ تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں ان کو قرآن کے ساتھ ملا کر ایک مکمل قانونِ نکاح تیار کرنا ہوگا۔

۳۔ قرآن میں صرف ربوا کی حرمت کا ذکر ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ ربوا سے مراد کیا ہے؟ اور اس کی حرمت کا مدار کس چیز پر ہے؟ حدیث نے اس سوال کا جواب دیا ارشادِ نبوی ہے

الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ	بیچو سونے کو سونے کے بدلہ میں، چاندی کو چاندی کے
والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر	گیہوں کو گیہوں کے، جَو کو جَو کے، کھجور کو کھجور کے
بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثلٍ سواءً	اور نمک کو نمک کے بدلہ میں جنس بجنس برابر سرابر
بسواءٍ یداً بیدٍ او الفضل ربوا[1]	دست بدست اور زیادتی ربوا ہے۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ قرآن مجید میں جو لفظ ربوا آیا ہے اس سے مراد کیا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ حدیث سے بھی پوری تفصیل اس لئے سمجھ میں نہیں آتی کہ اس میں حرمتِ ربوا کے منشا کی جزوی طور پر تعیین نہیں کی گئی یہی وجہ ہے کہ ائمہ مجتہدین نے اپنے اپنے اجتہاد کی روشنی میں علتِ حرمت کی تشخیص فرمائی یعنی الفاظِ حدیث میں اس کی تصریح نہیں کہ حرمت ربوا کا مدار جنسیت اور تفاضل دونوں پر ہے یا صرف ایک پر یا از قسم مکیلات و موزونات ہونے پر، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے تشریف لے گئے اور ہم پر ربوا کی حقیقت مکمل طور پر واضح نہیں ہوئی" تاہم غور کیجئے اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو کیا آپ محض الفاظِ قرآنی سے ربوا کی حقیقت کسی درجہ میں بھی سمجھ سکتے؟ یقیناً نہیں۔ پس ربوا کے متعلق جو احکام وضع کیے جائیں گے ان کے لئے قرآن کو اصل اور حدیث کو اس کا بیان قرار دے کر کیے جائیں گے۔

۴۔ قرآن مجید میں دو بہنوں کو نکاح میں بیک وقت جمع کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے

---

[1] صحیح مسلم و دیگر کتب صحاح (باب الربوا)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اس تحریم کی وجہ یہ ہے کہ:۔

دو بہنوں کو نکاح میں جمع کر دینے سے قطع صلۂ رحم لازم آجاتا ہے جو اللہ کے نزدیک انتہائی مبغوض اور قبیح چیز ہے اس کے علاوہ بھانجی اور خالہ، بھتیجی اور پھوپی ان دونوں کو اگر نکاح میں جمع کیا جائے تو اس سے بھی قطع رحم لازم آتا ہے اس بنا پر آپ نے ان کو نکاح میں جمع کرنے کی حرمت کا بھی اعلان فرمادیا۔ آپ کے اس فرمان کو معاذ اللہ حکم قرآن کے خلاف نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اس کی تعبیر یوں کی جائے گی کہ قرآن مجید نے جمع بین الاختین کا ذکر کرکے صرف حکم حرمت کی علت کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس سے مقصد یہ نہیں ہے کہ حرمت جمع کا حکم صرف ایک ہی صورت تک محدود رکھا جائے اس لئے آپ کو بحیثیت شارع اسلام ہونے کے اس کا حق ہے ہے کہ قرآن کی اس اصل کی روشنی میں دو بہنوں کے علاوہ بھانجی اور خالہ، بھتیجی اور پھوپی کو ایک نکاح میں جمع کرنے کی حرمت کا بھی اعلان فرمادیں۔

ان چند مثالوں سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ ہم حدیث کی تشریعی حیثیت سے کیا مراد لیتے ہیں یعنی جب ہم کسی چیز کے متعلق احکام وضع کرنا چاہتے ہیں تو قرآن مجید کو اصل قرار دے کر احادیث کا تتبع کرتے ہیں اور پھر دونوں کی تطبیق سے مسائل کا استنباط کرتے ہیں نہ یہ کہ سنت کو مستقل تشریعی حیثیت حاصل ہے اور قرآن مجید سے قطع نظر کرکے صرف سنت سے استخراج احکام کیا جا سکتا ہے علامہ ابو اسحاق الشاطبی متوفی ۷۹۰ھ نے "الموافقات" کی جلد چہارم میں صفحہ ۱۲ سے صفحہ ۳۰ تک اس پر مفصل بحث کی ہے کہ سنت کو کتاب اللہ سے منطبق کرنے کی کتنی صورتیں ہیں اور اس ذیل میں مختلف مذاہب بیان کئے ہیں اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:۔

"سنت میں جو معانی اور احکام تفصیلیہ پائے جاتے ہیں وہ سب قرآن مجید میں موجود ہیں لیکن وہ صرف ان ہی لوگوں کو معلوم ہو سکتے ہیں جو قرآن میں تفقہ تام رکھتے ہوں اور اس میں تدبر کرتے ہوں اگرچہ وہی معانی اور احکام سنت میں زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ملیں گے۔"

Marfat.com

تدوینِ حدیث

گذشتہ بحث سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ قرآن مجید کے فہم میں حدیث سے مدد لینا ناگزیر ہے، اب ہم تدوین اور صحت حدیث پر ایک تاریخی نظر ڈالکر بتانا چاہتے ہیں کہ روایت اسناد اور درایت کے لحاظ سے حدیث کا مرتبہ کس قدر بلند ہے تاکہ منکرین حدیث کو اپنے دلائل پر غور کرنے کا موقع ملے۔

عہدِ نبوت اور تدوینِ حدیث

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں حدیث لکھنے کا اتنا اہتمام نہیں کیا گیا جتنا کہ قرآن مجید کے لکھنے کا کیا گیا بلکہ بعض احادیث سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کتابتِ حدیث کی ممانعت کر رکھی تھی۔

حضرت ابوسعید الخدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لاتکتبوا عنی ومن کتب عنی	تم میری احادیث نہ لکھو اور جو شخص قرآن کے علاوہ
غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا	میری حدیثیں لکھتا ہو اس کو چاہئے کہ انھیں مٹا دے
عنی فلا حرج ومن کذب	ہاں میری حدیث بیان کرو اس میں کچھ حرج نہیں
علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ	ہے اور جو شخص قصداً مجھ پر جھوٹ باندھے اس کو
من النار۔ (صحیح مسلم)	اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لینا چاہیئے

اسی کے ساتھ بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض خاص خاص ارشادات نبوی تھے جنھیں آپ نے خود قلمبند کرایا یا کسی نے انھیں خود قلمبند کرنا چاہا تو آپ نے اس کی ممانعت نہیں فرمائی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ خزاعہ کے آدمیوں نے فتح مکہ کے سال

Marfat.com

بنولیث کے کئی ایک آدمی اپنے ایک مقتول کے بدلہ میں قتل کر دیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ اپنی سواری پر سوار ہوئے اور حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا۔

"اللہ نے مکہ میں قتل کرنے کی ممانعت کر دی ہے اور مکہ پر رسول اللہ اور مومنین مسلط کر دیئے گئے ہیں۔ یہ نہ مجھ سے قبل کسی کے لئے حلال تھا اور نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال ہے۔ ہاں! یہ دن میں صرف ایک ساعت کے لئے حلال تھا لیکن اب اس وقت قتل و قتال حرام ہے نہ تو یہاں کا کانٹا کاٹا جا سکتا ہے اور نہ یہاں کے کسی درخت کو قطع کیا جا سکتا ہے اور نہ یہاں کوئی پڑی ہوئی چیز اٹھائی جا سکتی ہے۔ صرف وہ اٹھا سکتا ہے جس کی چیز گم ہو گئی ہو اور وہ اسے ڈھونڈھنے نکلا ہو۔ اور جس شخص کا کوئی آدمی قتل کر دیا گیا ہو اس کو اختیار ہے چاہے مقتول کے بدلہ میں دیت لے یا قصاص"۔

اتنے میں ایک یمنی شخص آیا اور اس نے عرض کیا "یا رسول اللہ میں لکھ لوں (یعنی آپ کا یہ خطبہ) آپ نے فرمایا "ابو فلاں" کے لئے لکھ دو۔[1]

محدثین نے ان دونوں روایتوں میں تطبیق اس طرح پیدا کی ہے کہ آپ نے جس زمانہ میں کتابتِ حدیث کی ممانعت فرمائی تھی وہ نزولِ وحی کا زمانہ تھا۔ اگر قرآن مجید کی طرح حدیث کی کتابت کا بھی اہتمام کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ دونوں میں التباس واقع ہو جائے۔ پھر جب التباس کا اندیشہ جاتا رہا تو آپ نے لکھنے کی اجازت دیدی۔ بہر حال یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں آپ کے اقوال و افعال کو قلمبند کرنے کا عام اہتمام نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی وفات کے بعد صحابہ کرام کے پاس بجز قرآن کے کوئی دوسرا صحیفہ نہیں تھا۔ کسی ضرورت کے وقت اگر وہ کوئی حدیث بیان بھی کرتے تھے تو اپنے حافظہ سے بیان کرتے تھے۔

---

[1] بخاری کتاب الدیات باب من قتل ۱۲۔

Marfat.com

حافظ ذہبی نے حاکم سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ جس میں پانچسو احادیث تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک شب حضرت عائشہؓ نے انھیں دیکھا کہ کرب واضطراب سے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ انھیں اس سے رنج ہوا پوچھا "آپ کو کوئی تکلیف ہے؟" صبح ہوئی تو فرمایا "بیٹی! احادیث کا جو مجموعہ تمہارے پاس ہے ذرا لانا" حضرت عائشہؓ نے اس کو پیش کیا۔ آپ نے آگ منگا کر اسے جلا ڈالا۔ وجہ پوچھی گئی تو فرمایا "میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مرجاؤں اور یہ مجموعہ میرے پاس ہو۔ اور اس میں ایسے شخص کی احادیث بھی ہوں جس کو میں نے ثقہ سمجھا ہو اور وہ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہ ہوں تو اس کی نقل کی ذمہ داری مجھ پر ہی ہوگی۔ لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ خود حافظ ذہبی اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں فھذا لا یصح یہ روایت صحیح نہیں ہے[1]۔

بعض خاص صحیفے

بخاری کی ایک روایت سے صرف حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیث کی کتابت کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ جو کثرتِ روایت میں مشہور تھے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بجز عبداللہ بن عمرؓ کے مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا وہ احادیث قلمبند کرتے تھے اور میں ان کو زبانی یاد رکھتا تھا[2]۔

بعض حفاظ نے لکھا ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے علم الفرائض میں کوئی کتاب لکھی تھی[3]۔ لیکن اصل یہ ہے کہ عہدِ صحابہ میں جن صحیفوں کا ذکر ملتا ہے وہ زیادہ تر زکوٰۃ وغیرہ کے خاص خاص احکام سے متعلق تھے ورنہ پہلی صدی ہجری کے ختم تک نہ باقاعدہ تدوینِ حدیث کی طرف توجہ کی گئی اور نہ کہیں اس کا اہتمام کیا گیا۔ ابوجحیفہ کی روایت ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ حضرت علیؓ سے دریافت کیا۔

هل عندكم كتاب — کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ١ ص ٥ [2] بخاری باب کتابت العلم [3] توجیہ النظر الی اصول الاثر ص ٨۔

فرمایا "لا الا کتاب اللہ او فہم اُعطیہٗ نہیں صرف کتاب اللہ ہے یا وہ سمجھ جو کسی
رجل مسلم او ما فی ہذہ الصحیفۃ مسلمان کو عطا کی گئی ہو یا وہ جو اس صحیفہ میں ہے
ابو جحیفہ نے پوچھا "اس میں کیا ہے؟" بولے
العقل وفکاک الاسیر یعنی دیت کے اور قیدی کو رہا کرانے کے احکام اور ایک یہ حکم کہ کوئی
ولا یقتل مسلم بکافر[۵۱] مسلمان کسی کافر کے قصاص میں قتل نہ کیا جائے۔
غرضکہ پہلی صدی ہجری تک یہی حال رہا[۵۲]۔

تحریک تدوینِ حدیث جب عمر بن عبد العزیزؒ سریر آرائے خلافت ہوئے اور آپ نے دیکھا کہ جن بزرگوں کے سینوں میں اقوال و افعال نبویؐ کا ذخیرہ موجود ہے یکے بعد دیگرے اٹھتے چلے جا رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والی نسلیں ان سرچشمہائے سعادت سے بالکل محروم رہ جائیں تو آپ نے ابوبکر بن محمد بن عمر بن حزم کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث اور سنت آپ کو ملے اس کو لکھ لیجئے میں ڈرتا ہوں کہ کہیں علم مٹ نہ جائے اور علما فنا نہ ہو جائیں۔ اور آپس میں مجالست کرو تاکہ جو شخص نہیں جانتا وہ بھی جان جائے[۵۳]"۔

ابوبکر بن محمد انصارِ مدینہ میں سے تھے۔ سلیمان بن عبد الملک اور عمر بن عبد العزیزؒ کی طرف سے مدینہ کے گورنر تھے۔ ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ۹۹ھ سے رجب ۱۰۱ھ تک خلیفہ رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تدوینِ حدیث کی تحریک ۱۰۰ھ کے لگ بھگ شروع ہو گئی تھی۔ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے حکم سے ابنِ شہاب زہری اور بعض او

---

[۵۱] بخاری باب کتابت العلم [۵۲] ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے دوسرے اجلاس منعقدہ لاہور میں ڈاکٹر زبیر صدیقی کلکتہ یونیورسٹی نے "تدوینِ حدیث عہدِ نبوت میں" کے عنوان سے انگریزی زبان میں ایک نہایت محققانہ اور قابل قدر مضمون پڑھا تھا جو ادارہ کی رپورٹ میں شائع ہو چکا ہے اس میں موصوف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ درحقیقت تدوینِ احکام کا کام سرکار رسالتمآبؐ کے عہد میں ہی شروع ہو گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ہم پورے مضمون کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے۔ موصوف جن کو مجموعہ ہائے احادیث کہتے ہیں وہ دراصل صحف تھے جن میں بعض خاص خاص احکام درج تھے۔ [۵۳] بخاری کتاب العلم کیف یقبض العلم۔

Marfat.com

محدثینِ عصر نے حدیث کے مجموعے مرتب کئے تھے۔

درسِ حدیث دوسری صدی ہجری کے نصفِ اول کے ہوتے ہوتے درسِ حدیث کا عام چرچا ہوگیا۔ مدینہ، بصرہ، کوفہ، شام میں اس کے مستقل مراکز قائم تھے۔ جنھوں نے حضرت عکرمہ مولیٰ ابن عباس، نافع مولیٰ ابن عمر، سعید بن جبیر، مجاہد بن جبیر۔ طاؤس بن کیسان، شہاب الدین زہری امام نخعی وغیرہ ایسے ائمہ حدیث و اربابِ علم و فضل پیدا کئے۔

عہدِ بنی عباس میں تدوینِ حدیث کا آغاز بنو عباس کے عہدِ حکومت میں جب علم و فن کا چرچا عام ہوا اور علوم و فنون کی تدوین شروع ہوئی تو اب علماء اسلام نے سب سے پہلے مختلف شہروں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور آپ کی سیرتِ مقدسہ مدون کرنے کی طرف توجہ مبذول کی۔ چنانچہ مکہ میں ابنِ جریج المتوفی ۱۵۰ھ نے مدینہ میں محمد بن اسحاق (۱۵۱ھ) اور امام مالک بن انس (۱۷۹ھ) نے بصرہ میں، ربیع بن صبیح (۱۶۰ھ) سعید بن عروبہ (۱۵۶ھ) اور حماد بن سلمہ (۱۷۶ھ) نے کوفہ میں سفیان الثوریؒ (۱۶۱ھ) نے شام میں امام اوزاعی (۱۵۶ھ) نے یمن میں معمر (۱۵۳ھ) نے۔ خراسان میں عبداللہ بن المبارک (۱۸۱ھ) نے اور مصر میں لیث بن سعد (۱۷۵ھ) نے الگ الگ مجموعہائے حدیث مدون کئے۔ ابنِ جریج کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوگئی تھی اس لئے غالب یہ ہے کہ اس کارِ خیر میں سبقت کا سہرا انھیں کے سر[1] ہوگا۔

ان ائمہ حدیث نے یہ مجموعے اس جذبہ کے ماتحت مرتب کئے تھے کہ علماء کرام فنا ہورہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ علم بھی بالکل فنا ہوجائے۔ اس لئے انھوں نے ان کتب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے ساتھ صحابہ کرام کے اقوال اور تابعین کے فتاوے بھی شامل کردیئے۔ ان مجموعوں میں سے آج کل صرف مؤطا امام مالک پایا جاتا ہے جس کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ جامعینِ حدیث نے اقوالِ صحابہ کی حفاظت میں بھی وہی اہتمام کیا جو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی

۱؎ ضحی الاسلام ج ۲ ص ۱۰۷۔

Marfat.com

تدوین وحفاظت میں کیا تھا۔

دوسری صدی ہجری کے ختم پر بعض ائمہ کو خیال ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو اقوالِ صحابہ اور فتاویٰ تابعین سے الگ کر کے ایک علیحدہ مجموعہ میں محفوظ کر دینا چاہئے چنانچہ اس مقصد کے پیشِ نظر متعدد علماء نے مسانید لکھیں جن میں مشہور یہ ہیں۔ عبید اللہ بن موسیٰ العبیسی الکوفی، مسدد بن مسرھد البصری۔ اسد بن موسیٰ الاموی۔ نعیم بن حماد الخزاعی نزیل مصر۔ ان کے نقش قدم پر دوسرے علماء اعلام بھی چلے اور انھوں نے بھی مسانید لکھیں۔ اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبلؒ اسحٰق بن راھویہ اور عثمان بن ابی شیبہ[۱] کے اسماءِ گرامی زیادہ نمایاں ہیں۔

کتب حدیث کی ترتیب میں اختلاف

سب سے پہلے حدیث کے جو مجموعے مرتب ہوئے ان کی ترتیب ابواب فقہ کے مطابق رکھی گئی تھی۔ مثلاً کتاب الطہارۃ لکھکر ایک عنوان مقرر کر دیا، اور پھر طہارت سے متعلق جتنی احادیث تھیں ان سب کو اس باب میں یکجا کر دیا۔ اس کے برخلاف بعض علماء نے احادیث کی تدوین رواۃ کے ناموں سے کی۔ مثلاً ابوہریرہ سے جتنی روایتیں منقول ہیں وہ طہارت سے متعلق ہوں یا صوم سے سب کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ پہلی قسم کی کتبِ حدیث کو علماءِ فن کی اصطلاح میں کتاب السنن اور دوسری قسم کی کتب کو مسند کہتے ہیں ان کے علاوہ بعض علماء تھے جنھوں نے احادیث کو سنن اور مسانید دونوں کے طریقوں پر جمع کیا ان علماء میں ابوبکر بن ابی شیبہ کا نام زیادہ مشہور ہے[۲]۔

کتبِ حدیث میں فرقِ مراتب

پچاس سال کی مدت میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ سب مرتبہ کے لحاظ سے برابر نہیں ہو سکتی تھیں کیونکہ بعض جامعینِ حدیث کو ایسے مواقع میسر تھے کہ وہ صحت کے متعلق خوب جانچ پڑتال کر سکتے تھے اور پھر ان کا جو سلسلۂ اسناد تھا وہ سب سے زیادہ قوی اور معتبر تھا ان کے برخلاف دوسرے علماء وہ تھے جنھوں نے کچھ زیادہ تنقید سے کام نہیں لیا اور صحیح وسقیم میں فرق کئے بغیر احادیث قلمبند کر دیں۔

---

[۱] مقدمہ فتح الباری ص ۴۔ [۲] ایضاً

Marfat.com

حافظ ابنِ حجر امام بخاری کے عہد سے پہلے کی کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں :۔

"امام بخاریؒ نے جب ان سب تصانیف کو دیکھا۔ ان سے سیراب ہوئے اور ان کی خوشبو سونگھی تو انھوں نے دیکھا کہ وضع کے ماتحت ان میں صحیح احادیث بھی ہیں اور سقیم بھی بلکہ اکثر مجموعے ایسے تھے جن میں ضعیف حدیثیں موجود تھیں۔ یہ دیکھکر انھوں نے عزم کرلیا کہ وہ صحیح احادیث کو غیر صحیح احادیث سے الگ کرکے ایک مجموعہ میں شامل کردیں گے۔"[1]

تنقید احادیث | تیسری صدی ہجری کا زمانہ تدوینِ حدیث کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اس زمانہ میں حدیث کی سب سے زیادہ اہم کتابیں تالیف ہوئیں۔ تنقیدِ رُواۃ کے اصول متعین ہوئے۔ جرح وتعدیل کے اسباب مقرر کئے گئے اور اب تک جس طرح متنِ حدیث کے یاد کرنے، پرکھنے اور اس کو سمجھنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ اسانید کو محفوظ رکھنے اور ان کی صحت وسقم کی تحقیق وتفتیش کا بھی اہتمام ہونے لگا اور علم اسماء الرجال کے نام سے ایک مستقل علم کی بنیاد پڑی۔ اس عہد میں امام بخاری المتوفی ۲۵۶ھ نے الجامع الصحیح، امام مسلم المتوفی ۲۶۱ھ نے اپنی صحیح مرتب کی۔ اور ابن ماجہ المتوفی ۲۷۳ھ اور ابوداؤد المتوفی ۲۷۵ھ نے اپنی اپنی سنن۔ امام ترمذی المتوفی ۲۷۹ھ نے اپنی جامع اور امام نسائی المتوفی ۳۰۳ھ نے اپنی سنن کو مرتب کیا۔ یہ چھ کتابیں حدیث کی سب سے زیادہ مستند اور صحیح کتابیں سمجھی جاتی ہیں، اور ان کو "صحاح ستہ" کہتے ہیں۔

فنِ تنقیدِ حدیث واسناد کیوں ایجاد کیا گیا۔ اس کی بنیاد روایت ودرایت کے کن اصول پر ہے؟ اور اس فن نے صحت واعتبارِ حدیث کا پایہ کتنا بلند کردیا؟ ان سب باتوں کو معلوم کرنے کے لئے پہلے "وضعِ حدیث" کی مختصر روئداد سن لینی چاہئے تاکہ محدثینِ کرام کی کوششوں کی پوری قدر ہوسکے۔

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص ۴۔

وضعِ حدیث کا فتنہ اور اس کا انسداد

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام و تابعینِ عظام کے عہد میں احادیث کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی جو کچھ حدیثیں تھیں زبانوں پر تھیں اور اسی طرح ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ اس تقریب سے منافقوں اور دشمنانِ اسلام کو احادیث وضع کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں میں اختلاط و ارتباط پیدا کر کے احادیثِ موضوعہ کی نشر و اشاعت شروع کی اور اس طرح اسلام کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ ابنِ عدی کہتے ہیں "عبد الکریم بن ابی العوجاء کو قتل کرنے کے لئے لیجایا گیا تو اس نے کہا "میں نے چار ہزار احادیث جن میں حرمت و حلت کے احکام ہیں وضع کر کے لوگوں میں پھیلا دی ہیں[۱]"۔

وضاعینِ حدیث کے مختلف طبقے

علامہ سیوطیؒ نے ابنِ جوزی سے نقل کیا ہے کہ جن لوگوں کی احادیث میں جھوٹ، وضع اور قلب پایا جاتا ہے ان کی چند قسمیں ہیں بعض وہ لوگ ہیں جن پر زہد غالب تھا وہ احادیث کی حفاظت نہیں کر سکے یا ان کی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ یحییٰ بن سعید القطان سے روایت ہے "کہ میں نے جھوٹ اس جماعت سے زیادہ کسی میں نہیں پایا جو اپنے تئیں خیر اور زہد کی طرف منسوب کرتی ہے۔"[۲]

بعض وہ لوگ تھے جو اگرچہ ثقہ تھے لیکن ان کی عقلوں میں فتور آ گیا تھا اور وہ پھر بھی روایتِ حدیث سے باز نہیں آتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنھوں نے کوئی غلط روایت نقل کر دی، بعد میں انھیں اپنی غلطی کا علم بھی ہو گیا لیکن از راہِ سخن پروری انھوں نے رجوع نہیں کیا۔ ان

---

[۱] تذکرۃ الموضوعات ص ۷ [۲] مقدمہ صحیح مسلم۔

مختلف لوگوں کے علاوہ ایک زندیقوں کا طبقہ تھا جو قصداً شریعت کو برباد کرنے اور اسلام میں فتنہ وشر کا دروازہ کھولنے کی غرض سے احادیث وضع کرتا تھا۔ ان زنادقہ میں کچھ لوگ ایسے جری بھی تھے جو موقع پاکر اپنے شیخ کی کتاب اٹھا لیتے اور اس میں من گھڑت حدیثیں بھی شامل کر دیتے تھے، کچھ لوگ ایسے تھے جو کسی خاص عقیدہ وخیال کے پابند تھے اور اس کو لوگوں میں مقبول بنانے کے لئے احادیث وضع کرتے تھے۔ ابن لہیعہ فرماتے ہیں" مجھ سے ایک خارجی العقیدہ شیخ نے کہا جس نے آخر میں توبہ کرلی تھی کہ ہم جب کسی امر کا ارادہ کرتے تھے تو فوراً اس کے لئے ایک حدیث وضع کر لیتے تھے"۔ حماد بن سلمۃ فرماتے ہیں "میں نے ایک رافضی سے سنا وہ کہتا تھا کہ جب ہم کسی چیز کو اچھا سمجھتے تھے تو اس کے لئے ایک حدیث وضع کر لیتے تھے۔ محمد بن القاسم الطالکانی فرقہ مرجیہ کا سردار تھا۔ اپنے عقیدہ کے مطابق کثرت سے احادیث وضع کرتا تھا۔ ان کے سوا کچھ وہ لوگ تھے جو ترغیب وترہیب کے لئے وضع حدیث کو جائز سمجھتے تھے اور وہ ایسا کرتے بھی تھے[1]۔

اسباب وضعِ حدیث وضع حدیث کے اسباب مختلف تھے۔ اجمالاً انھیں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) سیاسی جھگڑے:۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلاف کی وجہ سے خوارج اور شیعہ کے جو دو فرقے پیدا ہو گئے تھے ان کو اپنے اپنے عقیدہ میں اتنا غلو تھا کہ حضرت علیؓ اور معاویہؓ کی شان میں بے تکلف احادیث وضع کرتے اور من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار کی وعید کی ذرا پرواہ نہیں کرتے تھے۔ پھر بنو امیہ اور بنو عباس میں جو مستقل سیاسی رقابت قائم ہو گئی تھی اس نے اس چنگاری کو ہوا دیکر دہکتی ہوئی آگ بنا دیا۔ اسی قبیل میں وہ احادیث شامل ہیں جو عربی عصبیت اور عجمی خود پرستی کی کشمکش کے باعث اختراع کی گئیں۔

(۲) دوسری صدی کے وسط میں کلامی اور فقہی مسائل کا زور ہوا تو اپنی وجاہتِ علمی کو نمایاں کرنے کے لئے بعض لوگوں نے قصداً احادیث وضع کیں اور چونکہ مسلمان ہر مسئلہ کا ثبوت

---

[1] اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ ج ۲ ص ۴۶۸ - ۴۶۹۔

قرآن وحدیث سے چاہتے تھے اس لئے بعض وضاعین نے اپنے نظریہ کی تائید کے لئے جان بوجھکر حدیثیں وضع کیں اور ان کا عام چرچا کیا۔

(۳) شخصی حکومت کے استبداد کی وجہ سے بعض لوگ ایسی محکومانہ ذہنیت رکھتے تھے کہ بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے سرکار دو عالم پر تہمت طرازی سے بھی باز نہیں آتے تھے۔

غیاث بن ابراہیم کے متعلق مشہور روایت ہے کہ وہ ایک مرتبہ مہدی بن منصور کے پاس آیا مہدی کو کبوتر بازی کا بہت شوق تھا۔ غیاث نے یہ دیکھتے ہی اس کو خوش کرنے کے لئے حدیث وضع کردی لا سبق الا فی خف او حافر او جناح۔ مہدی نے اس وقت تو خوش ہو کر غیاث کو دس ہزار درہم دلا دیئے۔ لیکن جب وہ جانے لگا تو مہدی نے کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ تیری گدی اس شخص کی سی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط احادیث منسوب کرتا ہو، رسول اللہؐ نے او جناح نہیں فرمایا ہے تو نے ہم سے تقرب حاصل کرنے کے لئے اس لفظ کا اضافہ کر دیا ہے۔[۱]

غرض یہ ہے کہ یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے دشمنانِ اسلام نے احادیثِ موضوعہ کا انبار لگا دیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ان وضاعین کی نامراد کوششوں کی وجہ سے حدیث کا تمام ذخیرہ ناقابلِ اعتبار و استناد قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا ان فتنہ پردازوں کی سرکوبی کے لئے ائمہ دین اور علماءِ اسلام نے جو عدیم النظیر کوششیں کی ہیں وہ سب بے کار و بے فائدہ رہیں؟ کیا یہ صحیح ہے کہ ان دجاجلۂ امت کا جادو چل گیا اور اب ہم اس قابل نہیں ہیں کہ کسی ارشاد نبوی پر بھروسہ کر سکیں؟ کیا یہ درست ہے کہ وضع و کذب کے دریا میں حقانیت و صداقت کے چند قطرے ایسے رَل مِل گئے ہیں کہ اب ان کا کہیں سراغ نہیں لگ سکتا؟ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید نے جس ذاتِ گرامی کو خود اسوۂ حسنہ کہا تھا۔ ان افترا پرداز انسانوں کی ملعون حرکات کے باعث اس کے اقوال و افعال اب ایسے تاریک پردوں میں مستور ہو گئے ہیں کہ ہم ان سے کوئی

---

[۱] شرح مسلم الثبوت جز ۲ ص ۱۵۲ و نخبۃ الفکر۔

روشنی حاصل کرکے اپنے ظلمت کدۂ حیات کو روشن نہیں کرسکتے۔ یہ جو قرآن نے لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کا اعلان کرکے ہم کو اسوۂ نبوی کی پیروی کی دعوت دی تھی یہ سراسر بے کار ہی رہی ؟۔

عہدِ صحابہ میں عدم کتابتِ حدیث کی وجوہ

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ہم کو پہلے ان روایات و آثار پر ایک نظر ڈالنی چاہئے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام احادیث کے ساتھ کتنا اعتنا کرتے تھے۔ اور ان کو کس طرح حرز جان بنا کر رکھتے تھے۔ اس قسم کی روایات پہلے گذر چکی ہیں یہاں ان کے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں البتہ اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحابہ کو احادیث کا اتنا اہتمام تھا تو انھوں نے احادیث کی کتابت کیوں نہیں کی ؟ اور کسی نے ایسا کرنا چاہا تو اسے اس کی اجازت کیوں نہیں ملی ؟

جواب یہ ہے کہ فرطِ احتیاط کے باعث صحابہ سمجھتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ان کو لکھیں اور کوئی شخص ان میں کمی بیشی کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کا غلط انتساب کردے تو اس کی ذمہ داری لکھنے والے پر عائد ہوگی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اجلّہ صحابہؓ چاہتے تھے کہ قرآن و حدیث میں مرتبہ کے اعتبار سے فرق باقی رہے۔ کتب میں مدوّن ہوجانے کے باعث ایسا نہ ہو کہ لوگ قرآن کو بھول جائیں اور اپنی تمام توجہ حدیث پر مبذول کردیں۔ روایات و آثار سے ان دونوں باتوں کی تائید ثابت ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ خطبہ میں ارشاد فرمایا۔

"ہر وہ شخص جس نے کچھ احادیث لکھ رکھی ہوں میں اس کو قسم دیتا ہوں کہ ان سے رجوع کرلے اور انھیں مٹا دے۔"

پھر فرمایا

فانما ھلک الناس حیث یتبعوا احادیث علماءھم وترکوا کتاب ربھم۔ — لوگوں نے جب کبھی اپنے علماء کی باتوں کا اتباع کیا اور اپنے رب کی کتاب چھوڑ دی ہلاک ہوگئے۔

(اس روایت میں" احادیث علماءھم" کے الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں

Marfat.com

حضرت ابو سعید خدری ؓ سے کسی نے کہا کہ "آپ جو احادیث نقل کرتے ہیں کیا ہم ان کی کتابت نہ کریں؟" فرمایا "ہم تم کو کتابت نہیں کرائیں گے تم ہم سے روایات اسی طرح بیان کرو جس طرح ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں۔"

قرنِ اول میں کتابتِ حدیث سے اجتناب، حدیث سے بے اعتنائی پر نہیں بلکہ روایتِ حدیث میں کمال احتیاط پر مبنی تھا۔ علامہ قرطبی ؒ نے امام مالک ؒ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

لم یکن القوم یکتبون انما کانوا	لوگ پہلے لکھتے نہیں تھے۔ صرف یاد رکھتے
یحفظون۔ فمن کتب منھم الشئ	تھے۔ ان میں سے اگر کوئی۔۔ کچھ لکھتا بھی تھا
فانما کان یکتبہ لیحفظہ فاذا	تو صرف یاد کرنے کے لئے لکھتا تھا۔ یاد ہو جانے
حفظہ محاہ۔ [1]	کے بعد اسے مٹا ڈالتا تھا۔

اس مقام پر ایک اور روایت کا نقل کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے عدمِ کتابتِ حدیث کے وجوہ واسباب پر کامل روشنی پڑتی ہے۔

عبدالرحمٰن بن الاسود اپنے والد سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں "ایک مرتبہ مجھے اور حضرت علقمہ کو کہیں سے ایک صحیفہ مل گیا۔ ہم دونوں اسے لیکر غروب آفتاب کے وقت حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کے پاس گئے اور دروازہ پر بیٹھ گئے۔ حضرت ابنِ مسعود ؓ نے جاریہ سے فرمایا دیکھنا دروازہ پر کون ہے؟ جاریہ بولی علقمہ اور اسود۔ حضرت ابنِ مسعود ؓ نے ہم کو اجازت دیدی، گھر میں داخل ہو کر ہم نے وہ صحیفہ دکھایا اور کہا کہ یہ حدیث حسن ہے۔ حضرت عبداللہ نے جاریہ کو طشت میں بھر کر پانی لانے کا حکم دیا۔ جاریہ نے حکم کی تعمیل کی۔ آپ نے فوراً پانی سے بدستِ خود اس صحیفہ کو مٹانا شروع کر دیا اور نحن نقص علیك احسن القصص پڑھنے لگے۔ ہم نے کہا ذرا اس کو تو دیکھ لیجئے اس میں ایک عجیب حدیث ہے۔ لیکن حضرت عبداللہ ابنِ مسعود ؓ

---

[1] یہ سب روایتیں میں نے جامع بیان العلم وفضلہ ج ا ص ۶۴ سے لی ہیں۔

پھر بھی نہ مانے اور اس صحیفہ کو مٹاتے ہی رہے اور فرمایا۔

ان ھذہ القلوب اوعیۃ فاشغلوھا یہ دل برتن ہیں۔ ان کو تم قرآن مجید سے پُر کرو

بالقرآن ولا تشغلوھا بغیرہ اور اس کو دوسری چیز سے مت بھرو۔

ابو عبید جو اس قصہ کے ایک راوی ہیں اور سند میں مذکور بھی ہیں کہتے ہیں " معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیفہ اہلِ کتاب سے لیا گیا تھا اس لئے حضرت ابنِ مسعودؓ نے اس کو دیکھنا بھی مکروہ سمجھا[۱]"

غرض یہ ہے کہ یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر عہدِ صحابہ میں ایک طرف کتابت و تدوینِ حدیث نہیں ہوئی اور دوسری طرف انھوں نے احادیث کے قبول کرنے اور ان کی جانچ پڑتال کرنے میں کافی اہتمام کرنا شروع کر دیا تاکہ احادیثِ صحیحہ غیر صحیحہ سے متمایز ہو جائیں۔

قبولِ حدیث میں صحابہ کی احتیاط

حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں " جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ نہیں باندھا جاتا تھا۔ ہم احادیث قبول کرتے تھے لیکن جب لوگ اس طرح کی باتیں کرنے لگے تو ہم نے آپ سے روایت کرنا ترک کر دیا" ایک اور حدیث اس سے بھی زیادہ واضح ہے۔ بشیر العدوی کہتے ہیں " میں ایک مرتبہ حضرت ابنِ عباسؓ کے پاس آیا اور ان کے سامنے روایت بیان کرنے لگا۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ نے اس پر کوئی توجہ نہیں کی۔ میں نے کہا " ابنِ عباس! میں دیکھتا ہوں کہ آپ میری حدیث نہیں سنتے" فرمایا ایک زمانہ تھا کہ جب کوئی شخص ہمارے سامنے قال رسول اللہ کہتا تو ہماری نگاہیں فوراً اس کی طرف اٹھ جاتیں اور ہم بڑی توجہ سے وہ روایت سنتے تھے لیکن اب جبکہ لوگوں نے خلط ملط کر دیا ہے ہم ان سے صرف وہی روایتیں قبول کرتے ہیں جنھیں ہم جانتے ہیں[۲]"۔

اس احتیاط کی وجہ سے اگر کوئی صحابی ان میں سے کسی کے پاس کوئی کتاب لاتا تو وہ اس میں جتنے حصہ کو صحیح سمجھتے رہنے دیتے اور باقی کو قلم زد کر دیتے۔

---

[۱] جامع بیان العلم وفضلہ ج ۱ ص ۶۶ [۲] صحیح مسلم باب النہی عن الروایۃ عن الضعفاء۔

سفیان بن عینیہ سے روایت ہے کہ "ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص ایک کتاب لایا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوئی فیصلہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے تھوڑے سے حصہ کو رہنے دیا اور باقی کو مٹا دیا" [۵۱]

بے تحقیق روایت پر وعید | کسی روایت کو سننے کے بعد اس کو اگر بیان کرنا چاہتے تو پہلے اس کی خوب چھان بین کر لیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی

کفیٰ بالمرء کذبا ان یحدث	ایک آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے
بکل ما سمع۔ [۵۲]	کہ وہ ہر اس چیز کو بیان کردے جو سنے۔

ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی۔

سیکون فی اٰخر امتی اناس یحدثونکم	آخر امت میں ایسے لوگ آئیں گے جو تم سے حدیثیں
مالم تسمعوا انتم ولا اٰبائکم	بیان کریں گے جن کو نہ تم نے سنا ہوگا اور نہ تمہارے
فایاکم وایاھم [۵۳]	آباء نے تم ان سے بچتے رہنا۔

حضرت عبد اللہ فرماتے تھے۔

ان الشیطان لیتمثل فی صورۃ	شیطان مرد کی صورت میں متمثل ہو کر ایک۔
الرجل فیأتی القوم فیحدثھم	جماعت کے پاس آئیگا اور ان سے جھوٹ حدیث
بالحدیث من الکذب فیتفرقون	بیان کریگا جس کی وجہ سے وہ لوگ متفرق ہوجائیں
فیقول الرجل منھم سمعت	گے اور ان میں کا ایک شخص کہے گا کہ میں نے یہ حدیث
رجلا اعرف وجھہ ولا ادری	ایسے شخص سے سنی ہے جس کا چہرہ میں پہچانتا ہوں
ما اسمہ یحدث [۵۴]	لیکن اس کا نام نہیں جانتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ صحتِ حدیث کی تحقیق میں بہت اہتمام کرتے تھے۔

---

[۵۱] صحیح مسلم باب الروایۃ عن الضعفاء۔ [۵۲] ایضاً۔ [۵۳] صحیح مسلم باب النہی عن الروایۃ عن الضعفاء [۵۴] صحیح مسلم باب الروایۃ عن الضعفاء۔

Marfat.com

جب تک انھیں راوی سے پورا تعارف نہ ہوتا وہ کسی حدیث کو یوں ہی قبول نہ کرتے تھے۔

کثرتِ روایت سے اجتناب جو لوگ کثرت سے روایت کرتے تھے صحابہ کرام انھیں اچھا نہیں سمجھتے تھے کیونکہ ایسے حضرات سے کسی روایت کے باب میں غیر محتاط رہنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

طاہر جزائری لکھتے ہیں۔

اذ الاکثار مظنۃ للخطأ والخطاء	کیونکہ کثرت روایت سے خطا کا احتمال ہوتا ہے
فی الحدیث عظیم الخطر [۱]	اور حدیث میں خطا بڑے خطرہ کا سبب ہوتی ہے۔

حضرت ابوہریرۃ کثیر الروایۃ صحابی تھے حضرت عمرؓ نے ان پر سختی کی کہ وہ کثرت سے روایت نہ کیا کریں تو حضرت ابوہریرہ نے بہ طور معذرت فرمایا:۔

ان الناس یقولون اکثر ابو ھریرۃ	لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ کثرت سے روایت کرتا ہے
ولولا آیتان فی کتاب اللہ ما حدثت	اگر قرآن مجید میں دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی حدیث
حدیثا ثم یتلو ان الذین یکتمون	روایت نہ کرتا۔ اس کے بعد آپ آیت ان الذین
ما انزلنا من البینات الی قولہ الرحیم	یکتمون الایہ پڑھتے پھر فرماتے ہمارے بھائی
ان اخواننا من المھاجرین کان	مہاجرین بازار کے لین دین میں لگے رہتے تھے،
یشغلھم الصفق بالاسواق	اور ہمارے بھائی انصار اپنے مالی معاملات میں
وان اخواننا من الانصار کان	مصروف رہتے تھے ان کے برخلاف ابوہریرہ
یشغلھم العمل فی اموالھم و	پُرشکم ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
ان اباھریرۃ کان یلزم رسول اللہ	کے ساتھ رہتا تھا اور جبکہ انصار و مہاجرین
صلی اللہ علیہ وسلم بشبع بطنہ	نہ ہوتے تھے ابوہریرہ ہوتا تھا اور جسے وہ یاد
ویحضر ما لا یحضرون ویحفظ	نہیں کرتے تھے ابوہریرہ یاد کرتا تھا۔
ما لا یحفظون۔ [۲]	

[۱] توجیہ النظر الفصل الثالث [۲] صحیح بخاری باب حفظ العلم۔

اس احتیاط کی وجہ سے جلیل القدر صحابہ کی ایک جماعت تھی جو بہت کم روایت کرتی تھی ان میں حضرت ابوبکرؓ، زبیرؓ، ابوعبیدہ، عباس بن عبدالمطلب رضوان اللہ علیہم اجمعین زیادہ مشہور ہیں اور بعض بعض صحابی تو وہ تھے جو روایت ہی نہیں کرتے تھے مثلاً سعید بن زید بن عمرو بن نفیل۔ حضرت عمرؓ خود بھی روایت کم کرتے تھے اور دوسروں کو بھی قلتِ روایت کی تاکید کرتے تھے۔ مسلمانوں کا ایک لشکر عراق کی طرف روانہ ہوا تو حضرت عمرؓ نے انھیں خطاب کرکے ارشاد فرمایا:۔

جوّدوا القرآن واقلّوا الروایۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قرآن خوب اچھی طرح پڑھو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کم کرو۔[۵۱]

بلکہ بعض اوقات تو غلط احادیث کی اشاعت کے خوف سے روایتِ حدیث کی ہی ممانعت کردیتے تھے چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کرکے فرمایا "تم عہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں بیان کرتے ہو جن میں خود مختلف ہوتے ہو، تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ اس سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے۔ پس رسول اللہؐ کی حدیث بیان مت کیا کرو، اور تم سے کوئی بات دریافت کی جائے تو کہو" ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے اس کے ہی حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھو"۔ [۵۲]

حدیث پر شہادت پھر ان کے سامنے کوئی معروف ثقہ شخص بھی حدیث بیان کرتا تو اسے بغیر شہادت کے قبول نہیں کرتے تھے۔ شہادت کے بعد اس حدیث کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت قطعی ہوجاتا تو اس پر سختی کے ساتھ عامل ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس ایک عورت آئی اور عرض کیا کہ فلاں شخص جس کا انتقال ہوگیا ہے میرا نواسہ تھا اور میں اس کی نانی ہوں متوفی کی میراث سے مجھ کو حصہ دلادیجیے" آپ نے

---

۵۱ جامع بیان العلم وفضلہ ابن عبدالبر ۵۲ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳

عہ (نوٹ) یہ یاد رکھنا ضروری ہے جیسا کہ حافظ ذہبی نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد خود تصریح کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی مراد روایت حدیث کو سرے سے روکنا نہیں ہے بلکہ اس میں حتی الوسع احتیاط سے کام لینے کی تلقین کرنا ہے چنانچہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو کسی راوی کی دیانت و ثقاہت کا یقین ہوجاتا تھا تو آپ [illegible] اور اس پر عمل کرتے تھے اس سلسلہ میں [illegible]۔

فرمایا" تیرے متعلق نہ تو کتاب اللہ میں کچھ ہے اور نہ سنت میں ہونے کا مجھکو علم ہے، لوگوں سے دریافت کروں گا پھر بتاؤں گا، آپ نے پوچھا تو حضرت مغیرہ بن شعبہ نے فرمایا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سامنے نانی کو چھٹا حصہ دلایا ہے" حضرت ابوبکرؓ بولے" تمہارا کوئی شاہد بھی ہے؟ محمد بن مسلمہ نے شہادت دی کہ" ہاں میرے سامنے رسول اللہؐ نے نانی کو چھٹا حصہ دلایا ہے" خلیفہ اول نے یہ سُنکر اس عورت کو بھی سدس دلا دیا۔[۱]

صحیح بخاری و مسلم میں ابو سعید الخدریؓ سے روایت ہے ہم ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ابو موسیٰ گھبرائے ہوئے آئے، لوگوں نے اس گھبراہٹ کا سبب پوچھا بولے" میں حضرت عمرؓ کی دعوت پر ان کے مکان پر حاضر ہوا تھا۔ دروازہ پر تین مرتبہ دستک دی جواب نہیں ملا تو واپس چلا آیا۔ اس واقعہ کے بعد ایک ملاقات میں حضرت عمرؓ نے پوچھا تم فلاں دن آئے نہیں؟ میں نے پورا قصہ نقل کر دیا اور ساتھ ہی کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے" تم میں سے کوئی شخص کسی کے مکان پر جاکر تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اس کو جواب نہ ملے تو اسے واپس آجانا چاہیے حضرت عمرؓ یہ سن کر بولے" اس حدیث پر اپنا کوئی گواہ لیکر آؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا" اہل مجلس نے کہا" ہم میں سب سے چھوٹا اس کی شہادت دیگا۔ چنانچہ میں (ابو سعید الخدری) اُٹھا اور حضرت عمرؓ کے روبرو حاضر ہوکر شہادت پیش کی۔ خلیفہ ثانی بولے" ابو موسیٰ! میں تم کو متہم نہیں کرتا (نا قابل اعتبار نہیں سمجھتا) لیکن یہ معاملہ حدیث کا تھا اس لئے گواہ کی ضرورت تھی۔[۲]

مسور بن مخرمہ کا بیان ہے" ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ایک ساقط بچہ کے بارہ میں مشورہ کیا۔ مغیرہ بولے" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لونڈی سے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا" اگر تم سچے ہو تو اس پر شہادت پیش کرو" محمد بن مسلم بولے میں شہادت دیتا ہوں کہ بیشک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فیصلہ کیا تھا"۔[۳]

ایک واقعہ اس سے بھی زیادہ صریح ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ مسجد کی توسیع کے لئے

---

[۱] مستدرک حاکم و ابوداؤد باب میراث الجدہ [۲] صحیح بخاری باب التسلیم والاستیذان ثلاثا [۳] ابوداؤد باب دیۃ الجنین

Marfat.com

حضرت عباسؓ سے زمین طلب کی انھوں نے انکار کردیا اور حدیث بیان کی کہ آپ زیادتی نہیں کرسکتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "اس پر گواہ پیش کیجئے ورنہ اچھا نہیں ہوگا" حضرت عباسؓ نے ایک جماعتِ انصار سے اس کا ذکر کیا۔ حضرت عمرؓ کے سامنے ان لوگوں نے تصدیق کی کہ ہاں یہ حدیث صحیح ہے خلیفۂ دوم نے یہ سُنکر فرمایا۔

انی لم اتھمک ولکنی احببت	میں آپ کو ناقابل اعتبار نہیں جانتا لیکن
ان اتثبت [۵۱]	چاہتا تھا کہ تصدیق کرلوں۔

حضرت علیؓ کا بھی معمول تھا کہ ان کے سامنے کوئی شخص حدیث روایت کرتا تو آپ اس سے قسم لیتے تھے۔ [۵۲]

قبولِ حدیث کے معاملہ میں یوں تو تمام صحابہ اور خصوصاً حضرت ابنِ عباسؓ، ابن عمرؓ عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ سبھی محتاط تھے لیکن اولیت کا سہرا خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ کے سر ہے۔ چنانچہ علامہ ذہبی فرماتے ہیں۔

وکان اول من احتاط	حضرت ابوبکرؓ قبول اخبار میں سب سے پہلے
فی قبول الاخبار	احتیاط کرنے والے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے متعدد حدیثوں پر شہادت طلب کرکے تثبت فی النقل کی سنت جاری کردی اور لوگوں کو یہ بتادیا کہ ایک حدیث کو دو ثقہ راوی بیان کریں تو وہ قوی ہو جاتی ہے۔

امام ذہبی حضرت عمرؓ کے حالات میں فرماتے ہیں۔

وھوالذی سن للمحدثین	حضرت عمرؓ ہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے محدثین کے لئے
التثبت فی النقل۔	تثبت فی النقل کی سنت جاری کی۔

پھر حضرت ابوموسیٰؓ والا مندرجہ بالا واقعہ نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں

احب عمر ان یتاکد عندہ	حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ ابوموسیٰ کی حدیث

---

[۵۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۔ [۵۲] ایضاً ج ۱ ذکر حضرت علیؓ

خبر ابی موسیٰ بقول صاحبٍ آخر ففی ھذا دلیل علیٰ ان الخبر اذا رواہ ثقتان کان اقوی و ارجح مما انفرد بہ واحد وفی ذلك حضٌ علیٰ تکثیر طرق الحدیث لکی یرتقی عن درجۃ الظن الیٰ درجۃ العلم اذ الواحد یجوز علیہ النسیان والوھم ولا یکاد یجوز ذالك علیٰ ثقتین لم یخالفھما احد۔[1]

کسی دوسرے شخص کی شہادت سے موکد ہو جائے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کسی خبر کو دو ثقہ آدمی بیان کریں تو وہ حدیث منفرد کی بہ نسبت زیادہ قوی اور قابلِ ترجیح ہو جاتی ہے اور حضرت عمرؓ نے ایسا کر کے طرقِ حدیث کی کثرت پر بھی لوگوں کو برانگیختہ کیا ہے تاکہ وہ درجۂ ظن سے نکل کر درجۂ علم کی طرف آجائے کیونکہ واحد کے متعلق تو یہ احتمال رہتا ہے کہ اس پر بھول اور وہم طاری ہو گیا ہو لیکن دو ثقہ جن کی کسی نے مخالفت کی ہو ان کی نسبت ایسا احتمال نہیں ہو سکتا۔

امام ذہبی کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی اس احتیاط پسندی اور تشدد نے محدثین کے لئے شمع ہدایت کا کام کیا یعنی ان کے طرزِ عمل سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کوئی حدیث کس وقت قبول کرنی چاہیئے اور اس کا معیار کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں جو حدیثیں رائج تھیں صحابہ کرام ان کو بے تکلف قبول کر لیتے تھے حضرت معاویہؓ فرماتے تھے۔

علیکم من الحدیث بما کان فی عھد عمر فانہ کان قد اخاف الناس فی الحدیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[2]

حضرت عمرؓ کے عہد میں جو احادیث رائج تھیں تم ان کو مضبوط پکڑ لو کیونکہ انھوں نے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث روایت کرنے سے ڈرایا تھا۔

طلبِ حدیث کیلئے سفر

صحابہ کرامؓ جس طرح بے تحقیق روایت وحدیث کے قبول کرنے سے اجتناب کرتے تھے ان کو اگر معلوم ہوتا کہ کسی دور دراز مقام پر کسی ثقہ کے پاس کوئی حدیث ہے

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۶، ۷۔ [2] ایضاً ج ۱ ص ۷۔

تو اس کو حاصل کرنے کیلئے سفر کے دشوار گذار مرحلوں کو بھی طے کرتے تھے۔ حضرت جابر بن عبد اللہؓ کو معلوم ہوا کہ شام میں (ایک مہینہ کی مسافت پر) عبد اللہ بن انیس کے پاس ایک حدیث ہے انھوں نے اس کو حاصل کرنے کے لئے ایک اونٹ خریدا اور خدا کا نام لیکر روانہ ہو گئے۔ ایک مہینہ کی مسافت طے کرنے کے بعد منزلِ مقصود پر پہنچے۔ عبد اللہ بن انیس کے مکان پر دستک دی وہ باہر آئے تو انھوں نے گلے لگا لیا آنے کی وجہ دریافت کی بولے "میں نے سنا تھا کہ آپ کے پاس سرکار رسالتمآبؐ کی ایک حدیث ہے، مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس حدیث کو سُنے بغیر ہی مر جاؤں" پھر وہ حدیث حاصل کی۔[۱]

حدیث بیان کرتے وقت دہشت اور خوف

روایتِ حدیث میں صحابۂ کرام کی غایتِ احتیاط و تقویٰ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان میں بعض کا حال یہ تھا کہ صحیح طور پر قال رسول اللہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ ابو عمرو الشیبانی کہتے ہیں کہ میں حضرت ابنِ مسعودؓ کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا وہ خوف کے مارے قال رسول اللہ نہیں کہہ سکتے تھے اور اگر کہتے بھی تھے تو ان پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور کہتے تھے رسول اللہؐ نے "اس طرح فرمایا" یا "ایسا ہی فرمایا" یا "تقریباً ایسا ہی فرمایا" یا۔ یا۔ یا[۲]

ان آثار و روایات سے جن کا تاریخی اعتبار بہر حال مسلّم ہے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

(۱) صحابۂ کرام روایت و قبولِ حدیث کے معاملہ میں حد درجہ احتیاط پسند تھے۔

(۲) وضّاعین و کذابین کا طبقہ ان کے عہد میمنت مہد میں ہی پیدا ہو گیا تھا۔

(۳) ان لوگوں کے فتنہ و شر سے بچنے اور صحیح احادیث کو محفوظ رکھنے کے لئے صحابۂ کرام نے قبولِ حدیث کے لئے ایک خاص معیار قائم کر لیا تھا کہ جو حدیث اس پر پوری اترتی تھی اس کو بے تکلف قبول کرتے اور اس پر عمل پیرا ہوتے تھے۔

۱؎ امام بخاریؒ نے اس روایت کو بتمام و کمال ادب المفرد میں اور امام احمد اور ابو یعلیٰ نے اپنے اپنے مسند میں نقل کیا ہے۔ اور امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں بھی باب فی طلب العلم کے ترجمہ میں اس کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے۔ ۲؎ تذکرۃ الحفاظ تذکرۂ حضرتؓ ابن مسعودؓ العالم الربانی۔

Marfat.com

(۴) صحابۂ کرام کی ان احتیاط پسندیوں کے باعث صحیح و غیر صحیح احادیث میں ایک خطِ امتیاز کھنچ گیا اور وضّاعین و کذابین کے تمام منصوبے پادرہوا ثابت ہوئے۔

کثرت سے روایت کرنے والے صحابہ

یہ معلوم ہوچکا ہے کہ روایتِ حدیث میں تمام صحابہ برابر نہیں تھے بعض روایت کم کرتے تھے اور بعض زیادہ جنھوں نے روایات کثرت سے نقل کی ہیں ان میں حسب ذیل بزرگانِ امت نمایاں شہرت رکھتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ۔ حضرت عائشہؓ ام المومنین۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ عبداللہ بن عباسؓ۔ جابرؓ۔ انس بن مالکؓ۔ حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات کی تعداد ۵۳۷۴ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں کی تعداد ۲۲۱۰ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور انس بن مالکؓ کی روایتوں کی تعداد بھی قریب قریب حضرت عائشہؓ کے برابر ہے حضرت جابر بن عبداللہ الانصاری کی حدیثیں ۱۵۰۰ سے متجاوز نہیں ہیں۔ حضرت عمرؓ روایت کے معاملہ میں بے انتہا احتیاط پسند تھے آپ کی روایات ۵۳۷ سے زیادہ نہیں ہیں۔

مستشرقین یورپ جو اسلام پر اعتراض کرنے کے لئے ایک ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتے ہیں انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ پر ان کی کثرتِ روایت کی وجہ سے بہت لے دے کی ہے اور بعض دریدہ دہنوں نے تو ان دونوں بزرگوں کی شان میں گستاخانہ الفاظ بک دینے سے بھی احتراز نہیں کیا۔ تعجب یہ ہے کہ مصر اور ہندوستان کے بعض ارباب علم تک ان سے متاثر ہوگئے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان کے متعلق بھی ایک اجمالی گفتگو کرلی جائے۔

Marfat.com

حضرت ابوہریرہؓ

حضرت ابوہریرہؓ کا اصلی وطن یمن تھا۔ قبیلہ دوس سے تعلق رکھتے تھے۔ جاہلیت میں نام عبد شمس تھا مسلمان ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا نام عبد الرحمٰن رکھدیا تھا۔ والد کا نام صخر تھا[1]۔ ابوہریرہ کنیت تھی، ہریرہ عربی زبان میں چھوٹی بلی کو کہتے ہیں۔ اس کنیت کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ "میں اپنے گھر والوں کی بکریاں چراتا تھا۔ میرے پاس ایک بلی تھی اُسے میں رات کے وقت ایک درخت میں رکھدیتا تھا۔ اور دن کو اسے اپنے ساتھ چراگاہ لیجاتا جہاں میں اس سے کھیلتا رہتا تھا اس بنا پر لوگ مجھے ابو ہریرہ کہنے لگے[2]"

اسلام اور جستجوئے علم سنہ ۷ھ میں بمقام خیبر اپنے قبیلہ کی ایک جماعت کے ساتھ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر دولتِ اسلام سے بہرہ اندوز ہوئے۔ آپ کو علم کی بڑی جستجو تھی۔ ہر وقت اسی دھن میں مصروف رہتے تھے اور اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کرنے میں بھی بڑے جری اور بے باک واقع ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کسی نے بطور شکایت کہا کہ ابوہریرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کثرت سے روایت کرتے ہیں" فرمایا "پناہ بخدا ان کی روایات میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ کرنا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ سرکار رسالتمآب سے سوال کرنے میں بہت جری تھے اور اسی لئے ایسے ایسے سوالات کرتے تھے جن کو ہم لوگ پوچھ بھی نہیں سکتے تھے[3]"

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۰۷۔ [2] ترمذی مناقب ابوہریرہ رضہ
[3] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۰۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کی اس جستجوئے علمی اور ذوق تحقیق و تلاش کا اعتراف تھا چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے سیدِ کونین ؐ سے دریافت کیا "قیامت کے دن کون خوش نصیب آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق ہوگا" ارشادِ گرامی ہوا "تمہاری حرص علی الحدیث دیکھ کر مجھ کو پہلے سے خیال تھا کہ یہ سوال تم سے پہلے کوئی دوسرا نہیں کرے گا"[۵۱]

حضرت ابوہریرہؓ کیلئے دعاءِ نبوی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوہریرہؓ کے ذوق علم کی اس درجہ قدر کرتے تھے کہ ان کے علم کی پختگی اور حافظہ کی قوت کے لئے دعائیں فرماتے تھے۔ زید بن ثابتؓ بیان کرتے ہیں "ایک دن میں اور ابوہریرہ اور ایک اور شخص مسجد میں بیٹھے ذکرِ خدا و دعا میں مشغول تھے۔ اتنے میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ ہم لوگ خاموش ہوگئے۔ آپ نے فرمایا "اپنا شغل جاری رکھو" یہ سن کر میں اور وہ دوسرا شخص دعائیں کرنے لگے جن پر آپ آمین کہتے جاتے تھے" ہمارے بعد ابوہریرہ نے دعا کی "خدایا جو کچھ میرے ساتھی مجھ سے قبل مانگ چکے ہیں وہ مجھے عطا فرما اور اس کے علاوہ ایسا علم بھی عنایت کر جس کو میں کبھی فراموش نہ کروں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بھی آمین کہی۔ اب ہم دونوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ہم کو بھی ایسا علم عطا کیا جائے جو فراموش نہ ہو۔ ارشاد حق بنیاد ہوا" وہ دوسی نوجوان (ابوہریرہ) کے حصہ میں آچکا"[۵۲] ایک مرتبہ انھوں نے بارگاہِ رسالتؐ میں ضعفِ حافظہ کی شکایت کی، آپ نے فرمایا "چادر پھیلاؤ" انھوں نے چادر پھیلا دی۔ آپ نے اس میں دونوں دستِ مبارک ڈالے۔ پھر فرمایا "اسے سینہ سے لگالو" ابوہریرہؓ کہتے ہیں "اس کے بعد میں پھر کبھی نہیں بھولا"[۵۳]

---

۵۱ صحیح البخاری باب الحرص علی الحدیث - ۵۲ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۶

۵۳ صحیح بخاری باب حفظ العلم۔

Marfat.com

جلالتِ علم | حضرت ابوہریرہؓ کے ذوق و شوق، محنت و جستجو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شفقت و دعا، کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علمِ حدیث کے سب سے بڑے حافظ بن گئے اس کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کو "علم کا ظرف" فرمایا[1]۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو خود بھی صحابہ میں بڑے پایہ کے محدث ہیں۔ بیان کرتے ہیں کہ "ابوہریرہؓ ہم سب میں اعلم بالحدیث تھے"[2]۔

حافظ ذہبیؒ جو تنقیدِ رواۃ میں مرتبہ بلند رکھتے ہیں فرماتے ہیں "ابوہریرہؓ علم کا ظرف تھے اور صاحبِ فتویٰ ائمہ کی جماعت میں اونچا مقام رکھتے تھے"[3]۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں "ابوہریرہ اپنے ہمعصر راویوں میں سب سے بڑے حافظ تھے اور تمام صحابہ میں کسی نے حدیث کا اتنا ذخیرہ فراہم نہیں کیا"[4]۔

امام شافعیؒ کی رائے تھی کہ ابوہریرہؓ ہمعصر حفاظ حدیث میں سب سے بڑے حافظِ حدیث تھے

روایات | حضرت ابوہریرہؓ نے جو روایتیں بیان کی ہیں ان کی مجموعی تعداد ۵۳۷۴ ہے۔ ان میں ۳۲۵ متفق علیہ ہیں ۷۹ میں امام بخاری اور ۹۳ میں امام مسلم منفرد ہیں[5]۔

حضرت ابوہریرہؓ کی کثرتِ روایت پر بعض لوگوں نے شک و شبہ کا اظہار کیا ہی لیکن ہمیں غور کرنا چاہئے کہ کیا محض اس بنا پر کہ وہ روایات کثرت سے بیان کرتے تھے ہم ان پر کسی قسم کا شک کر سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں ہم کو چند باتیں نظر انداز نہ کرنی چاہئیں۔

(۱) کثرتِ روایت کا سبب کیا تھا؟

(۲) اجلۂ صحابہ ان پر اعتماد کرتے تھے یا نہیں؟

(۳) ان کا حافظہ کیسا تھا؟

(۴) احادیث لکھتے تھے یا نہیں؟

---

[1] بخاری کتاب العلم [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۰ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸
[4] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۲۶۶ [5] تہذیب الکمال ص ۴۶۲۔

Marfat.com

(۵) نقلِ روایت میں ان کا عام انداز احتیاط پسندانہ تھا یا نہیں؟

(۶) جتنی کثیر روایتیں حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت و صحبت کی مدت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی تعداد عقلاً و عادۃً مستبعد ہے یا نہیں؟

اب ہم ان میں سے ہر ایک کے متعلق بالترتیب گفتگو کرتے ہیں۔

کثرتِ روایت کے اسباب

حضرت ابوہریرہؓ کو اللہ تعالیٰ نے جس قدر ذوقِ علم، شوقِ تحقیق و جستجو عطا فرمایا تھا۔ اسی قدر ان کو علم کی اشاعت و توسیع کا بھی بڑا شوق تھا، اور ان کی دلی آرزو تھی کہ اقوالِ نبوی کا جو گنجینۂ نایاب ان کے سینہ میں محفوظ ہے اس سے وہ دوسروں کو بھی فیضیاب کریں۔ ان کو اس کا نہ صرف ذاتی شوق تھا بلکہ قرآن مجید کی ایک آیت کے بحکم اشاعتِ علم کو وہ اپنا ایک مذہبی فریضہ جانتے تھے۔ لوگوں نے اسی زمانہ میں ان پر اعتراضات کئے تو انھوں نے خود فرمایا "اگر سورۂ بقرہ کی یہ آیت

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا	بے شبہ وہ لوگ جو ہماری نازل کی ہوئی کھلی ہوئی
مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْۢ بَعْدِ	نشانیوں کو اس کے بعد کہ ہم نے ان کو کتاب
مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ	میں لوگوں کے لئے بیان کر دیا ہے۔ چھپاتے
اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ	ہیں ان پر اللہ لعنت بھیجتا ہے اور لعنت بھیجنے
اللّٰعِنُوْنَ ۝	والے بھی لعنت بھیجتے ہیں۔

نہ ہوتی تو میں کبھی کوئی حدیث نہ بیان کرتا[۱]۔

ایک طرف اشاعتِ علم کا یہ جذبہ اور دوسری طرف ان کو مواقع ایسے میسر تھے جو کسی دوسرے کو نہیں تھے۔ وہ خود ہی بیان کرتے ہیں "لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ابوہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میرے مہاجر بھائی بازاروں میں اپنے کاروبار میں لگے رہتے تھے۔ اور انصار صاحبِ جائداد تھے وہ اس کے انتظامات میں مصروف

[۱] بخاری کتاب العلم۔

رہتے تھے۔ میں فارغ البال تھا۔ ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتا تھا جن اوقات میں وہ لوگ موجود نہیں ہوتے تھے۔ میں ان میں بھی حاضر رہتا تھا۔ اور دوسرے لوگ جن چیزوں کو فراموش کر دیتے تھے میں انھیں یاد رکھتا تھا۔[1]

ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے ان سے پوچھا "تم کیسی حدیثیں بیان کرتے ہو حالانکہ جو کچھ میں نے دیکھا (یعنی افعال نبوی) اور سنا (قول نبوی) وہی تم نے بھی سُنا اور دیکھا" بولے۔ "اماں! آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تطییب خاطر کے لئے زیبائش و آرائش میں مصروف رہتی تھیں اور مجھ کو خدا کی قسم کوئی چیز سرکار دو عالم سے غافل نہیں کر سکتی تھی"۔[2]

اجلۂ صحابہ ان پر اعتماد کرتے تھے

حضرت ابوہریرہ کی اس خصوصیت کو دوسرے اجلۂ صحابہ بھی تسلیم کرتے تھے اور ان کے مخصوص حالات کے باعث ان کی روایتوں پر اعتماد کرتے تھے

ابو عامر روایت کرتے ہیں "ایک مرتبہ میں حضرت طلحہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا "ابو محمد! ہم کو نہیں معلوم یہ یمنی (ابوہریرہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ جانتا ہے یا تم"، حضرت طلحہ نے فرمایا "اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ حدیثیں سنی ہیں جو ہم نے نہیں سنیں اور انھیں وہ چیز معلوم ہے جسے ہم نہیں جانتے ہم لوگ مالدار تھے۔ ہمارے اپنے گھر تھے بال بچے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صبح شام آتے اور چلے جاتے تھے۔ ابوہریرہ مسکین تھے ان کے پاس نہ مال تھا اور نہ ان کے متعلقین تھے۔ ان کا ہاتھ سرورِ کونینؐ کے ہاتھ میں تھا۔ جہاں سرکار جاتے تھے وہ بھی جاتے تھے۔ پھر مکرر فرمایا ہم اس میں شک نہیں کرتے کہ وہ ایسی چیزیں جانتے ہیں جو ہم نہیں جانتے۔ اور انھوں نے ایسی حدیثیں سنی ہیں جو ہم نے نہیں سنیں اور

ولم یتھمہ احد منا انہ تقول	ہم میں سے کسی نے ان کو اس کی تہمت نہیں لگائی
علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

[1] صحیح مسلم فضائل ابی ہریرہ و بخاری کتاب العلم [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۰۹۔

Marfat.com

ما لم یقل هذا حدیث صحیح	طرف کوئی قول ایسا منسوب کیا ہے جو آپ نے
الاسناد علی شرط الشیخین[1]	نہیں فرمایا۔

ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک حدیث بیان کی حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے وہاں سے گذرتے ہوئے اس کو سنا تو فرمایا "ابو ہریرہؓ! دیکھو تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا روایت کر رہے ہو، حضرت ابو ہریرہؓ فوراً کھڑے ہو گئے اور سیدھے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا آپ نے بھی یہ حدیث سنی ہے؟ فرمایا "ہاں! میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے، اس پر حضرت ابو ہریرہ بولے "ہم کو رسول اللہؐ سے نہ تو ازدواجی تعلق غافل رکھ سکتا تھا اور نہ بازاروں میں لین دین کرنا۔ میں آنحضرتؐ سے صرف دو چیزیں طلب کرتا تھا۔ کوئی کلمہ جس کی آپ مجھ کو تعلیم دیں یا ایک لقمہ جو آپ مجھ کو کھلائیں۔ ابن عمرؓ بولے

کنت الزمنا لرسول الله	اے ابو ہریرہ۔ آپ ہم سب سے زیادہ آنحضرت
صلے الله علیه وسلم واعلمنا	صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے والے اور آپ
بحدیثه[2]	کی احادیث کو جاننے والے تھے۔

ایک مرتبہ مروان کو حضرت ابو ہریرہ کی کوئی بات ناگوار ہوئی، اس نے غضبناک ہو کر کہا لوگ کہتے ہیں "ابو ہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ آنحضرتؐ کی وفات سے کچھ ہی دنوں پہلے مدینہ میں آئے تھے" فرمایا "میں جب مدینہ میں آیا تو حضرت خیبر میں تشریف رکھتے تھے۔ اس وقت میری عمر تیس سال سے کچھ اوپر تھی اور آپ کی وفات تک سایہ کی طرح آپ کے ساتھ رہا۔ آپ کے ساتھ ازواجِ مطہرات کے گھروں میں جاتا تھا آپ کی خدمت کرتا تھا۔ آپ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوتا تھا۔ آپ کے ہمراہ حج کرتا تھا۔ اس لئے میں دوسرے لوگوں سے زیادہ حدیثیں جانتا ہوں، خدا کی قسم وہ جماعت جو مجھ سے قبل آپ کی صحبت میں

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۱، ۵۱۲ [2] ایضاً ج ۳ ص ۵۱۱۔

تھی وہ بھی میری حاضر باشی کی معترف تھی اور مجھ سے حدیثیں پوچھتی تھی۔ ان میں حضرت عثمانؓ حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں[۱]۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ جن کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچکر قیام فرمایا تھا بڑے پایہ کے صحابی تھے لیکن اس کے باوصف وہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے تھے کسی نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا میں ابوہریرہ سے کوئی حدیث روایت کروں مجھکو یہ زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کروں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابوایوبؓ کو اپنے حافظہ پر اتنا اعتماد نہیں تھا جتنا حضرت ابوہریرہؓ کے حافظہ پر تھا۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں براہِ راست کسی حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کروں اور اس میں کچھ کمی بیشی ہو جائے۔

قوتِ حافظہ حضرت ابوہریرہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملازمت وقرب مسلسل کا جو شرف حاصل تھا اس پر ان کی قوتِ حافظہ نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حافظہ کی قوت کے لئے دعا کی تھی اس کا اثر یہ ہوا جیسا کہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جو حدیث سن لیتے تھے بھولتے نہیں تھے۔ لوگ مختلف طریقوں سے امتحان لیتے تھے اور بالآخر انھیں حضرت ابوہریرہؓ کی قوتِ حافظہ کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔

ایک مرتبہ مروان نے حضرت ابوہریرہؓ کو بلایا اور اپنے کاتب کو تخت کے نیچے بٹھا کر ان سے حدیثیں پوچھنی شروع کیں۔ ابوہریرہ بولتے جاتے تھے اور کاتب انھیں لکھتا جاتا تھا۔ (حضرت ابوہریرہ کو اس کی خبر بالکل نہیں تھی) ایک سال کے بعد مروان نے انھیں پھر طلب کیا اور اس نے وہی حدیثیں دریافت کیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے گذشتہ سال کی طرح

[۱] اصابہ ج ۷ ص ۲۰۵ [۲] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۲۔

Marfat.com

اس مرتبہ بھی بے کم وکاست بغیر زیادتی اور کمی کے وہ سب حدیثیں نقل کردیں یہاں تک کہ ترتیب میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔[1]

حدیث کی کتابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک تو غالباً حضرت ابوہریرہ رضؓ نے حدیث کی کتابت نہیں کی کیونکہ اول تو انھیں اس کی فرصت ہی نہیں ہوتی ہوگی اور پھر انھیں یہ امید تھی کہ جس کسی حدیث میں کچھ شک ہوگا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرکے اس کو رفع کرلیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد قوتِ حافظہ کے باوجود ازراہِ احتیاط انھوں نے حدیثیں قلمبند کرنی شروع کردی تھیں اور پھر وہ جب تک اپنی کتاب نہ دیکھ لیتے کسی روایت کی توثیق و تصدیق نہ کرتے تھے۔ چنانچہ فضل بن حسن اپنے والد حسن بن عمرو کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ کو ایک حدیث سنائی۔ انھوں نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ حسن بولے میں نے یہ حدیث آپ سے ہی سنی ہے۔ فرمایا اگر مجھ سے سنی ہے تو میرے پاس ضرور لکھی ہوگی۔ اس کے بعد ابوہریرہؓ حسن کو ساتھ لیکر گھر گئے اور ایک کتاب دکھائی جس میں تمام حدیثیں درج تھیں۔ اس میں وہ حدیث بھی تھی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اگر تم نے وہ حدیث مجھ سے سنی ہے تو ضرور میری کتاب میں ہوگی"۔[2]

احتیاط اس روایت سے ان کی احتیاط فی الروایت کا بھی علم ہوتا ہے کہ کسی حدیث پر یونہی حکم نہیں لگا دیتے تھے۔ بلکہ جب تک اس کی خوب تحقیق نہ کرلیتے نفیاً یا اثباتاً کچھ نہ فرماتے اس کے علاوہ ایک اور روایت ہے جس سے ان کی خشیتِ الٰہی اور حدیث رسول اللہ کے جذبۂ احترام کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مرتبہ شفیا اصبحی مدینہ آئے تو حضرت ابوہریرہ کو دیکھا کہ بیہوش پڑے ہوئے ہیں اور لوگ ان کے چاروں طرف جمع ہیں۔ یہ ان کے پاس جاکر بیٹھ گئے۔ جب ذرا ہوش آیا تو درخواست کی کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ایسی حدیث سنائیے

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۰ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۱۔

Marfat.com

جس کو خود آپ نے سنا اور سمجھا ہو۔ ابوہریرہ بولے "ہاں ایسی حدیث سناؤں گا۔ یہ کہا اور چیخ مار کر بیہوش ہو گئے۔ تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ ہوش میں آتے اور یہ کہکر کہ ہاں ایسی ہی حدیث سناؤں گا۔ پھر بیہوش ہو جاتے تھے۔ چوتھی بار بیہوشی کا حملہ اتنا شدید ہوا کہ غش کھا کے منہ کے بل گر پڑے۔ شفیا اصبحی نے ان کو سنبھال لیا اور دیر تک لئے بیٹھے رہے۔ افاقہ ہوا تو ایک حدیث بیان کی۔[۱]

حق گوئی | خشیت ربانی کے غلبہ کا ہی نتیجہ تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نہایت بے باک اور جری واقع ہوئے تھے۔ حضرت ابوہریرہ مدینہ میں قیام پذیر تھے یہاں کا گورنر مروان تھا۔ ایک مرتبہ ابوہریرہ اس کے گھر تشریف لے گئے تو تصویریں آویزاں دیکھیں۔ چپ نہ رہ سکے فرمایا "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو خدا کی خلق کی طرح مخلوق بناتا ہے۔ اگر اس کی قدرت میں ہے تو کوئی ذرہ غلہ یا جو پیدا کر کے دکھائے۔[۲]

عام تبصرہ | اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ غزوۂ خیبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر مشرف باسلام ہوئے۔ اس لحاظ سے ان کو صرف چار سال صحبت نبوی سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ حضرت ابوہریرہ رضہ سے جو حدیثیں منقول ہیں ان کی تعداد اس مدت کے پیشِ نظر بہ ظاہر زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ ان چار سالوں کی مدت میں حضرت ابوہریرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہیں ہوئے۔ اور سفر و حضر میں، جلوت و خلوت میں، رزم میں اور بزم میں ہر جگہ اور ہر مقام پر وہ آنحضرت کے ساتھ ساتھ رہے۔ اور اس شرفِ معیت کی وجہ سے وہ حضورؐ کے تمام اقوال و افعال دیکھتے اور سنتے تھے۔ پھر خود بھی سوال کرنے میں بڑے جری اور بیباک تھے۔ تو یہ باور کر لینا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ دراصل ان سب چیزوں کے لحاظ سے

[۱] ترمذی ابواب الزہد باب الریا والسمعۃ [۲] مسند امام احمد بن حنبل۔

Marfat.com

حضرت ابوہریرہ کی مرویات کی تعداد مدتِ معیت کے اعتبار سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بحث تو "مرویاتِ ابوہریرہ" کی کمیت کے لحاظ سے تھی۔ اب حضرت ابوہریرہ کی قوتِ حافظہ، احتیاط فی الروایت، اجلہ صحابہ کا ان پر اعتماد و وثوق، خشیتِ ربانی، خوفِ قیامت، فقر و استغنا، اعلانِ حق میں جرأت و بے باکی، احادیث رسول اللہؐ کے ساتھ غایت درجہ عشق و محبت ان کا نہایت احترام، احادیث کی کتابت، ان سب چیزوں پر غور کیجئے تو مرویاتِ ابوہریرہ کی کیفیت کے متعلق بھی صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ کس پایہ کی ہیں اور ہمارے لئے کس درجہ لایقِ اعتبار ہوسکتی ہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ جن محدثین نے حضرت ابوہریرہؓ کی بعض حدیثوں پر کلام کیا ہے وہ اس پر مبنی نہیں ہے کہ انھیں حضرت ابوہریرہؓ پر اعتماد نہیں بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ سے محدث تک جو سلسلۂ رواۃ ہے اس میں بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر ثقہ یا متکلم فیہ ہیں ورنہ محدثین کا اتفاق ہے کہ اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ یعنی صحابی سب عادل ہیں۔

وفات حضرت معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں ۵۸ھ میں وفات پائی۔ یہی وہ سال ہے جس میں حضرت عائشہؓ کا وصال ہوا ہے بعض روایتوں سے ۵۷ھ کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

(مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۰۸)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ

نام و نسب عبداللہ نام ابو العباس کنیت، والد ماجد کا نام عباسؓ اور والدۂ ماجدہ کا اسمِ گرامی ام الفضل لبابہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور ام المومنین حضرت میمونہؓ کے بھانجے تھے۔ ہجرت سے تین سال قبل مکہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت عباسؓ ۸ھ میں فتح مکہ سے کچھ پہلے علانیہ حلقہ بگوش اسلام ہو کر مدینہ پہنچے تو حضرت عبداللہؓ بھی ساتھ تھے۔ اس وقت ان کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ عمر کے اعتبار سے اگرچہ بچہ تھے لیکن حضرت عباسؓ کی تاکید کی وجہ سے خدمتِ نبوی میں اکثر حاضر رہتے تھے اور مجلس کے مذاکرات سنتے تھے۔

مستشرقین کو حضرت ابنِ عباسؓ پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف تیرہ یا چودہ برس کی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ عمر بچپن کی ہے جبکہ انسان میں سنجیدگی، معاملہ رسی اور حقیقت بینی کا فقدان ہوتا ہے اس لئے جو حدیثیں آپ سے مروی ہیں ان کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟

اس اعتراض کا جواب معلوم کرنے کے لئے ہم کو امور ذیل پر غور کرنا چاہیے۔

(۱) حضرت ابنِ عباسؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنا تعلق تھا؟۔

(۲) آپ کا علمی پایہ کیا تھا؟

(۳) صحابہ میں آپ کو کیا وقعت و منزلت حاصل تھی؟

(۴) روایات میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا؟

اب ہم ان میں سے ہر ایک کا جواب لکھتے ہیں۔

Marfat.com

ابن عباسؓ پر رسول اللہؐ کی نظر شفقت و تربیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابنِ عباسؓ کے ساتھ اول تو قرابت و رشتہ داری کا تعلق تھا۔ پھر یوں بھی آپ ان کی ذہانت وفطانت، ہونہاری اور سلامت روی کے باعث ان سے محبت کرتے تھے۔ ابن عباس آئندہ چل کر کیا ہونے والے تھے۔ اربابِ نظر اس کا اندازہ اسی ایک بات سے کرسکتے ہیں کہ ان کی پیدائش کے بعد حضرت عباسؓ انھیں خدمتِ نبوی میں لیکر حاضر ہوئے تو آپ نے اپنے لعابِ دہن سے اس بچہ کے کام ودہن کی ضیافت کرکے اس کی دستاویز ارجمندی وبخت بلندی پر مہر تصدیق ثبت کردی۔[1]

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سینہ سے لگا کر دعا کی اللّٰہم علمہ الحکمۃ "اے اللہ تو انھیں حکمت سکھادے" بعض روایتوں میں حکمت کے بجائے فقہ کا لفظ آتا ہے۔[2]

اوپر معلوم ہوچکا ہے ام المومنین حضرت میمونہؓ حضرت ابن عباسؓ کی خالہ تھیں۔ وہ ان کو نہایت عزیز رکھتی تھیں۔ اس بنا پر آپ اکثر حضرت میمونہ کے گھر میں رہتے۔ اور کبھی کبھی رات کو بھی یہیں سوجاتے تھے۔ اس تقریب سے انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتگذاری کا شرف حاصل ہوجاتا تھا۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شب میں نماز کے لئے بیدار ہوئے۔ ابنِ عباسؓ نے وضو کے لئے پانی لاکر رکھدیا۔ آپ نے پوچھا "پانی کون لایا تھا؟" حضرت میمونہؓ بولیں عبداللہ" سرورکائناتؐ نے خوش ہوکر دعائیں دیں "اللھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل اے خدا ان کو مذہب کی صحیح سمجھ عطا فرما۔ اور تاویل کا طریقہ سکھا۔[3]

حضرت میمونہؓ کے ہی گھر کا دوسرا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابنِ عباسؓ تہجد کی نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہوئے۔ آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں اپنے برابر کھڑا کرلیا۔ لیکن وہ حیران وششدر ہوکر رہ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے

---

[1] اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۹۳ [2] ایضاً [3] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۳۴۔

Marfat.com

فارغ ہو کر دریافت کیا "کیا حال ہے؟" بولے "یا رسول اللہ! کیا آپ کے برابر کھڑا ہونا کسی کے لئے مناسب ہے حالانکہ آپ رسولِ خدا ہیں" یہ سن کر سید دو عالم بہت خوش ہوئے۔ اور ان کے لئے علم و فہم کی زیادتی کی دعا فرمائی۔[۱]

وفاتِ نبوی کے وقت ابنِ عباسؓ کی عمر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت ابنِ عباسؓ کی عمر کیا تھی؟ اس میں اختلاف ہے۔ سعید بن جبیر نے خود حضرت ابنِ عباسؓ سے جو روایت بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر پندرہ سال کی تھی لیکن غالباً یہ زیادہ صحیح ہے کہ اس وقت آپ تیرہ برس کے تھے۔ اب غور کیجئے تیرہ سال کی عمر کا ایک تندرست بچہ اور بالخصوص عرب ایسے گرم ملک کی آب و ہوا میں رہنے والا اچھا خاصہ جوان اور ذی شعور و احساس ہو جاتا ہے اور ایک معمولی قسم کا دانا و بینا انسان بھی اس عمر کے بچہ کو اور اس کے عام اطوار و حرکات کو دیکھکر باطمینانِ تام اس کی آئندہ زندگی کے متعلق پیش گوئی کر سکتا ہے۔ پس اس عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابنِ عباسؓ کے ساتھ غیر معمولی محبت و شفقت ظاہر کرنا۔ اور متعدد مواقع پر ان کے لئے دعائیں فرمانا اور حضرت ابنِ عباسؓ کو دوسروں کی بہ نسبت آپ سے قرب و اتصال کے مواقع کا میسر ہونا یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ امت کے بہت بڑے ذمہ دار عالم اور شریعت و مذہب کے رموز و اسرار کے امین ہونے والے ہیں۔

علمی کمال

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے مطابق ہی ہوا کہ حضرت ابنِ عباسؓ علم و حکمت کے ایک بحرِ ناپیدا کنار ہو گئے۔ قرآن۔ تفسیر۔ فقہ۔ حدیث۔ لغت اور شاعری ان میں کوئی علم ایسا نہیں تھا جس میں ان کو مہارتِ تامہ حاصل نہ ہو۔

مستشرقین حضرت ابنِ عباسؓ کی کثرتِ روایت کو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی کم عمری کو دیکھکر ان کی روایتوں پر شک و شبہ کا اظہار تو کرتے

---

[۱] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۳۴۔

Marfat.com

لگتے ہیں۔ لیکن حضرت ابنِ عباسؓ نے جس قدسی ماحول میں تربیت پائی اور پھر خود انھوں نے جس ذوق وشوق اور محنت وکاوش سے علم وکمال کی تحصیل کی۔ اور اجلۂ صحابہ کے حیات ہونے کی وجہ سے جوان کو اس کے بیش از بیش مواقع حاصل تھے ان سب چیزوں کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں۔

علمی شوق | ذیل میں چند واقعات نقل کئے جاتے ہیں جن سے حضرت ابنِ عباسؓ کے شوقِ علم کا اندازہ ہوگا۔

حضرت ابنِ عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک انصاری سے کہا کہ رسول اللہؐ وفات پاگئے۔ لیکن آپ کے اصحاب زندہ ہیں، چلو ان سے علم حاصل کریں۔ انصاری بولے ابنِ عباس! لوگ خود علم میں تمہارے محتاج ہیں۔ پھر تم دوسروں کے پاس کیوں جاتے ہو؟ حضرت ابنِ عباسؓ نے یہ سن کر انھیں چھوڑ دیا اور تنہا تحصیلِ علم کے لئے نکل پڑے۔ تحقیق وجستجو کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ جس کسی شخص کے پاس انھیں کوئی حدیث معلوم ہوتی محنت ومشقت برداشت کرکے وہاں پہنچتے اور اطلاع دیتے وہ شخص گھر سے نکل آتا اور کہتا ابنِ عمِ رسول! آپ نے کیسے تکلیف کی۔ حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے "میں نے سنا ہے کہ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنی ہے" وہ کہتا "ابنِ عمِ رسول! آپ نے کیوں تکلیف کی کسی اور کو بھیجدیا ہوتا۔ فرماتے نہیں یہ میرا کام تھا اس لئے مجھ کو ہی آنا چاہئے تھا۔ ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں انصاری کا حال یہی رہا۔ جب لوگ میرے پاس اکٹھے ہونے لگے تو انصاری نے کہا یہ نوجوان مجھ سے زیادہ عقلمند تھا"[۱]

ابورافع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے اس لئے ان کو اقوال و افعالِ نبوی سننے اور دیکھنے کا موقع زیادہ ملا تھا۔ حضرت ابنِ عباسؓ ان کے پاس ایک کاتب کو لیکر آتے اور پوچھتے جاتے کہ بتاؤ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں فلاں دن

---

[۱] مستدرک حاکم ج ۳ فضائل ابنِ عباسؓ علی شرط بخاری۔

Marfat.com

کیا کیا کیا۔ ابورافع بیان کرتے جاتے اور کاتب قلمبند کرتا جاتا[۱]۔

صحابہ میں آپ کی قدر و منزلت

حضرت ابنِ عباسؓ کی ذاتی محنت و کوشش، تلاش و جستجو، بہترین تربیت، عمدہ ماحول اور پھر سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مشفقانہ دعاؤں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ صحابۂ کرام میں علم و فضل کے اعتبار سے نہایت نمایاں مقام کے مالک ہو گئے۔ اکثر اکابر صحابہ جو عمر اور مرتبہ میں ان سے کہیں زیادہ تھے انھیں بھی ان کے سامنے قصورِ علم کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے "کانتا رتقا ففتقنٰھما" کا مطلب دریافت کیا انھوں نے اس شخص کو حضرت ابنِ عباسؓ کے پاس بھیجدیا۔ اس نے پوچھا تو انھوں نے فرمایا۔

"آسمان کا رتق یہ تھا کہ پانی نہ برساتا تھا اور زمین کا رتق یہ تھا کہ اس سے نباتات نہ اگتی تھیں۔ پھر اللہ نے ان میں فتق پیدا کر دیا۔ تو آسمان سے بارش ہونے لگی۔ اور زمین سے نباتات اُگنے لگے سائل نے واپس آکر حضرت ابنِ عمرؓ کو یہ جواب سنایا تو انھوں نے کہا۔

لقد اوتی ابن عباس علماً	ابنِ عباسؓ کو واقعی سچا علم دیا گیا ہے پہلے
صدقا لقد کنت اقول ما یعجبنی	مجھ کو تعجب ہوتا تھا کہ ابن عباس تفسیر
جرأة ابن عباس علی تفسیر	قرآن میں کیسی جرأت کرتے ہیں۔ لیکن
القرآن فالآن قد علمت	اب مجھ کو معلوم ہو گیا کہ واقعی ان کو علم
انہ قد اوتی علماً[۲]	دیا گیا ہے۔

عمرو بن جبشی کہتے ہیں "میں نے ایک مرتبہ حضرت ابنِ عمرؓ سے کسی آیت کا مطلب پوچھا تو بولے "ابن عباسؓ کے پاس جاؤ۔ اب جتنے لوگ بھی باقی ہیں خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو نازل کیا تھا ان سب لوگوں میں ابن عباس اس کے سب سے بڑے عالم ہیں[۳]۔

[۱] اصابہ ج ۴ ص ۹۲۔ [۲] ایضاً۔ [۳] ایضاً ص ۹۳

Marfat.com

علم بالسنت کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ صحابۂ کرام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل کے متعلق اختلاف ہوتا تو وہ حضرت ابنِ عباس کی ہی طرف رجوع کرتے تھے۔ ایک دفعہ صحابہ میں اختلاف اس مسئلہ میں ہوا کہ سرورِ کونین نے احرام کہاں سے باندھا تھا؟ سعید بن جبیرؓ نے ابنِ عباس سے کہا "ابن العباس! مجھ کو حیرت ہے کہ صحابہ میں حضورؐ کے احرام باندھنے کی جگہ سے متعلق اتنا شدید اختلاف ہے" آپ نے فرمایا "اس مسئلہ میں میری معلومات سب سے زیادہ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی حج کیا تھا۔ اس لئے اختلاف اور بھی زیادہ ہوگیا ہے۔ سبب یہ ہے کہ جب آپ نے مسجد ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد احرام باندھا اور لبیک کہنا شروع کیا تو جو لوگ اس وقت موجود تھے انھوں نے اسی کو یاد رکھا پھر جب اونٹنی روانہ ہوئی اور آپ نے پھر لبیک کہا تو جو لوگ اس وقت موجود تھے وہ یہ سمجھے کہ آپ نے یہیں سے ابتدا کی ہے۔ پھر جب آپ بلند مقام پر چڑھے اور لبیک کہنا شروع کیا تو جو لوگ اس وقت آکر ملے وہ سمجھے کہ آپ نے ابتدا یہیں سے کی ہے لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ نے مسجد میں احرام باندھا اس کے بعد جب اونٹنی روانہ ہوئی اس وقت۔ اور جب بلند مقام پر چڑھے۔ تب دونوں مرتبہ لبیک کہتے رہے۔[1]

یہ اور اس طرح کے دسیوں واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام بڑے بڑے صحابہ حضرت ابن عباسؓ کی جلالتِ علم و کمالِ فضیلت کے معترف تھے اور عمر میں ان سے کم ہونے کے باوجود وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ کسی نے ایک مرتبہ بھی ان پر عدم اعتماد کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے مختلف فیہ مسائل میں انھیں کی طرف رجوع کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ ایسے مردم شناس متشدد فی الاسلام بزرگ حضرت ابن عباس رضؓ کی کم عمری کے باوجود ان کو شیوخ بدر کی مجلسوں میں برابر کا شریک رکھتے تھے کسی نے کہا "وہ تو

[1] ابوداؤد کتاب المناسک باب وقت الاحرام۔

Marfat.com

ہمارے لڑکوں کے برابر ہیں" آپ نے فرمایا "تم ان کا مرتبہ جانتے ہو؟"[51]

روایت میں احتیاط | اس علم وفضل اور کمال ومہارت کے باوجود روایت کے معاملہ میں بے انتہا محتاط واقع ہوئے تھے۔ وہ حدیث بیان کرتے وقت اس کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ کوئی غلط روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہوجائے۔ پہلے کسی مقام پر گذر چکا ہے کہ جب لوگوں نے رطب ویابس ہر قسم کی روایتیں بیان کرنی شروع کردیں تو حضرت ابن عباس رضؓ نے روایت بیان کرنا ہی ترک کردیا۔[52]

وہ لوگوں سے فرماتے تھے "تمہیں قال رسول اللہ کہتے وقت یہ خوف دامنگیر نہیں ہوتا کہ تم پر عذاب نازل ہوجائے یا زمین شق ہوجائے اور تم اس میں سما جاؤ"[53]

مرویات کی تعداد | عموماً کہا جاتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضؓ کثیر الروایت تھے لیکن ان سے جو روایتیں مروی ہیں ان کی مجموعی تعداد ۲۶۶۰ بتائی جاتی ہے جن میں سے ۷۵ متفق علیہ ہیں یعنی ان کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے اپنی "صحیحین" میں نقل کیا ہے ان کے علاوہ ۱۸ روایتوں میں امام بخاریؒ منفرد ہیں اور ۴۹ میں امام مسلمؒ۔[54]

حضرت ابن عباس رضؓ نے ۶۸ھ میں بعمر ۷۱ سال اس جہان فانی کو الوداع کہا اب اگر آپ کی یہ عمر پیش نظر رکھی جائے اور پھر اس کے ساتھ ہی آپ کے شوق تحصیل علم، محنت وجستجو اور شب وروز کی مصروفیت وانہماک کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کی یہ تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے اور دراصل یہ بھی حضرت ابن عباس رضؓ کی غایت احتیاط کا نتیجہ ہے۔

اس تفصیل سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

---

[51] بخاری کتاب التفسیر باب قولہ فسبح بحمد ربك۔ [52] صحیح مسلم باب النہی عن الروایۃ عن الضعفاء۔

[53] مسند دارمی باب ماتیقی من تفسیر حدیث النبی صلعم۔ [54] تہذیب الکمال ص ۲۰۲۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابنِ عباسؓ پر ایک خاص نظرِ شفقت و تربیت رکھتے تھے۔

(۲) علم وفضل میں آپ کا مرتبہ نہایت اعلیٰ تھا۔

(۳) صحابہؓ میں آپ کو بڑی وقعت ومنزلت حاصل تھی۔

(۴) روایت میں حضرت ابنِ عباسؓ حددرجہ محتاط واقع ہوئے تھے۔

ان سب حقیقتوں کے پیشِ نظر بتاؤ کہ کیا ایک لمحہ کے لئے بھی حضرت ابنِ عباسؓ پر شک وشبہ کا اظہار کیا جاسکتا ہے؟ یہاں سوال اس کا نہیں ہے کہ بعد والے لوگوں نے روایتوں میں کیا خلط ملط کردیا جس کی وجہ سے تمام مرویاتِ ابنِ عباس درجۂ قبول حاصل نہیں کرسکیں۔ یہاں تو صرف ثابت یہ کرنا ہے کہ صحابہؓ میں جو بزرگ کثیر الروایت تھے اور جن کی کثرتِ روایت ہی مستشرقین کی نظر میں شک وشبہ کا باعث ہوتی ہے۔ وہ کس پایہ کے بزرگ تھے؟ اور کیا ان بزرگوں کی کثرتِ روایت کے باعث یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہدِ صحابہؓ میں احادیث کا ذخیرہ اتنا مشتبہ ہوگیا تھا کہ بعض بڑے بڑے صحابہؓ بھی اس سے مبرّا قرار نہیں دیئے جاسکتے؟

صحابہؓ سب عادل ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابنِ عباسؓ یہی دو جلیل القدر صحابی ہیں۔ جن پر ان کی کثرتِ روایت کی وجہ سے بعض گستاخوں نے زبانِ اعتراض کھولی ہے ان کے علاوہ جو صحابۂ کرامؓ ہیں ان پر نہ کچھ ایسے زیادہ اعتراضات کئے گئے ہیں اور نہ فرداً فرداً ان میں سے ہر ایک پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ائمۂ اسلام نے جرح وتعدیل کے جو اصول مقرر کئے ہیں صحابۂ کرامؓ کی مقدس ذات ان سے بہت بلند وبالا ہے اور وہ سب کے سب عدول اور ثقہ ہیں۔

حافظ ابنِ حجرؒ نے اصابہ کے مقدمہ میں فصل ثالث کے ماتحت اس پر تفصیلی بحث کی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کا اقتباس درج کیا جائے۔ فرماتے ہیں:-

"سب اہلِ سنت اس پر متفق ہیں کہ تمام صحابہؓ عادل ہیں، چند مبتدع لوگوں کو چھوڑکر

کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔ خطیب نے کفایہ میں اس پر ایک نفیس فصل لکھی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ صحابہؓ کی عدالت تو اس لئے ثابت ہے کہ خود خدا نے ان کی تعدیل کی ہے اور ان کی طہارت و پاکیزگی کی خبر دی ہے مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ اور وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا اور لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ۔ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُھٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ۔ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰہُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ لِلْفُقَرَآءِ الْمُھٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاَمْوَالِھِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا وَّیَنْصُرُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ یہ اور ان کے علاوہ اور آیاتِ کثیرہ اور احادیثِ صحیحہ ہیں جن سے صحابہؓ کی عدالت و ثقاہت یقینی طور پر معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس تعدیل کے بعد اب وہ انسانوں میں سے کسی کی تعدیل کے محتاج نہیں ہیں اور اگر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے صحابۂ کرامؓ کی تعدیل میں یہ آیات و احادیث نہ وارد ہوتیں تب بھی ان کی بے مثل خدماتِ اسلام یعنی ہجرت، جہاد، اسلام کے لئے جان و مال کی قربانی؛ آباء اور ابناء کا قتل، دین میں خیرخواہی و خیراندیشی، قوتِ ایمان و یقین، ان کی عدالت و نزاہت کا اور اس بات کا یقین دلانے کے لئے کافی ہیں کہ وہ اپنے بعد میں آنیوالے لوگوں اور تمام تعدیل کرنے والوں سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ تمام علماء کا مسلک یہی ہے۔

ابوزرعہ رازی کہتے ہیں جب تم کسی شخص کے متعلق سنو کہ وہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی کی تنقیص کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول حق ہے، قرآن حق ہے اور جو کچھ قرآن مجید لایا ہے وہ حق ہے اور یہ سب

Marfat.com

کچھ ہم تک صحابۂ کرامؓ کی وساطت سے ہی تو پہنچا ہے اور یہ لوگ (صحابہ پر جرح کرنے والے) چاہتے ہیں کہ ہمارے گواہوں (صحابہ) پر جرح کریں تاکہ اس طریقہ سے کتاب وسنت کو ناقابلِ اعتبار قرار دیدیں۔ یہ لوگ خود اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان پر جرح کی جائے۔ یہ زنادقہ ہیں۔

صحابہؓ کی فضیلت میں احادیث بھی بہت کثرت سے آئی ہیں مثلاً ترمذی اور ابنِ حبان نے اپنی "صحیح" میں عبداللہ بن مغفل کی حدیث نقل کی ہے کہ "میرے اصحاب کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اللہ سے ڈرو، ان کو اپنے طعن وتشنیع کا نشانہ نہ بناؤ، جو شخص ان سے محبت رکھتا ہے وہ مجھ سے محبت رکھنے کے باعث ان سے محبت کرتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے جس نے ان کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھ کو تکلیف پہنچائی اور جس نے مجھ کو تکلیف پہنچائی اس نے اللہ کو تکلیف پہنچائی اور قریب ہے کہ اللہ اس کو اپنی گرفت میں لیلے۔[۱]

ابو محمد بن حزم فرماتے ہیں:۔

"سب صحابہؓ یقیناً اہلِ جنت ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ" اور ایک جگہ ارشاد ہے "إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ" پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ تمام صحابہ اہلِ جنت ہیں اور ان میں سے کوئی نار میں داخل نہیں ہوگا کیونکہ ان آیتوں کا خطاب انھیں سے ہے۔

عبداللہ بن ہاشم الطوسی بروایت وکیع بیان کرتے ہیں کہ حضرت سفیان فرماتے تھے

[۱] اصابہ فی تمیز الصحابہ مقدمہ ص ۶، ۷، ۸ مطبوعہ مصر۔

"قل الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ میں عبادہ الذین اصطفیٰ سے مراد صحابہ کرام ہیں"۔ [1]

حافظ ابن حجرؒ نے اپنی تقریر میں ابوزرعہ رازی کے حوالہ سے جو قول نقل کیا ہے عقلی اعتبار سے وہ عدالتِ صحابہؓ کی قوی ترین دلیل ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر جماعت میں چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس جماعت کی عملی تشکیل کرتے ہیں، اس کے لئے قواعد و ضوابط وضع کرتے ہیں۔ اور اس کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے ہر بڑی سے بڑی قربانی کے پیش کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ جماعتی اصول کے مطابق یہ لوگ ہر قسم کی تنقید سے بلند و بالا ہوتے ہیں۔ اور ہونا بھی یہی چاہیئے کیونکہ اگر ان پر بھی اصولِ جرح و تعدیل جاری کئے جائیں تو پھر وہ جماعت جماعت باقی نہیں رہ سکتی۔

یہ ظاہر ہے کہ ہم تک کتاب و سنت کا جو کچھ ذخیرہ پہنچا ہے حضرات صحابہ کرام کی وساطت سے ہی پہنچا ہے۔ اگر ان پر بھی اور لوگوں کی طرح جرح و تعدیل کی جائے گی تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ سنت کا کیا ذکر خود قرآن مجید بھی (معاذ اللہ) ناقابلِ اعتبار قرار پاجاتا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے قابل اعتماد ہونے کی دلیل آپ کے پاس بجز اس کے کوئی نہیں ہے کہ وہ نقلِ متواتر کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ نقل متواتر کی تعریف یہ ہے کہ ہر زمانہ میں اس روایت کو ایسی کثیر جماعت نے نقل کیا ہو کہ ان سب کا کذب پر متفق ہونا عادۃً محال ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ جماعت افراد سے مرکب ہوتی ہے اور چونکہ ہر ہر فرد میں کذب بیانی کا احتمال ہے اس لئے جماعت میں بھی اس بات کا احتمال ہوسکتا ہے کہ وہ سب کی سب کذب پر متفق ہوگئی ہو۔ اور سب سے پہلی جماعت جس نے قرآن مجید نقل کیا صحابہ کی ہی ہے۔ پس اگر صحابہ کی جماعت کو جرح و تعدیل سے بلند و بالا نہ تسلیم کیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہوگا کہ خود قرآن نقلِ متواتر کے باوجود معرض شک و شبہ ہوجائے اور ظاہر ہے اس کو منکرینِ

[1] بحوالہ مقدمہ اصابہ۔

حدیث بھی برداشت نہیں کر سکتے ! فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُونَ ۔

چنانچہ حافظ ابنِ صلاح فرماتے ہیں ۔

ثم ان الامة مجمعة علی تعدیل جمیع الصحابة ومن لابس الفتن منهم فکذالك باجماع العلماء الذین یعتد بهم فی الاجماع احسانا للظن بهم ونظرا الی ما تمهد لهم من المآثر وکان الله سبحانه وتعالی اتاح الاجماع علی ذالك لکونهم نقلة الشریعة۔ ؎۱	پھر امت کا تمام صحابہ کی تعدیل پر اتفاق ہے اور جو صحابہ فتنوں کے ساتھ دوچار ہوئے ہیں وہ بھی ان میں سے ہی ہیں۔ اور یہ فیصلہ صحابہ کے ساتھ حسنِ ظن اور ان کے فضائل و مکارم کو پیشِ نظر رکھنے کی وجہ سے ہے۔ اور چونکہ یہ مقدس حضرات شریعت کے نقل کرنے والے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے گویا ان کی عدالت پر امت کا اجماع مقرر کر دیا۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔

"سلفِ امت اور جمہور خلف کا اس پر اتفاق ہے کہ صحابہ کی عدالت اس لئے ثابت ہے کہ خود اللہ نے ان کی تعدیل اور ان پر ثنا کی ہے۔ پس یہی ہمارا اعتقاد ہے۔" ؎۲

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر صحابہ کے کسی فعل پر نکتہ چینی کرنے اور ان میں سے کسی کی شان میں گستاخانہ کلمات کہنے کی سخت ممانعت فرمائی ہے۔ جمعہ کے خطبہ میں بارہا سنا ہوگا۔

الله الله فی اصحابی لا تتخذوهم من بعدی غرضا۔	تم میرے اصحاب کے متعلق کچھ کہتے ہوئے اللہ سے ڈرو، ان کو میرے بعد نشانہ نہ بناؤ۔

؎۱ مقدمہ ابن صلاح ص ۲۶۰ ؎۲ المستصفی جز ۱ ص ۱۶۵

Marfat.com

عدالت سے مراد

لیکن یہاں اس امر کی تصریح کردینی ضروری ہے کہ صحابہ کی عدالت سے مراد کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ اصولِ حدیث کی اصطلاح میں عدالت کے معنی جھوٹ نہ بولنا ہیں۔ پس ہم صحابہ کو جو عادل کہتے ہیں تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ بے گناہ اور معصوم ہیں بلکہ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کی طرف کذب کا انتساب نہیں کیا جاسکتا یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کسی صحابی نے عمداً وقصداً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کی ہے جو آپ نے نہیں فرمائی۔ اس کا دعویٰ کسی محدث نے نہیں کیا کہ صحابہؓ انبیاء کی طرح معصوم ہیں اور ان سے احتیاط وتقویٰ کے خلاف کوئی فعل صادر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ علامہ ابن انباری کا قول ہے۔

لیس المراد بعدالتہم ثبوت العصمۃ لہم واستحالۃ المعصیۃ منہم وانما المراد قبول روایاتہم من غیر تکلف البحث عن اسباب العدالۃ وطلب التزکیۃ الا ان یثبت ارتکاب قادح ولم یثبت ذالک [1]	صحابہ کی عدالت سے یہ مراد نہیں ہے کہ صحابہ بالکل معصوم ہیں اور ان سے معصیتوں کا صادر ہونا محال ہے بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ اسباب عدالت اور تزکیہ کی طلب سے متعلق بحث کے بغیر انکی روایتیں قبول کی جائیں گی مگر ہاں اس صورت میں جبکہ کسی امر قادح کے ارتکاب کا ثبوت بہم پہنچ جائے اور یہ ثابت نہیں ہے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

"اہل سنت کا یہ ثابت ومسلم عقیدہ ہے کہ صحابہؓ کل کے کل عادل ہیں۔ یہ لفظ بار بار بولا گیا ہے اور میرے والد مرحوم (شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) نے اس لفظ کی حقیقت سے بحث کی تو یہ ثابت ہوا کہ اس موقع پر عدالت کے متداول معنی مراد نہیں ہیں بلکہ صرف عدالت فی روایت الحدیث مراد ہے۔ اس کے سوا اور کچھ مراد نہیں ہے اور

[1] ارشاد الفحول للشوکانی ص ۶۷ بحوالہ اسوۂ صحابہ۔ دار المصنفین اعظم گڑھ

اس عدالت کی حقیقت روایات میں جھوٹ بولنے سے بچنا ہے کیونکہ ہم نے تمام صحابہؓ کی سیرت کو خوب ٹٹولا یہاں تک کہ ان لوگوں کی سیرت کا بھی مطالعہ کیا جو خانہ جنگیوں، فتنوں اور لڑائی جھگڑوں میں شریک ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت دروغ بیانی کو سخت ترین گناہ سمجھتے تھے اور اس سے شدت کے ساتھ احتراز کرتے تھے۔ ؎

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے یہ خوب فرمایا کہ جو صحابہؓ خانہ جنگیوں میں مبتلا تھے ان کی سیرت کی اچھی طرح سے جانچ پڑتال کی گئی تو معلوم ہوا کہ روایت میں کذب بیانی سے کام انھوں نے بھی نہیں لیا اس کا اندازہ اس ایک بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ احادیثِ متواترہ کی تعداد محدثین کے نزدیک بہت ہی کم ہے اور ان ہی میں حدیث من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار بھی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام میں اس حدیث کو قرآن کی طرح شہرت حاصل تھی اور وہ کذب فی روایت الحدیث سے کس درجہ خوف کھاتے تھے۔

عدالت کے معنی کی اس تنقیح کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگر ہم تمام صحابہ کو عادل مانتے ہیں یعنی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے روایت میں کذب بیانی سے کام نہیں لیا تو اس میں کوئی بات "غیر صحیح اور قرآن کے خلاف نہیں ہے" اور نہ ہمارا یہ فیصلہ محض عقیدتمندی کا فیصلہ ہے۔

؎ ظفر الامانی ص ۱۳ بحوالہ اسوۂ صحابہ ص ۱۴۔

تابعین کا دور

صحابۂ کرام کے بعد تابعینِ عظام کا دور آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابۂ کرام مختلف شہروں میں متفرق ہوگئے تھے اور اپنے اپنے مقام پر قرآن وحدیث کی تعلیم دیتے تھے۔ مکہ، مدینہ، شام، بصرہ، کوفہ، یمن اور مصر، ان سب مقامات پر تعلیم قرآن و حدیث کی مستقل درسگاہیں قائم تھیں۔

مدینہ ان سب میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اکابر صحابہ مثلاً حضرت عمرؓ، زید بن ثابت عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم یہیں تشریف فرما تھے، مکہ میں حضرت معاذ بن جبلؓ۔ کوفہ میں حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ۔ بصرہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور انس بن مالکؓ۔ شام میں حضرت معاذؓ، عبادۃ بن الصامتؓ اور حضرت ابو الدرداءؓ۔ مصر میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ علم وفضل کے جواہر لٹا رہے تھے۔ ان کی درسگاہِ فیض وارشاد سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے جن پر اسلامی علوم وفنون کو رہتی دنیا تک ناز رہے گا۔

یہی تابعینِ کرام ہیں جو صحابۂ کرام کے علم کے صحیح وارث ہوئے انھوں نے بکمال مشقت اور بغایتِ محنت وجستجو قرآن وحدیث کا علم حاصل کیا اور اس میں مہارتِ تامہ پیدا کرکے اس کو محفوظ ومضبوط بنیادوں پر قائم کردیا۔ تابعین کرام کے مختلف طبقات ہیں علامہ ابنِ سعد نے طبقات میں پہلے شہر کے لحاظ سے ان کی تقسیم کی ہے۔ پھر ایک شہر کے تابعین میں ثقاہت وعدالت کے لحاظ سے متعدد طبقات قائم کئے ہیں اور ہر طبقہ کے حالات بڑی محنت وجستجو اور تلاش وتحقیق سے جمع کئے ہیں۔

Marfat.com

تابعینِ مدینہ کے طبقۂ اولیٰ میں سب سے زیادہ نمایاں اور مشہور شخصیت حضرت امام محمد بن مسلم معروف بہ ابنِ شہاب زہری کی ہے۔ صحابہ کے بعد علومِ قرآن وحدیث کی نشر و اشاعت جن بزرگوں کی کوششوں کی رہینِ منت ہے امام زہریؒ کا نام ان کے سرفہرست ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی علمی کوششوں کا تذکرہ مختصراً کر دیا جائے۔

امام زہریؒ آپ کا نام محمد تھا اور ابوبکر کنیت۔ والد کا نام مسلم تھا۔ ان کے پردادا عبداللہ بن شہاب زعمائے قریش میں سے تھے۔ انھیں کی نسبت سے امام زہری ابنِ شہاب کہلاتے ہیں۔ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔ امام زہری میں تحصیلِ علم کی استعداد فطری تھی۔ ذہانت وذکاوت میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ قوتِ حافظہ غیر معمولی رکھتے تھے[۵۱]۔ اسّی دن میں پورا کلام مجید حفظ کر لیا تھا۔ تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ ایک حدیث میں کچھ شبہ ہوا تھا لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ جس طرح انھیں یاد تھی وہ حدیث ویسی ہی تھی[۵۲]۔

اس غیر معمولی ذہانت وقوتِ حافظہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے علم کا ذوقِ جستجو بھی ایسا ہی مرحمت فرمایا تھا۔ اسی طلب میں آٹھ سال تک حضرت سعید بن المسیبؒ کی خدمت میں رہے۔ ابوالزناد کہتے ہیں "ہم علماء کے پاس زہری کے ساتھ جاتے تھے، ان کے پاس تختیاں اور صحیفے ہوتے تھے۔ جن میں وہ جو حدیث سنتے تھے لکھتے جاتے تھے۔ امام زہری کا ذوق کسی ایک علم وفن تک محدود نہ تھا بلکہ قرآن، حدیث، تاریخ، اور انسابِ عرب، ان میں سے وہ ہر ایک کا ذوق رکھتے تھے۔

ابوصالح لیث سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے زہریؒ سے زیادہ کسی کو جامع علوم و فنون نہیں دیکھا وہ ترغیب کی حدیثیں بیان کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اس سے زیادہ کچھ اور نہ جانتے ہوں گے۔ پھر عرب اور انساب کے متعلق بیان کرنے لگتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سب سے بہتر وہ اسی کو جانتے ہیں پھر اگر قرآن وحدیث بیان کرنے پر آجاتے تو اس میں

[۵۱] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۰ [۵۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۴

Marfat.com

بھی ایسی ہی مہارت دکھاتے تھے۔[۵۱]

کتابتِ حدیث | امام زہریؒ کا حافظہ اگرچہ نہایت قوی تھا لیکن از راہِ احتیاط وہ پھر بھی احادیث قلمبند کرتے تھے۔ صالح بن کیسان کا بیان ہے کہ "میں تحصیلِ علم میں زہری کے ساتھ رہتا تھا انھوں نے مجھ سے کہا کہ سنن قلمبند کرلینی چاہئے۔ چنانچہ ہم نے تمام سنن لکھ لیں۔ سننِ رسول اللہ کو لکھ لینے کے بعد انھوں نے کہا کہ اب سننِ صحابہ لکھ لینی چاہئے لیکن ہم نے ان سنن کو نہیں لکھا اور زہری نے لکھ لیا۔"[۵۲]

بعض محدثین کے بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے حکم سے سب سے پہلے امام زہریؒ نے احادیث کی تدوین کی تھی[۵۳]۔ یہ بیان صحیح ہو یا نہ ہو، یہ بہر حال یقینی ہے کہ امام زہریؒ نے احادیث کا ایک ضخیم مجموعہ تیار کیا تھا۔ امام شافعیؒ فرماتے تھے "اگر زہری نہ ہوتے تو مدینہ کے سنن ضائع ہوجاتے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ فرماتے تھے اب سنتِ ماضیہ کا جاننے والا زہریؒ سے زیادہ کوئی نہیں ہے[۵۴]۔ اسی قسم کا مقولہ حضرت مکحول سے بھی مروی ہے۔ ایوب السختیانی فرماتے تھے ما رأیت اعلم من الزھری[۵۵]۔

حفظِ احادیث | امام زہریؒ چونکہ کثرت سے روایت کرتے تھے اس لئے بعض لوگوں کو ان پر شبہ ہوتا تھا لیکن جب کبھی ان کا امتحان لیا گیا۔ تمام شکوک و شبہات کا پردہ خود بخود چاک ہوگیا۔

ایک مرتبہ ہشام بن عبد الملک نے اپنے کسی لڑکے کے واسطے ان سے حدیثیں قلمبند کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے چار سو حدیثیں لکھدیں۔ ایک ماہ کے بعد ہشام نے امتحاناً کہا کہ وہ مجموعہ گم ہوگیا۔ امام زہریؒ نے وہی احادیث پھر لکھوادیں۔ دونوں کو ملا کر دیکھا

---

[۵۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۳ [۵۲] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۸ ۔ [۵۳] مقدمہ فتح الملہم شرح مسلم ص ۹۲
[۵۴] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۳ ۔ [۵۵] ایضاً۔

گیا تو ایک حرف کا بھی فرق نہیں تھا۔ [۵۱]

مرویات کی تعداد اور ان کا پایہ

احادیث وسنن کا نہ معلوم کتنا ذخیرہ ان کے سینہ میں ہوگا۔ ان سے جو روایتیں مروی ہیں ان کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے۔ پھر کیفیت و نوعیت کے اعتبار سے دیکھئے تو ان کا پایہ بہت ہی اعلیٰ ہے۔ عمر بن دینار جو خود جلیل القدر محدث تھے فرماتے تھے "میں نے زہری سے زیادہ کسی کو حدیث میں قطعی فیصلہ کرنے والا نہیں دیکھا"۔ [۵۲] امام احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں "زہری کی وہ روایات اصح الاسانید ہیں جو انھوں نے سالم سے اور سالم نے اپنے والد عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہیں"۔ [۵۳]

شیوخ

امام زہری نے جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے۔ طلب علم میں ہر چشمۂ فضل و کمال سے سیراب ہونے کی کوشش کی تھی اس لئے ان کے شیوخ کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں چند فاضلہ خواتین بھی شامل ہیں۔ صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن جعفرؓ، ربیعہ بن عبادؓ، مسور بن مخرمہؓ، انس بن مالکؓ، سہل بن سعدؓ، سائب بن یزیدؓ، شبیبؓ، ابو جمیلہؓ، عبدالرحمن بن ازہرؓ، محمود بن ربیعؓ، عبداللہ بن ثعلبہؓ، عبداللہ بن عامرؓ، ابو امامہؓ، سعد بن سہل اور ابو الطفیلؓ اور اکابر تابعین میں حضرت سعید بن المسیبؒ، شعبیؒ، حسن بصریؒ۔ اور مکحولؒ۔ امام زہریؒ جتنے بڑے محدث تھے فقیہ و مفتی بھی تھے چنانچہ ان کی وفات کے بعد محمد بن نوح نے ان کے فتاوی جمع کئے تو تین جلدوں میں آئے۔ [۵۴]

امام زہریؒ کے علاوہ اس عہد کے ائمۂ حدیث جن کو سنن و آثار کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے حضرت نافع، اعمش اور قتادہ ہیں۔ امام زہریؒ کے تلامذہ پانچ طبقات پر منقسم ہیں۔

ان طبقات میں سے ہر طبقہ اپنے ماتحت طبقہ پر فضیلت رکھتا ہے۔ پہلے طبقہ میں وہ

---

[۵۱] تذکرۃ الحفاظ ص ۱۰۳ و ۱۰۴۔ [۵۲] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۸۔ [۵۳] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۹۱
[۵۴] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۶۔

Marfat.com

حضرات داخل ہیں جو عدالت، ثقاہت۔ اتقان اور حفظ میں سب سے ممتاز ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے شیخ کی طویل ملازمت و مصاحبت کا شرف رکھتے ہیں۔ دوسرے طبقہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو عدالت اور ثقاہت میں طبقۂ اولیٰ کے برابر ہیں۔ لیکن انھیں شیخ کی مصاحبت ان لوگوں کے برابر نصیب نہیں ہوئی۔ تیسرے طبقہ میں وہ بزرگ داخل ہیں جنھوں نے شیخ کی ملازمت تو پہلے طبقہ کے برابر کی ہے۔ لیکن وہ مفسدۂ جرم سے پاک نہیں، طبقہ چہارم کا اطلاق اس جماعت پر ہوتا ہے۔ جس کے افراد طبقۂ ثالثہ کے ساتھ جرح و تعدیل میں شریک ہیں اور اس کے ساتھ ملازمتِ شیخ بھی کچھ زیادہ طویل نہیں رکھتے۔ پانچواں طبقہ ضعفاء اور مجہول رواۃ کا ہے

ان رُواۃ میں مرتبہ اور درجہ کے لحاظ سے جو فرق ہے۔ اُسی کے اعتبار سے ان کی روایتوں کے قبول و عدم قبول سے متعلق تشدد اختیار کیا گیا ہے۔ طبقۂ اولیٰ کے لوگ چونکہ سب سے اعلیٰ اور افضل ہیں اس لئے امام بخاریؒ صرف انہی کو مستند قرار دیتے ہیں اور ان ہی کی روایات پر اعتماد کرتے ہیں۔ کبھی کبھی طبقۂ ثانیہ کے رُواۃ کی کوئی حدیث جس کی صحت کا ان کو یقین ہوتا ہے اسے بھی لے آتے ہیں۔ البتہ دوسرا طبقہ امام مسلمؒ کی شرط پر ہے۔ طبقہ ثالثہ کے رواۃ امام ابوداؤد اور نسائی کی شرط پر ہیں۔ طبقۂ رابعہ کے حضرات امام ابوعیسیٰ ترمذی کی شرط پر ہیں۔ پانچواں طبقہ مجہولین کا ہے اس لئے امام ابوداؤد کے نزدیک جو شخص ابواب کے ماتحت احادیث کی تخریج کرتا ہے اس کے لئے ان کی حدیث لینا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر اس کو دوسرے ذرائع سے اعتماد حاصل ہو جائے تو پھر اس روایت کے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

امام زہری اور ان کے معاصر ائمۂ حدیث جن کے تراجم اور علمی کوششوں کے ذکر کا . . . . یہاں موقع نہیں ہے۔ انھوں نے اقوال و افعالِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حفاظت اور ان کی نشر و اشاعت میں صحابۂ کرامؓ کی صحیح جانشینی کا پورا پورا حق ادا کیا۔

Marfat.com

پھر ان کے تلامذہ نے اپنے اساتذہ کے مسندِ درس وعلم کو سنبھالا تو تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے بھی اس ورثۂ علمی کی حفاظت تنقیح وتحقیق اور اس کی اشاعت وتوسیع میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور اس کو ہر امکانی کوشش کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ محفوظ و مامون کر دیا۔ یہ سلسلہ تدوین کے دور تک برابر جاری رہا۔

تیسری صدی ہجری میں جب "دورِ تدوین" کا آغاز ہوا تو اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اب تک احادیث فقہ سے الگ نہیں تھیں اور اسی بنا پر لوگ سنت کے ساتھ اقوال صحابہ کو بھی ملائے رکھتے تھے۔ لیکن اب خیر القرون کے ختم ہونے کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ حدیث کو بحیثیت ایک فن کے مدون کیا جائے۔ تو اقوالِ صحابہ کو سنت سے خارج قرار دیا گیا اور خود حدیث کی صحت معلوم کرنے کے لئے روایت کے قبول وعدم قبول کا معیار باقاعدہ طور پر مقرر کیا گیا۔ راویوں کا ایک ایک حال بڑی محنت وکوشش سے معلوم کیا۔ اسباب جرح و تعدیل کی تعیین ہوئی۔ حدیث کی متعدد قسمیں کی گئیں اور ان سب امور کی تکمیل کے لئے متعدد علوم وفنون مدون ہوئے جن کے حصار میں آج علمِ حدیث ہر قسم کے شکوک وشبہات سے دور نہایت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔

اسناد صحابۂ کرام کے عہد میں کسی روایت کی توثیق کا قاعدہ یہ تھا کہ راوی سے شہادت طلب کی جاتی تھی۔ تابعین کے عہد میں صرف شہادت کافی نہیں ہو سکتی تھی اس لئے اسناد کا سلسلہ قائم کیا گیا۔ یعنی جب کوئی راوی روایت بیان کرتا تھا تو اسے بتانا پڑتا تھا کہ اس نے وہ روایت کس سے سُنی ہے اور اس نے کس سے سنی تھی یہاں تک کہ وہ سلسلہ صحابی تک پہنچ جاتا تھا بڑے بڑے ائمہ اس کا التزام کرتے تھے۔

ایک مرتبہ امام زہریؒ جن کی فراست وثقاہت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا انھوں نے حضرت سفیان بن عیینہؒ سے ایک حدیث بیان کی اور اس کے ساتھ اسناد بھی بیان کرنی شروع کی تو سفیان بولے "آپ سند رہنے دیجئے" امام زہریؒ نے فرمایا "کیا آپ بغیر سیڑھی کے

چھت پر چڑھنا چاہتے ہیں۔"[1]

"تاہم معلوم ہوتا ہے کہ تابعین کے دورِ اولین میں اسناد کا عام طور پر زیادہ اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن جب طرح طرح کے فرقے پیدا ہوگئے اور بعض شریر النفس لوگوں نے اپنے عقائد باطلہ کو ثابت کرنے کے لئے احادیث وضع کرنی شروع کیں تو سند حدیث کی روایت کے لئے ایک لازمی اور اہم شرط قرار دیدی گئی۔ محمد بن سیرینؒ کا قول تھا۔

ان ھذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم — یہ علم دین ہے تم دیکھو کہ اپنے دین کو کس سے حاصل کر رہے ہو۔

پھر فرماتے ہیں۔

لم یکونوا یسئلون عن الاسناد فلما وقعت الفتنۃ قالوا سموا لنا رجالکم فینظر الی اھل السنۃ فیوخذ حدیثھم وینظر الی اھل البدع فلا یؤخذ حدیثھم[2] — پہلے لوگوں سے اسناد کے متعلق سوال نہیں کیا جاتا تھا، پھر جب فتنہ واقع ہوگیا تو محدثین نے کہا ہم سے اپنے راویوں کے نام بیان کرو تاکہ یہ دیکھا جائے کہ وہ اہل سنت میں سے ہیں یا نہیں، اگر ہیں تو اُن کی حدیث قبول کرلی جائے اور اگر وہ اہل بدعت میں سے ہیں تو ان کی حدیث ترک کردی جائے۔

حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے تھے۔

"راویوں نے جھوٹ کی آمیزش شروع کردی تو ہم نے تاریخ سے کام لینا شروع کردیا۔"

حسان بن زید کہتے ہیں۔

"کذابین کی تاریخ سے بڑھکر ہمارا کوئی مددگار نہیں ہے۔ میں شیخ سے اس کا سن دریافت کرتا ہوں اس کی تاریخ پیدائش پوچھتا ہوں اگر وہ سچ سچ بتادیتا ہے تو ہم اس کے صدق و کذب میں تمیز کرلیتے ہیں۔

[1] تدریب الراوی [2] مقدمہ صحیح مسلم۔

Marfat.com

حسن بن الربیع کہتے ہیں۔

"ایک بار میں بغداد گیا۔ جب واپس ہونے لگا تو اصحاب حدیث دور تک میری مشایعت کو آئے۔ میں باہر پہنچا تو انھوں نے کہا ذرا ٹھہر جائیے احمد بن حنبل آرہے ہیں۔ میں بیٹھ گیا۔ جب وہ آئے تو مجھ سے پوچھا کہ عبداللہ بن مبارک کا کس سنہ میں انتقال ہوا تھا؟ میں نے کہا ۱۸۱ھ میں۔ جب امام احمد بن حنبلؒ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کا اس سوال سے کیا مطلب تھا؟ تو فرمایا "میں کذابین کی شناخت اسی طرح کرتا ہوں" [1]

اسناد کی اہمیت

اسناد کو علم حدیث میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ عبداللہ بن مبارک فرماتے تھے "اسناد دین کا جز ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو جس کے جی میں جو آتا کہہ گذرتا" [2]

علامہ ابن صلاح لکھتے ہیں "اصل اسناد اس امت کے خصائص میں سے ہے اور سنن موکدہ میں سے ایک بہت بڑی سنت ہے" ائمہ حدیث کو اسناد عالی کی طلب اتنی ہوتی تھی کہ نفس واپسیں کے وقت بھی جبکہ انسان دنیا وما فیہا سے بے خبر ہوتا ہے اسے فراموش نہیں کرتے تھے۔ یحییٰ بن معینؒ کا انتقال ہونے لگا تو کسی نے ان سے پوچھا۔ اس وقت آپ کی تمنا کیا ہے؟ فرمایا "ایک تنہا مکان اور ایک عالی اسناد" محمد بن اسلم الطوسی نے کہا ہے "اسناد کا قرب گویا کہ اللہ کا قرب ہے" [3] قرآن مجید میں جو ایک مقام پر "او اثارۃ من علم" آیا ہے حاکم وغیرہ نے مطرالورّاق سے نقل کیا ہے کہ اس کا مصداق علم اسناد الحدیث ہے۔" [4]

جس روایت کا سلسلہ ثقہ راویوں کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتا تھا اُسے درجۂ قبول حاصل نہیں ہوتا تھا۔ ابو اسحاق ابراہیم بن عیسیٰ بیان کرتے ہیں۔

"ایک مرتبہ میں نے عبداللہ بن مبارکؒ سے ایک حدیث ان من البر بعد البران

---

[1] ابن عساکر ص ۲۶ [2] مقدمۂ ابن صلاح ص ۲۱۵ [3] ایضاً ص ۲۱۶ [4] التقلید والایضاح ص ۲۱۵

Marfat.com

تصلی لابویك مع صلوٰتك وتصوم لهما مع صومك" کی نسبت دریافت کیا تو انھوں نے پوچھا" تم نے یہ حدیث کس سے سنی ہے؟" میں نے کہا" شہاب بن خراش سے" فرمایا" وہ تو ثقہ ہیں اور شہاب نے کس سے لی ہے؟" میں نے کہا" حجاج بن دینار سے" فرمایا" وہ بھی ثقہ ہیں لیکن انھوں نے کس سے لی ہے؟" میں نے کہا "وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں" عبداللہ بن مبارک نے یہ سُنکر کہا" اے ابواسحاق حجاج بن دینار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تو بڑے بڑے جنگل ہیں جن میں اونٹنیوں کی گردنیں ٹوٹ جاتی ہیں" [۵۱]

اسمار الرجال کی تدوین اس علم اسناد الحدیث کی وجہ سے ہی رواۃ حدیث کے حالات وسوانح کی چھان بین کی گئی، ان کے اخلاق واعمال کے ایک ایک گوشہ کی بکمال احتیاط ودیدہ وری تحقیق وتفتیش کی گئی۔ جس سے" اسمار الرجال" کا وہ عظیم الشان فن مدون ہوگیا جس کی نظیر کسی قوم کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ جرمنی کے مشہور فاضل مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر جنھوں نے حافظ ابن حجر کی کتاب کی تصحیح کی ہے اصابہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسما الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے"۔ [۵۲]

محدثین نے اس کٹھن راہ میں جس انتہائی جفاکشی، دیانت داری اور صلاح وتقوی کا ثبوت دیا ہے، بے شبہ اس کو اسلام کا ایک معجزہ کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے جرح وتعدیل کا جو معیار مقرر کیا تھا اس پر بادشاہوں سے لیکر بڑے سے بڑے ائمہ مذہب کو پرکھا۔ اور اس راہ میں نہ ان کو کوئی دنیوی طاقت وحشمت مرعوب کرسکی اور نہ وہ کسی کی مذہبی قیادت وپیشوائی سے خوفزدہ ہوئے۔ جس شخص میں کوئی ذرا سا نقص بھی دیکھا اس کو برملا اور علی الاعلان کہا کہ

---

۵۱ مقدمہ صحیح مسلم باب الکشف عن معائب رواۃ الحدیث۔ ص ۱۲

۵۲ بحوالہ سیرت النبی ج ۱ ص ۳۵ - یہ حوالہ پہلے بھی ایک جگہ گذر چکا ہے۔

لوگ اس کی روایتیں قبول کرنے میں احتیاط برتیں۔ علی بن شقیق کہتے ہیں" میں نے ایک مرتبہ عبداللہ بن مبارک کو دیکھا کہ ایک بھرے مجمع میں کہہ رہے تھے۔

"لوگو! عمرو بن ثابت کی حدیثیں مت قبول کرو یہ سلف کی شان میں گستاخیاں کرتا ہے"[۱]

یحییٰ بن سعید کہتے ہیں۔

"میں نے حضرت سفیان ثوری، شعبہ، مالک اور ابن عینیہ سے پوچھا کہ اگر ایک شخص حدیث میں لائق اعتماد نہ ہو اور مجھ سے کوئی شخص اس کے متعلق دریافت کرے تو میں کیا کہوں؟ سب نے بالاتفاق کہا "تم صاف صاف کہدو کہ وہ لائق اعتبار نہیں ہے"[۲]

امام مسلمؒ نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں ایک فصل کے ماتحت اس پر مفصل کلام کیا ہے اور علماء و محدثین کے اقوال سے ثابت کردیا ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق کوئی ذرا سا شبہ بھی ہو تو اس کی حدیث قبول نہ کرنی چاہئے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کا اعلان عام کرکے لوگوں کو اس کے فتنہ و شر سے بچانے کی کوشش بھی کرنی چاہئے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں کسی کے تدین اور تشرع کو بھی تثبت فی روایت الحدیث کا معیار قرار نہیں دیا گیا۔ امام یحییٰ بن سعید القطان جو فن جرح و تعدیل کے بے نظیر امام ہیں ان کا قول پہلے گذر چکا ہے:۔

لم نر الصالحین فی شئ اکذب منہم فی الحدیث[۳] — صالحین کسی چیز میں اتنا جھوٹ نہیں بولتے جتنا کہ وہ حدیث میں بولتے ہیں۔

امام مسلم اس کی توجیہہ یہ کرتے ہیں کہ یہ لوگ عمداً جھوٹ نہیں بولتے بلکہ ان کی زبان سے خلاف واقعہ الفاظ نکل جاتے ہیں۔

معن بن عیسیٰ بیان کرتے ہیں کہ امام مالکؒ فرماتے تھے" چار شخصوں کی حدیث بالکل نہ قبول کی جائے، ایک بے وقوف کی، دوسرے اس شخص کی جو اپنی خواہشات کا بندہ ہو اور

---

[۱] مقدمہ صحیح مسلم [۲] و [۳] ایضاً

لوگوں کو ان کی دعوت دیتا ہو، تیسرے اس شخص کی جو جھوٹا ہو اور اگرچہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کذب بیانی کا ثبوت نہ پہنچا ہو، لیکن لوگوں کی بات چیت میں جھوٹ سے احتراز نہ کرتا ہو۔ اور چوتھے اس صاحبِ فضل و عبادت اور صاحبِ صلاح و تقویٰ کی حدیث بھی قبول نہ کی جائے جو اس حدیث کو جانتا ہی نہ ہو جسے وہ بیان کرتا ہے[۵۱]"

محدثین کو کسی کے متعلق اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ شخص روایت کے قبول کرنے میں راوی کی جانچ پڑتال اور اس کے حالات کی تحقیق نہیں کرتا تو وہ اس کو بھی خواہ وہ اپنی ذات سے کیسا ہی راست گفتار ہو ناقابلِ اعتبار قرار دیتے تھے۔ عبداللہ بن مبارک نے ایک راوی بقیۃ کی نسبت فرمایا۔

صدوق اللسان ولکنہ یاخذ	زبان کا سچا ہے۔ لیکن وہ ہر کہ ومہ کی
عمن اقبل وادبر[۵۲]	روایت قبول کرتا ہے۔

اسماء الرجال کی کتابیں محدثین نے اس فن کو اس درجہ ترقی دی کہ رُواۃ کے احوال میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں تصنیف کیں۔ پھر جو راوی ضعیف یا مجہول تھے ان کے احوال میں الگ، اور جو معتبر و ثقہ تھے ان کے حالات میں الگ کتابیں لکھیں۔

مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں[۵۳]:

"سب سے پہلے اس فن یعنی راویوں کی جرح و تعدیل میں یحییٰ بن سعید القطان نے ایک کتاب لکھی وہ اس مرتبہ کے شخص تھے کہ امام احمد بن حنبل نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ میری آنکھوں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا۔ ان کے بعد اس فن کو زیادہ رواج ہوا اور کثرت سے کتابیں لکھی گئیں جن میں سے چند ممتاز تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

---

۵۱ توجیہ النظر ص ۲۶ ۵۲ ایضاً۔ ۵۳ مقدمہ سیرت النبی ص ۳۶

Marfat.com

کیفیت	نام مصنف
خاص ضعیف الروایت لوگوں کے حال میں ہے	رجال عقیلی[1]
اس کتاب کا نام کتاب الجرح والتعدیل ہے۔	رجال احمد بن عبد العجلی متوفی ۲۶۱ھ
بہت ضخیم کتاب ہے۔	رجال امام عبد الرحمٰن بن حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ[2]
مشہور محدث ہیں یہ کتاب خاص ضعیف الروایت اشخاص کے حال میں ہے۔	رجال امام دارقطنی
اس فن کی سب سے مشہور کتاب ہے اور تمام محدثین متاخرین نے اس کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔	کامل ابن عدی[3]

مولانا شبلی لکھتے ہیں یہ کتابیں آج نہیں ملتیں لیکن بعد کی تصنیفات جو ان ہی سے ماخوذ ہیں وہ دستیاب ہوتی ہیں ان میں زیادہ مشہور یہ ہیں۔

تہذیب[1] الکمال۔ تہذیب[2] التہذیب، لسان[3] المیزان۔ تقریب[4]۔ تاریخ کبیر بخاری[5]۔ تاریخ صغیر بخاری[6] (چھپ گئی) ثقات ابن حبان[7] (قلمی) تذکرۃ الحفاظ[8]۔ مشتبہ النسبہ[9] (قلمی) انساب[10] سمعانی تہذیب[11] الاسماء واللغات۔ میزان[12] الاعتدال۔ کتاب[13] الاسماء والکنیٰ"

ظاہر ہے کہ ایک روایت کے تمام راویوں کے متعلق ایک ایک جزئی کو معلوم کرنا سخت مشکل کام تھا لیکن بہ قول علامہ شبلی اس کام کے لئے سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں صرف کر دیں، ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے، جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کئے۔

---

[1] کتب خانہ آصفیہ میں اس کا نسخہ موجود ہے۔ [2] دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن سے شائع ہو گئی۔
[3] دار الکتب المصریہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

راویوں کے مختلف حالات اور بعض دوسرے امور کی وجہ سے ہی احادیث کی متعدد قسمیں قرار دی گئیں اور ان کو صحیح وضعیف وغیرہ پر تقسیم کیا گیا۔ ہم صرف حدیث صحیح کی تعریف بیان کریں گے اور باقی اقسام کا ذکر اسی ضمن میں آجائے گا۔

حدیثِ صحیح | محدثین کے نزدیک صحیح حدیث وہ ہے۔ جس کی اسنادراوی سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو یعنی درمیان میں سے منقطع یا مرسل نہ ہو، اور اس کو ایک ایسے شخص نے نقل کیا ہو جو عادل ہو، ضابط ہو، اور جس میں کسی قسم کا شذوذ یا علت نہ پائی جاتی ہو۔

عدالت | عدالت کی تعریف میں اختلاف ہے۔ چنانچہ علامہ طاہر الجزائری فرماتے ہیں "تمام چیزوں میں سب سے زیادہ مشکل عدالت کو پہچاننا ہے۔" امام غزالی "مستصفیٰ" میں فرماتے ہیں۔ "عدالت ایک ایسا ملکہ ہے جس کے ذریعہ انسان کبائر کے ارتکاب اور صغائر پر اصرار سے اجتناب کرتا ہے۔" بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ عدالت کبائر اور صغائر دونوں سے باز رکھتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ "جس شخص میں مروت اور طاعت غالب ہو وہ عادل ہے۔" ان تعریفوں کی بنا پر ایک وہ شخص جو کوئی ایسی حرکت کرتا ہے جس سے اس کے دین کی رکاکت پر استدلال کیا جا سکتا ہو مثلاً بازار میں کھانا، بازار میں پیشاب کرنا۔ عام لوگوں کے ساتھ ہنسی اور ٹھٹھول کرنا۔ اس کو پایۂ عدالت سے ساقط سمجھا جائے گا۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے سب سے الگ ایک نئی بات کہی ہے وہ فرماتے ہیں:-

"عدالت ہر زمانہ اور مکان میں اور ہر قوم میں اس کے ہی اعتبار سے ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر قوم میں شاہد وہی ہوتا ہے جو اس کے اپنے معیارِ عدالت کے مطابق ہو اسی اعتبار سے لوگوں میں حکم کرنا ممکن ہے ورنہ اگر ہر طائفہ میں شاہدوں کے لئے ادائے واجبات اور ترکِ محرمات کی قید لگا دی جائے تو تمام یا اکثر شہادتیں باطل ہو جائیں۔"[1]

---

[1] توجیہ النظر ص ۲۹۔

Marfat.com

حق یہ ہے کہ امام ہمام نے بہت ہی حکیمانہ اور فیصلہ کن بات کہی ہے۔ آپ کا مقصد یہ ہے کہ عدالت عدالت میں فرق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کسی مقدمہ میں گواہی دینے کے لئے جس عدالت کی ضرورت ہے اس کا معیار اتنا سخت نہیں ہو سکتا جتنا کہ اس عدالت کا، جو روایتِ حدیث کے قبول کے لئے ضروری ہے۔ اب اگر عدالت کے تمام مختلف معیاروں کو سامنے رکھکر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ سب سے زیادہ سخت معیار اس عدالت کا ہے جو راویِ حدیث کے لئے ضروری ہے

اسماعیل بن ابی اویس کہتے ہیں:۔

"میں نے ایک مرتبہ اپنے ماموں امام مالکؒ سے سُنا فرمارہے تھے " میں نے ستّر ایسے آدمیوں سے ملاقات کی ہے جنھوں نے قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلم کہہ کر (مسجد نبوی کے) ان ستونوں کے پاس حدیث بیان کی لیکن میں نے ان کی کوئی حدیث قبول نہیں کی۔ حالانکہ ان میں سے ایک ایک شخص اتنا بڑا امین تھا کہ اگر اس کو بیت المال کا انچارج بنادیا جاتا تو وہ اس کے حق میں امین ہی ثابت ہوتا۔" [۵]

اس ایک واقعہ کی طرح کتب اسماء الرجال میں سینکڑوں واقعات مل سکتے ہیں جن سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ محدثین کے نزدیک عدالت کا جو معیار ہے وہ کس قدر سخت اور اونچا ہے۔

یہاں یہ معلوم کرنا بھی خالی از فائدہ نہ ہو گا کہ محدثین نے راوی کے لئے عدالت کی جو شرط لگائی ہے وہ خود قرآن سے مستنبط ہے ارشادِ گرامی ہے۔

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا الآیہ	اے ایمان والو اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لیکر آئے تو اس کی خوب تحقیق کرو۔

ایک موقع پر ہے۔

وَاَشْھِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْکُمْ۔	اپنے میں سے دو صاحبِ عدل انسانوں کی شہادت پیش کرو

۵؎ توجیہ النظر ص ۲۶۔

عدالت کے اعتبار سے طبقاتِ رواۃ

علامہ جزائری فرماتے ہیں "صحیح یہ ہے کہ ضبط و حفظ کی طرح عدالت بھی زیادتی اور نقصان قوت اور ضعف کو قبول کرتی ہے۔ اسی بنا پر علامہ نجم الدین سلیمان الطوفی نے شرح الاربعین میں بیان کیا ہے کہ روایت کا دارومدار راوی کے عدل و ضبط پر ہے۔ پس جو حضرات ان دونوں وصفوں میں مرتبہ اعلیٰ پر ہوں گے جیسے حضرت شعبہ، سفیان اور یحییٰ بن سعید القطان وغیرہ ان کی حدیث صحیح ہو گی۔ اور اگر راوی عادل و ضابط تو ہے لیکن مرتبۂ اعلیٰ پر نہیں اس کی روایت حسن ہو گی۔ عدالت اور ضبط کے تفاوت کے اعتبار سے رواۃ کو نو طبقات پر تقسیم کیا گیا ہے[۵۱] جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

ضبط

صحتِ حدیث کے لئے دوسری شرط ضبط ہے۔ علامہ سخاوی فرماتے ہیں:-

"ضبط کی دو قسمیں ہیں، ایک ضبط صدر، دوسرے ضبطِ کتاب، ضبطِ صدر یہ ہے کہ راوی نے جو کچھ سُنا ہے وہ سب اس کو اس طرح یاد ہو کہ جب چاہے اسے مستحضر کر سکے۔ اور ضبطِ کتاب یہ ہے کہ جو سُنے اُسے فوراً لکھ لے تاکہ اس میں کسی قسم کے خلل کے پیدا ہونے کا امکان ہی باقی نہ رہے یہ ضبط کی اعلیٰ قسم ہے"[۵۲]

امام ترمذی، علل میں کہتے ہیں۔

"جو شخص حدیث کے معاملہ میں متہم بالکذب ہو اور مغفل ہو اور خطا زیادہ کرتا ہو، اکثر ائمۂ حدیث کے نزدیک ایسے شخص کے لئے یہ بات طے شدہ ہے کہ اس کی روایت پر دھیان نہ دیا جائے"۔ [۵۳]

شذوذ

حدیث صحیح کی تعریف میں تیسری شرط شذوذ سے خالی ہونے کی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ راوی نے جو حدیث روایت کی ہے اس میں کوئی ایسا شخص اس کے مخالف نہ ہو جو اس سے زیادہ قابلِ ترجیح ہو اور اس شذوذ کا تحقق اس وقت ہو گا جبکہ دونوں روایتوں میں جمع کرنا مشکل ہو۔

---

۵۱ توجیہ النظر ص ۳۰ ۵۲ مقدمۂ فتح الملہم ص ۱۵ ۵۳ ایضاً

Marfat.com

علت رہ گئی علت تو اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی امر ایسا نہ پایا جائے جو صحتِ حدیث میں قادح ہو، مثلاً ارسالِ خفی یعنی راوی کا اپنے معاصر سے لفظ عن سے روایت کرنا جس سے یہ شبہ ہو کہ راوی نے اس سے سماع کیا ہے۔ حالانکہ اسے اپنے معاصر مروی عنہ سے بالکل سماع حاصل نہ ہو یا تدلیس یعنی راوی روایت تو کرتا ہے اس شخص سے جس سے اس کو سماع حاصل ہے لیکن نقل وہ روایت کرتا ہے جو اس نے اس سے نہیں سُنی اور اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ گویا اس نے اس روایت کو خود مروی عنہ سے سُنا ہے۔ علت کی دو قسمیں ہیں خفیہ اور ظاہرہ، خفیہ کی مثال اوپر گذر چکی ظاہرہ کی مثال فسق اور سوءِ حفظ وغیرہ ہے۔ [۱]

حَسَن حدیث کی دوسری قسم حسن ہے، اس کی تعریف عموماً یہ کی جاتی ہے کہ اس کا مخرج معلوم ہو اور رجال مشہور ہوں، مخرج معلوم ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ حدیث ایسے راوی سے مروی ہو جو اپنے شہر کے لوگوں سے روایت کرنے میں شہرت رکھتا ہو، مثلاً قتادہ اہلِ بصرہ سے روایت کرنے میں مشہور ہیں۔ پس اگر اہلِ بصرہ کی کوئی حدیث قتادہ سے مروی ہوگی تو کہا جائے گا کہ اس حدیث کا مخرج معلوم ہے۔ اس حدیث کے رواۃ بہ اعتبار ثقاہت صحیح کے رواۃ کے برابر نہیں ہوتے۔ چنانچہ علامہ ابنِ جوزی اس کی تعریف میں فرماتے ہیں "اس حدیث میں کچھ ضعف ہوتا ہے جو احتمال کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن اس پر کسی عمل کی بنیاد رکھنا درست ہے"۔ صحیح اور حسن یہ دونوں حدیثِ مقبول کی قسمیں ہیں۔

اس کے بالمقابل مردود کی تین قسمیں ہیں موضوع، متروک، منکر، اور ضعیف کی جس میں اسناد کے نقص کی وجہ سے ضعف ہوتا ہے چار قسمیں ہیں۔ منقطع، معضل، معلق، مرسل پھر رواۃ کی تعداد کے اعتبار سے حدیث کی دو قسمیں ہیں متواتر اور خبرِ واحد، متواتر کی تعریف یہ ہے کہ اس کو ہر زمانہ میں اتنی کثیر جماعت نے نقل کیا ہو کہ ان سب کا جھوٹ بولنے پر متفق ہو جانا عادۃً محال ہو۔ جس حدیث میں تواتر کی شرطیں نہ پائی جائیں خبرِ واحد کہلاتی ہے اور اس کی متعدد قسمیں ہیں۔

---

[۱] شرح مقدمۂ ابن صلاح ص ۸

Marfat.com

اسناد اور رواۃ کی تعداد اور صفات کے لحاظ سے حدیث کی اتنی قسمیں کرنا دراصل اس بات کی دلیل ہے کہ محدثین نے حدیث کی صحت وسقم معلوم کرنے کے لئے اس کے ایک ایک جزء کا تجزیہ کیا، اسناد کے تمام رواۃ میں سے ایک ایک کو اچھی طرح جرح وتعدیل کی کسوٹی پر پرکھا اور الفاظ ومعانی کے لحاظ سے بھی اس کے تمام پہلوؤں پر عمیق بصیرت کے ساتھ غور وخوض کیا پھر ذرا ذرا سے فرق سے ایک حدیث کو دوسری حدیث سے ممتاز کرتے چلے گئے اور اس طرح حدیث کی بہت ساری قسمیں ہوگئیں۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ محدثین کا جو کارنامہ انتہائی مدح وستائش کا مستحق تھا اور یہ سب اس لئے ہی تھا کہ صحیح حدیث غیر صحیح حدیث سے بالکل ممتاز ہو جائے۔ وہی منکرینِ حدیث کی نظر میں معیوب ومذموم قرار دیا جاتا ہے۔ ایک صاحب لکھتے ہیں۔

"انھوں (محدثین) نے احادیث پر جو احکام لگائے ہیں مثلاً قوی، صحیح حسن، مقبول یا ضعیف، منکر، موضوع اور مردود، ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ ورنہ روایت کی صرف دو ہی صورتیں ہیں، صحیح یا غلط"۔

سبحان اللہ!

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

Marfat.com

امام بخاریؒ

یہاں تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ صحتِ حدیث کے عام معیار کی حیثیت سے تھا۔ اب ہم ان محدثین کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اپنی کتاب میں اس کا التزام کیا ہے کہ وہ اعلیٰ معیار کے مطابق جو حدیث صحیح ہوگی اسی کو نقل کریں گے اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام امام بخاریؒ کا ہے۔

نام ونسب آپ کا نام محمد تھا اور کنیت ابو عبداللہ نسب یہ ہے محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرۃ بن بردزبہ۔ آپ کے اجداد فارس کے رہنے والے مجوسی تھے۔ سب سے پہلے جو شخص ان کے خاندان میں اسلام سے مشرف ہوئے مغیرہ ہیں۔ بخارا کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے۔ امام بخاریؒ کے والد ماجد اسماعیل بن ابراہیم بھی محدث تھے۔ امام ابھی کمسن ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ نے ماں کی آغوشِ کرم میں پرورش پائی۔

حفظِ حدیث دس برس کی عمر ہوئی تو امام بخاریؒ نے حدیث یاد کرنی شروع کی۔ آپ سے پہلے جو محدث تھے وہ اپنے اپنے شہروں کی احادیث جمع کرنے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ امام مالک بن انس نے حجاز اور خصوصاً اہلِ مدینہ کی احادیث جمع کیں۔ ابن جریج نے بھی اہلِ حجاز اور خصوصاً اہلِ مکہ کی ہی حدیثیں جمع کیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ امام بخاریؒ سے پہلے بھی ایسے محدثین تھے جو دور دراز کی مسافتیں طے کرکے گوشہ گوشہ سے حدیث جمع کرتے تھے لیکن امام بخاریؒ نے اس دائرہ کو اور زیادہ وسیع کر دیا تھا۔

طلبِ حدیث میں سفر چنانچہ امام نے اپنے شہر کی احادیث سننے کے بعد بلخ کا سفر کیا اور وہاں کے محدثین سے حدیثوں کی سماعت کی۔ پھر مرو، نیشاپور، رَی، بغداد، بصرہ، کوفہ، مکہ

Marfat.com

مدینہ، مصر، دمشق، قیساریہ، عسقلان، حمص تشریف لے گئے اور ان جگھوں سے احادیث حاصل کیں۔

اس طویل سفر میں آپ نے سولہ برس صرف کئے اس مدت میں آپ نے جو کچھ محنت و مشقت برداشت کی ہوگی اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟

تنقیدِ حدیث

امام بخاریؒ صرف حدیث سننے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ رُواۃ اور الفاظ و معانی کے اعتبار سے اس کی تنقید کرتے تھے۔ اور ایک ایک راوی کے حالات کی تحقیق کے لئے دور دراز ممالک کے کٹھن سفر اختیار کرتے تھے۔ یہ خدا کا بہت بڑا احسان ہے کہ امام بخاریؒ کی کوششیں بارآور ہوئیں۔ اور وہ احادیثِ صحیحہ کو احادیثِ غیر صحیحہ سے متمیز کرنے میں بخوبی کامیاب ہو گئے۔ امام ہمام کی یہ کامیابی دو وصفوں کی رہینِ منت ہے۔

آپ کا پہلا وصف غیر معمولی قوتِ حافظہ ہے وہ خود فرماتے ہیں۔

"مجھ کو ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں اور صحابہ و تابعین جن کی میں نے حدیث لی ہے ان میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ مجھ کو ان کی تاریخ اور جائے پیدائش و وفات اور وطن معلوم نہ ہو اور میں جس کسی صحابی یا تابعی کی کوئی حدیث روایت کرتا ہوں میرے پاس اس کی اصل موجود ہوتی ہے۔"[1]

پھر اس غیر معمولی قوتِ حافظہ کے ساتھ امام بخاری احادیث لکھکر انھیں اور زیادہ محفوظ کر دیتے تھے اور صرف لکھنے پر ہی کفایت نہیں کرتے تھے بلکہ رات کے وسط میں بیدار ہو کر ان کا مطالعہ کرتے اور ان میں غور و خوض کرتے تھے۔

دوسری چیز جو امام بخاری کی مابہ الامتیاز ہے وہ ان کی غیر معمولی مہارتِ تنقید رجال ہے وہ خود فرماتے ہیں:-

"تاریخ میں کوئی ایسا نام نہیں ہے، جس کے متعلق مجھ کو کوئی قصہ معلوم نہ ہو"

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۲ ص ۲۰۸

Marfat.com

ایک مرتبہ اُن کے سامنے ایک حدیث بیان کی گئی جس کے ایک راوی کا نام عطار الکیخارانی تھا۔ کسی نے پوچھا "کیخاران کس جگہ کا نام ہے؟" فرمایا "یہ یمن کے ایک گاؤں کا نام ہے حضرت معاویہؓ نے ان کو صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ساتھ یمن بھیجا تھا۔ وہاں عطار نے ان سے یہ دو حدیثیں سنی تھیں"[1]

امام بخاریؒ ان دو وصفوں میں سب سے ممتاز ہونے کے باعث اپنے عہد کے تمام بڑے محدثین سے اعلیٰ وافضل سمجھے جاتے تھے اور یہ حضرات بھی حدیث کے معاملہ میں امام کے فیصلہ کو ناطق قرار دیتے تھے۔ اسماعیل بن ابی اویس ایک محدث تھے۔ امام بخاریؒ نے ان کے مجموعۂ احادیث سے چند حدیثیں منتخب کر کے الگ کر لیں تو انھوں نے ان کو اپنے لئے الگ لکھ لیا۔ اور پھر ازراہ فخر کہا کرتے تھے "یہ وہ حدیثیں ہیں جو محمد بن اسماعیل نے میرے مجموعۂ احادیث سے منتخب کر لی ہیں"[2]

حجاز، کوفہ، بصرہ، بغداد، شام اور مصر و خراساں ان میں کوئی مقام ایسا نہیں تھا۔ جہاں کے علماء وفضلاء امام عالی مقام کی فضیلت وبرتری کے سامنے سر تسلیم خم اور ان کی بارگاہِ علم وکمال میں عقیدت وارادت کا خراج پیش نہ کرتے ہوں۔ ذٰلك فضل الله يؤتيه من يشآء

تاریخ میں آپ نے التاریخ الکبیر، التاریخ الاوسط، اور التاریخ الصغیر کے نام سے جو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ آپ کی مہارت وامامتِ فن کی شاہد عدل ہیں، ان کے علاوہ ضعیف راویوں کے حالات میں اور علل پر مستقل کتابیں کتاب الضعفاء اور کتاب العلل کے نام سے تصنیف کیں۔ کنیتوں پر آپ کی ایک مستقل کتاب کتاب الکنٰی کے نام سے ہے ان کے ماسوا الادب المفرد، الجامع، الکبیر اور المسند الکبیر بھی آپ کی مشہور تصنیفات ہیں[3]۔ ان میں سے کتاب الضعفاء الصغیر اور التاریخ الصغیر، انوار احمدی پریس الہ آباد میں چھپ گئی ہیں۔ اور التاریخ الکبیر کا ایک حصہ حیدر آباد دکن سے شائع ہوا ہے۔

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۲ ص ۸ [2] ایضاً ج ۲ ص ۱۹ [3] مقدمہ فتح الباری ص ۲۰۴

Marfat.com

الجامع الصحیح | آپ کا سب سے بڑا کارنامہ جس کے احسان سے دنیائے اسلام کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتی، آپ کی کتاب الجامع الصحیح ہے۔ امام بخاریؒ نے سولہ برس کی محنتِ شاقہ میں ملک ملک کی خاک چھان کر گوشہ گوشہ سے احادیثِ صحیحہ کے جو انمول جواہر ریزے فراہم کئے تھے۔ ان میں سے بھی بکمال تحقیق و تدقیق بالکل صحیح احادیث کا انتخاب اپنی صحیح میں جمع کر دیا جس کو بجا طور پر اصح کتابٍ بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔

بعض محدثین نے بخاری کی کسی کسی حدیث پر کلام کیا ہے لیکن مجموعی طور پر اس کو تمام کتبِ حدیث سے زیادہ صحیح اور مستند مانا گیا ہے۔ ابو جعفر کہتے ہیں امام بخاریؒ نے اپنی کتاب ابن مدینی، امام احمد بن حنبل۔ اور یحییٰ بن معین (جن کی جلالتِ شان اور ثقاہت وعدالت میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا) کے سامنے پیش کی تو سب نے متفق ہو کر اس کی صحت کی شہادت دی البتہ صرف چار حدیثیں ایسی تھیں جن کو محلِ نظر و تامل قرار دیا گیا۔ عقیلی کہتے ہیں" ان چار حدیثوں میں بھی قول امام بخاری کا ہی صحیح ہے۔ حاکم ابو احمدؒ کہتے ہیں۔

محمد بن اسماعیل الامام فانہ	محمد بن اسماعیل الامام سب سے پہلے بزرگ ہیں
الذی الف الاصول وبین	جنہوں نے اصول مرتب کئے اور ان کو لوگوں کے سامنے
للناس وکل من عمل بعدہ	بوضاحت بیان کیا۔ جس کسی شخص نے ان کے بعد
فانما اخذہ من کتابہ [1]	کوئی کام کیا ہے اس نے ان کی ہی کتاب سے لیا ہے۔

امام بخاریؒ کی طرح امام مسلم کا مرتبہ بھی احادیثِ صحیحہ کے التزام و تنقید میں بہت بلند ہے لیکن مشہور محدث ابوالحسن الدارقطنی فرماتے ہیں اگر بخاری نہ ہوتے تو مسلم کے لئے ترتیب کتاب کی راہ ہموار نہ ہوتی" پھر فرماتے ہیں" امام مسلمؒ نے بخاری کی کتاب کو ہی اپنے لئے اسوہ بنایا ہے اور اس میں اور احادیث کا اضافہ کر دیا ہے[3]" تاہم حسنِ ترتیب اور طُرق اسناد کی جامعیت کے لحاظ سے مسلم کا جو مقام ہے اس کی تفصیل امام مسلمؒ کے حالات میں آگے آئیگی۔

---

[1] مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۲۰۳ - [2] ایضاً [3] ایضاً

Marfat.com

تعداد احادیث | حافظ ابن حجرؒ کے قول کے مطابق صحیح بخاری کی کل احادیث ۷۳۹۷ سات ہزار تین سو ستانوے ہیں۔ لیکن ان میں مکرر احادیث بھی شامل ہیں۔ البتہ معلقات، متابعات موقوفات اور مقطوعات داخل نہیں ہیں۔ اگر تعلیقات اور متابعات کو بھی شامل کر لیا جائے تو پھر یہ تعداد ۹۰۸۲ تک پہنچ جاتی ہے۔ مکررات کو الگ کرنے کے بعد اگر صرف احادیث متصلة السند کا شمار کیا جائے تو یہ تعداد گھٹ کر ۲۷۶۲ رہ جاتی ہے۔ خود امام بخاری کا ایک بیان ہے کہ "مجھکو ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث یاد ہیں"[1] اس کے باوجود ان کا اپنی صحیح میں صرف دو ہزار سات سو باسٹھ احادیث کا جمع کرنا جس طرح ان کی غایت تحقیق و تنقید کی دلیل ہے اس بات کا بھی بین ثبوت ہے کہ یہ سب حدیثیں زرِ خالص ہیں اور ہم ان کو بے چون و چرا تسلیم کر سکتے ہیں۔

شروط بخاری | اور حقیقت بھی یہی ہے۔ امام بخاری نے حدیث لانے کی جو مخصوص شرطیں متعین کی ہیں ان کے پورا ہو جانے کے بعد پھر کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ امام خلد مقام کی پہلی شرط جس میں ان کے ساتھ امام مسلم بھی شریک ہیں یہ ہے کہ حدیث کی اسناد متصل ہونی چاہیئے یعنی امام بخاری نے اس کو جس راوی سے سنا ہے اس سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کا سلسلہ برابر مربوط ہونا چاہیئے۔ یہ نہ ہو کہ درمیان میں کہیں انقطاع پیدا ہو جائے۔ پھر اس روایت کے جتنے راوی ہیں ان سب کے لئے مسلمان صادق، غیر مدلس و غیر مختلط عدالت و ثقاہت کی تمام صفات کے ساتھ متصف، ضابط اور متحفظ، سلیم الذہن، قلیل الوہم اور صحیح الاعتقاد ہونا ضروری ہے۔ پھر جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، امام بخاری "حدیث کے ہر بڑے امام مثلاً امام زہری و نافع کے تلامذہ کو صحبت شیخ کی مدت و ملازمت اور حفظ و اتقان کے اعتبار سے چند طبقات پر تقسیم کرتے ہیں، یعنی ایک وہ جنھوں نے سفر و حضر میں شیخ کے ساتھ معیت و مصاحبت رکھی ہے اور پھر وہ حفظ و اتقان میں بھی سب سے

[1] تذکرۃ الحفاظ للذہبی تذکرۂ امام بخاری

Marfat.com

نمایاں ہیں۔ دوسرے وہ جو حفظ و اتقان میں تو ایسے ہی مشہور ہیں لیکن ان کو شیخ کی صحبت زیادہ میسر نہ ہو سکی وقس علی ہذا۔ ان مختلف درجات کے محدثین میں سے امام بخاری رح کی شرط یہ ہے کہ راوی درجۂ اول میں سے ہونا چاہیئے۔ درجۂ دوم کے راوی کی روایت بھی وہ لے لیتے ہیں لیکن اصل کے لحاظ سے نہیں بلکہ محض تعلیقاً۔

امام بخاری کی دوسری شرط یہ ہے کہ وہ روایت معنعن کو قبول نہیں کرتے یعنی اگر کوئی راوی اپنے کسی ہمعصر سے روایت کرتا ہے تو امام بخاری کے نزدیک محض ہمعصر ہونا کافی نہیں ہے بلکہ جب تک دونوں کی ملاقات ثابت نہیں ہوگی وہ حدیث قبول نہیں کی جائے گی۔ امام مسلم اس شرط کے خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک معاصرت بھی قبولِ حدیث کے لئے کافی ہے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ روایت معنعنہ کے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اکثر محدثین کا میلانِ خاطر بھی اسی طرف ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک لفظ عن کا استعمال "قال" کی طرح مطلق اجازت اور اتصال کے لئے ہوتا رہا ہے اس لئے جب تک ارسال کا کوئی قوی قرینہ نہ ہو محض عن کی وجہ سے ارسالِ خفی کے شبہ پر روایت کو ترک کر دینا صحیح نہ ہوگا۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ حقیقت خواہ کچھ بھی ہو۔ امام بخاری کا روایت عنعنہ کو قبول نہ کرنا ان کے کمالِ احتیاط و اتقا کی دلیل ہے چنانچہ ایک مرتبہ کسی شخص نے امام بخاری سے ایک حدیث کے متعلق سوال کیا جس میں تدلیس کا گمان ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا "تم کو خیال ہوتا ہے کہ میں تدلیس کرتا ہوں حالانکہ میں نے اسی تدلیس کے شبہ پر ایک شخص کی دس ہزار بلکہ اس سے زائد حدیثیں ترک کر دی ہیں"

امام مسلمؒ

امام بخاری رح کے بعد دوسرا مرتبہ امام مسلم کا ہے۔ آپ عربی الاصل تھے۔ قبیلہ قشیر سے تعلق رکھتے تھے، نام مسلم تھا، کنیت ابوالحسین، نیشاپور آبائی وطن تھا۔ ۲۰۴ھ یا ۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ طلب حدیث میں عراق، حجاز، شام اور مصر کا سفر کیا۔ بغداد بھی

Marfat.com

کئی مرتبہ تشریف لے گئے اور وہاں حدیث کا درس دیا۔ جس زمانہ میں امام بخاری رح نیشاپور میں مقیم تھے امام مسلمؒ نے ان سے بھی استفادہ کیا۔ ۲۶۱ھ میں بمقام نیشاپور وفات پائی۔

امام مسلمؒ کی ہمہ گیر مہارت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے حدیث اور متعلقاتِ حدیث پر کثرت سے کتابیں تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں

المسند الکبیر علی الرجال۔ کتاب الجامع علی الابواب۔ کتاب الاسماء والکنیٰ۔ کتاب التمییز۔ کتاب العلل۔ کتاب الوحدان۔ کتاب الافراد کتاب الاقران۔ کتاب سوالاتہ احمد بن حنبل۔ کتاب حدیث عمرو بن شعیب کتاب مشائخ مالک۔ کتاب مشائخ الثوری۔ کتاب مشائخ شعبہ۔ کتاب من لیس لہ الا راوٍ واحد۔ کتاب المخضرمین۔ کتاب اولاد الصحابۃ۔ کتاب اوھام المحدثین، کتاب الطبقات۔ کتاب افراد الشامیین۔ اور کتاب رواۃ الاعتبار۔[1]

لیکن ان کا سب سے بڑا علمی و دینی کارنامہ صحیح مسلم ہے جس میں انھوں نے غایتِ تحقیق و تدقیق کے ساتھ اپنی شروط کے مطابق منتخب احادیثِ صحیحہ جمع کردی ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ مکرر احادیث سمیت کل احادیث کی تعداد ۷۲۷۵ اور مکررات کے علاوہ تقریباً چار ہزار حدیثیں ہیں۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم کا موازنہ

امام مسلمؒ کی جلالتِ شان اور بزرگی و برتری میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا لیکن بخاری اور صحیح مسلم میں موازنہ و مفاضلہ کے وقت جمہور کا فیصلہ یہ ہے کہ صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر افضلیت ہے اور اس کے وجوہ یہ ہیں۔

---

[1] مقدمۂ فتح الملہم۔ ص ۱۰۰

Marfat.com

(۱) رجالِ مسلم میں سے جن لوگوں کو ضعیف کہا گیا ہے ان کی تعداد بہ نسبت ان رجالِ بخاری کے جن کی تضعیف کی گئی ہے زیادہ ہے۔ بخاری کے کل ایسے راوی ۸۰ ہیں اور مسلم کے ۱۶۰ جن سے صرف امام مسلمؒ نے روایت کی ہے۔

(۲) امام بخاریؒ ایسے ضعیف لوگوں کی روایتیں زیادہ نہیں لیتے صرف ایک دو حدیثیں لے لیتے ہیں۔ امام مسلمؒ نے ایسے لوگوں کی حدیثیں زیادہ تعداد میں لی ہیں۔

(۳) امام بخاری صرف درجۂ اول (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) کے رُواۃ کی حدیثیں لیتے ہیں شاذ و نادر کہیں تعلیقاً درجۂ دوم کے رُواۃ کی حدیثیں بھی نقل کر دیتے ہیں۔

(۴) امام بخاریؒ روایت معنعن پر اس وقت تک متصل السند روایت کا حکم نہیں لگاتے جب تک کہ معنعن اور معنعن عنہ کی ملاقات تاریخی اعتبار سے ثابت نہ ہو۔ اس کے برخلاف امام مسلمؒ روایتِ معنعن پر بھی اتصال کا حکم لگا دیتے ہیں۔ اگر راوی مدلّس نہ ہو۔

یہ وجوہ ہیں جن کے باعث صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ بعض وجوہ سے صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر فوقیت حاصل ہے ان میں ایک بڑی وجہ جیسا کہ حافظ ابنِ حجر اور بعض دوسرے علماء نے لکھی ہے یہ ہے کہ امام مسلم نے ایک حدیث کے جتنے طرق و اسانید انھیں معلوم تھے سب ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں جس سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طالبِ حدیث کو بیک وقت ایک حدیث کے تمام طُرق معلوم ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے لئے حدیث پر حکم لگانا سہل ہو جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگرچہ امام مسلمؒ نے بھی امام بخاریؒ کی طرح اپنی کتاب کو ابوابِ فقہیہ پر مرتب کیا ہے لیکن انھوں نے خود کسی مسئلہ پر حکم لگانے سے اجتناب کیا اور اس باب کے ماتحت صرف احادیث کے جمع کر دینے پر کفایت کی ہے۔

انتقاد بخاری و مسلم یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ بعض محدثین نے صحیح بخاری، اور

صحیح مسلم کی بعض حدیثوں پر جو کلام کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ حدیثیں بالکل ساقط ہیں بلکہ وہ صرف ایک فنّی کلام ہے۔ امام بخاریؒ و مسلمؒ نے اپنی تحقیق میں بعض راویوں کو عدول اور ثقہ سمجھا اور ان کی روایت قبول کرلی۔ اب بعض محدثین مثلاً دارقطنی اور ابن جوزی وغیرہ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ متکلم فیہ ہیں تو ہم کو ان دونوں میں محاکمہ کرنا ہوگا اور چونکہ اکثریت امام بخاریؒ کی طرف ہے اور ان کی غایتِ تحقیق و تدقیق مسلم ہے اس لئے فیصلہ انھیں کے حق میں ہونا چاہئے۔

اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ یہ چند حدیثیں ضعیف ہیں تو ان کے علاوہ وہ تمام احادیث جن کی صحت پر امت کا اتفاق ہے انھیں تو تسلیم کرنا ضروری ہے تضعیفِ حدیث میں اگر ناقدین کا قول صحیح ہو سکتا ہے تو تصحیح کے باب میں بھی ان کا قول معتبر ہوگا۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ ان کے ایک قول کو تسلیم کریں اور دوسرے کو رد کردیں افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔

حافظ ابن حجرؒ بخاری و مسلم کے ناقدوں کی تنقید پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ہر مصنف کو یہ معلوم کرنا چاہئے کہ اگرچہ ان میں سے اکثر احادیث اصل موضوعِ کتاب میں کوئی قدح پیدا نہیں کرتیں کیونکہ جیسا کہ امام ابوعمرو بن الصلاح وغیرہ نے دعوٰی کیا ہے کہ اس کتاب کی تمام احادیث باجماع صحیح ہیں۔ تاہم زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ یہ چند مواضع وہ ہیں جن کی صحت میں نزاع ہے اور ان کو وہ تلقی بالقبول حاصل نہیں ہوئی جو کتاب کے بڑے حصہ کو حاصل ہے[1]"

حافظ ابن تیمیہؒ منہاج السنہ میں فرماتے ہیں:۔

"تصحیح کے باب میں ائمہ حدیث نے بخاری و مسلم کی تقلید نہیں کی ہے

---

[1] مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۸۱۔

بلکہ جن حدیثوں کی تصحیح ان دونوں اماموں نے کی ہے وہ سب کی سب تقریباً بیس حدیثوں کو مستثنیٰ کر کے امام بخاری و مسلم سے پہلے بھی صحیح تھیں ان کے عہد میں بھی صحیح تھیں اور ان کے بعد بھی صحیح رہیں۔ ائمۂ فن نے ان دونوں کتابوں میں بہت غور و خوض کیا اور پھر تصحیح احادیث میں امام بخاری و مسلم سے موافقت کی۔" لہ

لہ امام بخاری و امام مسلم کے علاوہ چار ائمۂ حدیث اور ہیں جن کے مجموعہائے احادیث کو صحاح قرار دیا گیا ہے۔ امام ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور امام ابن ماجہ رحمہم اللہ۔ ان سب بزرگوں کے تراجم باعثِ طوالت ہوتے اور پھر ان چار کتابوں کا مرتبہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کے بعد ہے منکرین حدیث بخاری و مسلم کو ہی مان لیں تو بسا غنیمت ہے۔ اس سبب سے ان بزرگوں کے تراجم ترک کرتا ہوں۔

Marfat.com

اصولِ درایت

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اصول روایت کی نسبت تھا۔ اب ہم تحقیق روایات و واقعات کے دوسرے اصول درایت پر کلام کرتے ہیں جو پہلے اصول روایت کی طرح بڑا اہم اصول ہے۔

جس طرح روایت کا اصول قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔ اصولِ درایت بھی قرآن مجید نے ہی متعین کر دیا تھا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بعض منافقوں نے تہمت لگائی اور اس کا چرچا اس زور و شور سے کیا کہ بعض مسلمان بھی مذبذب ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ	اور جب تم نے اس خبر کو سنا تو یہ کیوں نہیں
مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِھٰذَا	کہدیا کہ ہمیں ایسی بات کبھی مناسب نہیں ہے
سُبْحٰنَكَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِيْمٌ	سبحان اللہ یہ بڑا بہتان ہے۔

اس آیت میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس خبرِ بے بنیاد کو سننے کے بعد تمہیں اس کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہیئے تھا کیونکہ یہ انتہائی نامعقول بات ہونے کے باعث درایتہً بالکل ساقط الاعتبار تھی۔

درایت کی ابتدا عہدِ صحابہ میں

درایت کی ابتدا خود صحابہ کرام کے عہد میں ہو چکی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے ایک حدیث بیان کی جس کا حاصل یہ تھا "کہ آگ سے پکی ہوئی چیز کے کھانے پر وضو کرنا چاہیئے" حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ سنا تو کہا "اگر یہ صحیح ہے تو اس پانی کے پینے سے بھی وضو ٹوٹ جانا چاہیئے" [ل]

ل ترمذی باب الوضوء

Marfat.com

حضرت ابن عباسؓ حضرت ابوہریرہؓ کو ضعیف الروایہ نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ ان کی یہ روایت درایت کے خلاف تھی اس لئے انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا اور یہ سمجھے کہ حضرت ابوہریرہؓ کو سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہے درایت کے اصول میں ایک یہ بھی ہے کہ جو روایت کتاب اللہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی مشہور سنت کے خلاف ہو اُسے قبول نہ کرنا چاہیئے۔ صحابہ کرام کا اس پر بھی تعامل تھا اور وہ ایسی روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے سامنے ایک عورت نے کوئی حدیث بیان کی۔ آپ نے اس کے تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ ہم ایک عورت کے کہنے پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ایک حدیث ہے کہ میت کو اس کے پسماندگان کے نوحہ کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا۔ حضرت عائشہؓ نے یہ حدیث سُنی تو اس کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور فرمایا کہ یہ قرآن مجید کے حکم لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی، اور وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ کے خلاف ہے۔ اسی طرح حدیث معراج میں جو یہ آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رویت باری سے مشرف ہوئے۔ تو حضرت عائشہؓ نے اس کی صحت سے بھی انکار کردیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ۔

ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ نے روایت بیان کی کہ برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اُسے دھولینا چاہیئے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے یہ سُنا تو فرمایا "اچھا پھر برتن کا کیا ہوگا؟" ان دونوں بزرگوں کا مطلب یہ تھا کہ اگر ہاتھ کو دھوئے بغیر پانی میں ڈالدینے سے پانی ناپاک ہوجاتا ہے تو اس کی وجہ سے برتن (مھراس) بھی ناپاک ہوجائے گا اور ظاہر ہے کہ اس میں بڑا حرج ہے۔ پس ایسا حکم ایک اصل رفع الحرج کے خلاف ہے اور اس لئے اس کی صحت پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔

اس سے بھی زیادہ حقیقت افروز ایک اور واقعہ ہے، ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے سامنے بدفالی کے متعلق حضرت ابن عمرؓ کی حدیث نقل کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ

Marfat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو کبھی کبھی اقوالِ جاہلیت بیان فرماتے تھے۔ یعنی ان کی حیثیت محض حکایت کی ہوتی تھی۔ چنانچہ بدفالی کے متعلق بھی ایسا ہی ہے آپ خود یہ حکم کس طرح بیان کر سکتے تھے جبکہ قرآن مجید میں صاف طور پر فرمادیا گیا ہے۔

إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ — تمام حکم اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے[۵۱]۔

درایت کے اصول تدوینِ حدیث کا دور آیا اور اس کی صحت وغیرہ کے اصول وضوابط متعین کئے گئے تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کئے۔ علامہ سمعانی فرماتے ہیں۔

"صحیح کی پہچان صرف یہی نہیں ہے کہ اس کو ثقہ راویوں نے بیان کیا ہو بلکہ فہم معرفت اور کثرتِ سماع اور مذاکرہ سے بھی اس کو پہچانا جاتا ہے۔"

شیخ ابو اسحاق الشیرازی لمعہ میں لکھتے ہیں۔

"وہ امور جن کی وجہ سے اگر کسی خبر کو ثقہ نے بھی بیان کیا ہو تب بھی اُسے رد کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہیں۔

۱۔ جو روایت مقتضیاتِ عقل کے خلاف ہو اس کا باطل ہونا معلوم ہے کیونکہ شرع تو مجوزاتِ عقل کے مطابق ہے نہ کہ اس کے خلاف۔

۲۔ کتاب اللہ کی کسی نص، یا سنتِ متواترہ کے خلاف ہو تو سمجھا جائے گا کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے یا وہ منسوخ ہے۔

۳۔ اجماع کے خلاف ہو۔

۴۔ ایک ہی شخص تنہا کوئی ایسی روایت بیان کرے جس کا علم تمام لوگوں کو ہونا ضروری ہو۔

۵۔ راوی تنہا ایسی روایت بیان کرے جس کو عادۃً اہلِ تواتر کے ذریعہ مروی ہونا چاہئے۔"

---

[۵۱] مزید تفصیل کے لئے دیکھو الموافقات للشاطبی ج ۳ ص ۱۹، ۲۰۔

Marfat.com

فتح المغیث میں ہے کہ حدیث کا موضوع ہونا کبھی الفاظ کی عدمِ فصاحت سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کیونکہ ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب والعجم تھے۔[1]

علامہ ابنِ جوزی نے انھیں اصولِ درایت کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔

قال ابن جوزی وکل حدیث رأیتہ یخالف العقول او یناقض الاصول فاعلم انہ موضوع فلا یتکلف اعتبارہ ای لا تعتبر رواتہ ولا تنظر فی جرحھم او یکون مما یدفعہ الحس والمشاھدۃ او مباینا للنص الکتاب والسنۃ المتواترۃ او الاجماع القطعی حیث لا یقبل شئ من ذلک التاویل او یتضمن الافراط بالوعید الشدید علی الامر الیسیر او بالوعد العظیم علی الفعل الیسیر وھذا الاخیر کثیر موجود فی حدیث القصاص والطرقیۃ ومن رکۃ المعنی لا تاکلوا القرعۃ حتی تذبحوھا ولذا جعل بعضھم ذالک دلیلا علی کذب

ابنِ جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصول کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ من گھڑت ہے اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں، یا غیر معتبر۔ اسی طرح وہ حدیث قابلِ اعتبار نہیں ہے جو حس اور مشاہدہ کے خلاف ہو اور وہ حدیث بھی غیر معتبر ہے جو نص کتاب، سنتِ متواترہ یا اجماعِ قطعی کے خلاف ہو اور پھر کسی قسم کی تاویل کی اس میں گنجائش بھی نہ ہو، یا وہ حدیث جس میں ایک ذرا سی بات پر سخت وعید دی گئی ہو، یا اس کے برعکس معمولی سے فعل پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا گیا ہو، اس قسم کی حدیثیں قصہ گو اور بازاری لوگوں کے کلام میں کثرت سے موجود ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ حدیث بھی ناقابلِ اعتبار ہے جس میں لغویت پائی جائے مثلاً یہ کہ کدو بغیر ذبح نہ کھاؤ۔ اسی کو دیکھ کر بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کا راوی کاذب ہے

[1] یہ معلومات مقدمہ فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ص ۱۶ سے ماخوذ ہیں۔

Marfat.com

راویہ وکل ھذا من القرائن فی المروی وقد تکون فی الراوی کقصۃ غیاث مع المھدی او انفرادہ عمن لم یدرکہ بما لم یوجد عند غیرھما او انفرادہ بشیٔ مع کونہ مما یلزم المکلفین علمہ وقطع العذر فیہ کما قررہ الخطیب فی اول الکفایۃ او بامر جسیم یتوفر الدواعی علی نقلہ کحصر عدو الحاج عن البیت۔[۱]

یہ تمام قرینے تو وہ ہیں جو روایت میں پائے جاتے ہیں، کبھی یہ قرائن راوی میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً غیاث کا واقعہ خلیفہ مہدی کے ساتھ پیش آیا۔ جبکہ کوئی راوی تنہا ایسے شخص سے روایت کرے جس سے ملا بھی نہ ہو، یا تنہا کوئی ایسی بات بیان کرے جس کا علم اور لوگوں کو بھی ہونا ضرور تھا جیسا کہ خطیب نے کفایہ کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے یا وہ واقعہ اتنا اہم ہو کہ اس کے نقل کے اسباب وافر ہوں۔ مثلاً یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے لوگوں کو حج کرنے سے روک دیا۔

بقول علامہ شبلی نعمانی اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسبِ ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں؟۔

(۱) جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

(۲) جو روایت اصولِ مسلمہ کے خلاف ہو۔

(۳) محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔

(۴) قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی

۱؎ فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۱۴۔ اصل کتاب میرے سامنے نہیں ہے۔ میں نے یہ عبارت مقدمہ سیرت النبی ص ۳۹، ۴۰ سے لی ہے۔

کچھ گنجائش نہ ہو۔

(۵) جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔

(۶) معمولی کام پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

(۷) وہ روایت رکیک المعنی ہو۔ مثلاً کدو کو بغیر ذبح نہ کھاؤ۔

(۸) جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ کسی اور نے نہیں کی اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو۔

(۹) جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو بایں ہمہ ایک راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو۔

(۱۰) جس روایت میں ایسا قابلِ اعتنار واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا تو سینکڑوں راوی اس کو بیان کرتے۔ اس کے باوجود صرف ایک ہی راوی نے اس کو بیان کیا ہے۔

ملا علی قاریؒ نے موضوعات کے خاتمہ پر حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔[1]

(۱) جس حدیث میں ایسی فضول باتیں ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نہیں نکل سکتیں مثلاً یہ کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے خدا اس کلمہ سے ایک پرند پیدا کرتا ہے جس کی ستر زبانیں ہوتی ہیں اور ہر زبان میں ستر ہزار لغت ہوتے ہیں۔

(۲) وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ بینگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے۔

(۳) جو حدیث صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

(۴) جو حدیث واقعہ کے خلاف ہو، مثلاً یہ کہ دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہئے کہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے (اگرچہ تجربہ کی رو سے یہ مضمون درست ہے)۔

---

[1] یہ پورا خلاصہ مقدمۂ سیرت النبی سے ماخوذ ہے۔

Marfat.com

(۵) جو حدیث انبیاءِ کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو مثلاً یہ حدیث کہ تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں، سبزہ زار، آبِ رواں اور خوبصورت چہرہ کا دیکھنا

(۶) وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیش گوئی بقیدِ تاریخ مذکور ہو مثلاً یہ کہ فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا۔

(۷) وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے زیادہ مشابہ ہوں۔ مثلاً یہ کہ ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے یا یہ کہ مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے۔

(۸) وہ حدیثیں جن کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں۔ مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز تھا۔

(۹) وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو۔ مثلاً یہ کہ دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہوگی اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو ہر شخص بتادے گا کہ قیامت کب آئے گی حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے۔

(۱۰) بعض وہ حدیثیں جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

(۱۱) جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔

(۱۲) بعض وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں۔

صاحب کشف الاسرار نے بھی قریب قریب یہی لکھا ہے۔

"خبر واحد اگر مقتضیٔ عقل کے خلاف ہو تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس میں بغیر کسی تکلفِ بارِد کے تاویل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اگر تاویل صحیح ہو سکے تو اس خبر کو قبول کر لینا چاہیے ورنہ اسے رد کر دینا چاہیے۔ اسی طرح جو خبر، نص کتاب، سنتِ متواترہ یا اجماع کے خلاف ہو تو اسے بھی رد کر دینا ضروری ہے کیونکہ یہ تمام دلیلیں قطعی ہیں اور خبر واحد ظنی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قطعی اور ظنی میں کوئی تعارض نہیں ہوتا بلکہ قطعی کے مقابلہ میں ظنی ساقط ہو جاتا ہے۔" [۱]

[۱] مقدمہ فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ص ۱۸۔

Marfat.com

ان اصول کی بنا پر ہر زمانہ میں روایت پر تنقید کی گئی ہے۔ حافظ ابنِ حجر روایتِ معراج کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ثابت کی روایت میں جو فَرَبَطْتُہٗ بِالْحَلْقَۃِ "میں نے براق کو حلقہ سے باندھ دیا" آیا ہے تو حضرت حذیفہ اس کی صحت سے انکار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براق کو اس لئے باندھ دیا تھا کہ اس کے بھاگ جانے کا اندیشہ تھا؟ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ اللہ نے اس وقت آپ کے لئے عالمِ غیب و شہادت کو مسخر کر دیا تھا۔

اسماعیلی بخاری کی روایت جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے والد آزر سے قیامت کے دن اس حال میں ملیں گے کہ آزر کے چہرہ پر تارکول ملا ہوا ہوگا۔" نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس خبر کی صحت میں نظر ہے اور دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ پس جب اللہ تعالیٰ ان سے وعدہ کر چکا ہے کہ وہ قیامت کے دن ان کے باپ آزر کو رسوا نہیں کرے گا تو پھر اس کے خلاف کس طرح کر سکتا ہے۔"

حافظ ابنِ حجر حدیث ابی ہریرہؓ

خلق اللہ اٰدم وطولہٗ	اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا اور
ستون ذراعا	ان کا طول ساٹھ گز تھا۔

کے متعلق کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "امم گذشتہ کے جو آثار ثمود کے دیار کی طرح مٹے ہوئے پائے جاتے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قدو قامت ترتیبِ سابق کے اقتضاء کے مطابق بہت زیادہ طویل نہیں تھے۔ حالانکہ ان کا زمانہ بھی بہت قدیم ہے۔ اور جو زمانہ قومِ ثمود اور حضرت آدمؑ کے درمیان ہے وہ اس زمانہ سے کم ہے جو قومِ ثمود اور امتِ مسلمہ کے شروع زمانہ کے درمیان ہے۔ اب تک مجھکو اس اشکال کا حل معلوم نہیں ہوا۔" [1]

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۲۸۲ طبع جدید

Marfat.com

اس تقریر سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ محدثین نے تحقیق کے دونوں اصول روایت اور درایت دونوں کی تعیین و تشخیص میں اور ان پر عمل کرنے میں یکساں اہتمام کیا۔ اور تنقیدِ روایات میں دونوں سے کام لیا ہے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ بعض خاص خاص محدثین دارقطنی وغیرہ نے اسناد پر زیادہ زور دیا ہے اور حدیث کے متن کی طرف اتنا اعتنا نہیں کیا لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محدثین یہ سمجھتے تھے کہ اصولِ درایت ہر شخص کو معلوم ہو سکتے ہیں جو قرآن اور اجماع سے واقف ہو اور عقلِ سلیم رکھتا ہو۔ صرف ایک اسناد کا فن ہی ایسا دقیق اور مشکل ہے کہ محدثین کے سوا دوسروں کو اس کا علم نہیں ہوتا۔

اب روایت اور درایت کے ان اصولوں کو اور محدثین نے ان کی تحقیق و تاکید میں جو کوششیں کی ہیں ان سب پر غور کرو اور بتاؤ کیا کسی روایت کی توثیق و تصدیق کے لئے اس سے بلند کوئی اور معیار ہو سکتا ہے؟ کیا دنیا کی تاریخ میں کوئی ایک قوم بھی ایسی ہے جس نے اسناد اور متن کے ہر ممکن سے ممکن پہلو کو سامنے رکھکر اس کی چھان بین میں انسانی کوشش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ہو؟ اسناد میں عقلی اعتبار سے جتنے احتمالات ہو سکتے ہیں ان سب پر ان بزرگوں نے مبصرانہ نگاہ ڈالی اور احتیاط کا یہ عالم کہ جہاں کذب کا ذرا سا شائبہ بھی نظر آیا اُسے فوراً ترک کر دیا۔ اسی طرح متنِ حدیث کی صحت معلوم کرنے کی غرض سے محدثین نے درایت کے اصول متعین کئے۔ لفظ۔ معنی۔ عبارت اور طرزِ بیان ہر ہر لحاظ سے اس کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا۔ صحیح، ضعیف اور موضوع، ان کے الگ الگ خصائص بیان کئے، ان کے اوصاف متعین کئے اور تمام ذخیرہ ہائے حدیث کو کنگھال کر ہر ہر حدیث پر حکم لگایا اور ایک نوع کو دوسرے سے الگ کر دیا۔

امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، اور ابن ماجہ وغیرہم رحمہم اللہ اجمعین نے جس طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر صحیح احادیث جمع کیں اور ان کو مرتب کر کے شائع کیا۔ اسی[1] طرح بعض

---

[1] چنانچہ امام بخاریؒ۔ امام نسائیؒ۔ امام صغانی۔ امام مسلم۔ علامہ ابن جوزی نے کتاب الضعفاء (باقی حاشیہ ص ۱۸۰ پر)

Marfat.com

محدثین نے موضوع حدیثوں کو جمع کیا اور ان کو کتاب کی شکل میں ترتیب دیا۔ تاکہ بحکم وبضدھا تتبین الاشیاء رات کو دیکھکر لوگوں کو دن کی پہچان ہو جائے۔ پھر رُواۃ پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں ایک ایک راویِ حدیث کے حالات بکمال دقیق النظری تحقیق و تفتیش کرنے کے بعد لکھے گئے۔ یہاں تک کہ اب ایک راوی بھی ایسا نہیں ہے جس پر محدثین نے کلام نہ کیا ہو۔ پھر جو ثقہ راوی تھے ان پر الگ اور جو ضعیف تھے ان پر الگ اور جو مدلّس یا وضّاعین وکذّابین تھے ان پر الگ ضخیم ضخیم کتابیں لکھیں، سب کے چہروں سے نقاب اٹھا کر اصل حقیقت کو بے حجاب کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ایک دوسرے سے اس طرح متمیز کر دیا کہ آج صاحبِ چشم بصیرت بے تکلف دونوں میں خطِ امتیاز کھینچ سکتا ہے۔

علامہ ابنِ قتیبہ نے اپنی کتاب تاویل مختلف الحدیث کے شروع میں متکلمین کے وہ اعتراضات نقل کئے ہیں جو وہ محدثین پر کرتے ہیں۔ محدثین کی طرف سے ان اعتراضات کا جواب دینے کے بعد لکھتے ہیں۔

"اصحابِ حدیث نے حق اس کی اپنی جگہ سے طلب کرنا چاہا ہے اور ان کی خواہش یہ رہی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن کا اتباع کر کے اللہ کا تقرب حاصل کریں۔ محدثین سنن معلوم کرنے کے بعد برابر ان کی تحقیق و تفتیش اور چھان بین میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے ان کے صحیح اور سقیم میں، ناسخ اور منسوخ میں پوری بصیرت کے ساتھ امتیاز کر لیا۔ اور فقہاء میں سے جو ارباب رائے سنن کے خلاف تھے ان کو بھی انھوں نے پہچان لیا اور لوگوں کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۹) یا موضوعات کے نام سے کتابیں لکھیں (کشف الظنون ج ۲ ص ۱۸۴) ان کے علاوہ ملا علی قاری نے موضوعات اور علامہ محمد طاہر بن علی نے تذکرۃ الموضوعات لکھی جس کے ذیل میں قانون الموضوعات والضعفاء بھی ہے۔

Marfat.com

اس پر متنبہ کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق ظاہر ہوگیا جبکہ وہ مٹنے کے قریب تھا اور وہ لہلہانے لگا۔ جبکہ اس پر پژمردگی کا غلبہ ہو چلا تھا اور سنن کے وہ لوگ بھی مطیع ہوگئے جو اُن سے انحراف کرتے تھے اور جو پہلے ان سے غفلت برتتے تھے۔ ان میں اب بیداری پیدا ہوگئی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوالِ طیبہ کے مطابق احکام صادر ہونے لگے جبکہ فلاں فلاں لوگوں کے انتساب سے حکم دیا جاتا تھا۔

محدثینِ کرام نے اپنی عمریں صرف کر کے طرح طرح کے مصائب و آلام برداشت کر کے صحیح و غیر صحیح دونوں قسم کی احادیث مرتب کردی ہیں، ان کے مجموعے آج ہمارے سامنے موجود ہیں، تنقید کے اصول الگ ہم کو بتادئے گئے ہیں۔ آج اگر کوئی حدیث آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو بے شک آپ کو حق ہے کہ اصول کی روشنی میں اس پر کلام کریں جس طرح زمانہ سلف کے محدثین و ناقدین نے کیا تھا۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ اپنی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے بیک جنبشِ قلم محدثین کی سالہا سال کی محنتوں اور جانکاہیوں پر خطِ نسخ کھینچ دیں جن کی کوششیں آج اصل دین کی حفاظت و بقا کی کفیل ہیں اور جن کو ہر زمانہ میں قبولِ عام حاصل رہا ہے۔ بازار میں بے ایمانی اور مکاری و فریب دہی کے عام ہو جانے کی وجہ سے اگر خالص گھی اور دودھ کا ملنا کمیاب ہوگیا ہے تو یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ آپ سرے سے گھی اور دودھ کا استعمال ہی ترک کردیں۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ بدن میں طاقت پیدا کرنے کے لئے ان دونوں کا استعمال ازبس ضروری ہے اور ہر چند مخلص و نیک نیت اور ایماندار دکاندار ایسے بھی ہیں جو خالص گھی اور دودھ فراہم کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

صحابۂ کرامؓ کی سیرت سے متعلق جو روایات ہیں۔ اگر وہ تاریخی اعتبار سے صحیح ہیں، (اور غالباً اس سے انکار منکرینِ حدیث کو بھی نہیں ہے) تو ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی

Marfat.com

کیا وجہ ہے کہ وضاعین وکذابین کی وجہ سے اگرچہ صحابۂ کرامؓ روایات کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط کرتے تھے لیکن یہ انھوں نے نہیں کیا کہ وضعِ حدیث کے خوف سے روایت کا قبول کرنا ہی مطلقاً ترک کر دیا ہو۔

اسی طرح علامہ ابنِ جوزی وغیرہ نے بخاری تک کی بعض حدیثوں کی تضعیف کی۔ لیکن یہ انھوں نے بھی نہیں فرمایا کہ جب بخاری ایسی صحیح اور مستند کتاب میں بعض ضعیف حدیثیں درج ہو گئی ہیں تو اب اس کا اور کسی اور کتابِ حدیث کا اعتبار باقی نہیں رہا۔ اس لئے حدیث کو ہی تسلیم نہ کرنا چاہیئے۔

کیا عجب تماشا ہے کہ آج منکرینِ حدیث انکارِ حدیث کے لئے استدلال کرتے ہیں تو اس میں محدثین کے ہی بنائے ہوئے اصول سے کام لیتے ہیں۔ انھیں کے بنائے ہوئے ضعیف راوی کو ضعیف اور وضاع کو وضاع کہتے ہیں۔ مثلاً ایک دو حدیثیں پیش کر کے وہ کہتے ہیں کہ دیکھئے یہ قرآن کے خلاف ہیں۔ اس لئے ناقابلِ اعتبار ہیں۔ ہم کہتے ہیں یہ آپ نے نئی بات کیا کہی؟ یہ تو خود محدثین اصولِ درایت کے سلسلہ میں بیان کر چکے ہیں کہ جو حدیث نصِ کتاب اور سنتِ متواترہ کے خلاف ہو اُسے رد کر دینا چاہیئے۔ بس ضرورت اس کی ہے کہ آپ ان دو حدیثوں کا نصِ کتاب کے مخالف ہونا ثابت کر دیں۔ اگر آپ اس میں کامیاب ہو گئے تو ہم بھی آپ کے ہمنوا ہو کر کہیں گے کہ بے شبہ ان حدیثوں کو قبول نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اس سے زیادہ یہی تو لازم آیا کہ یہ دو ایک حدیثیں قرآنی نص کے مخالف ہونے کی وجہ سے مسترد ہو گئیں اس سے یہ نتیجہ کس طرح لازم آگیا کہ ان دو ایک حدیثوں کی وجہ سے پورا ذخیرۂ احادیث ہی ناقابلِ اعتبار قرار پا جائے۔

منکرینِ حدیث کو غور کرنا چاہئے کہ اگر وہ کسی ضعیف راوی کو ضعیف۔ کسی وضاع کو وضاع کہنے میں محدثین کی رہنمائی کے محتاج ہیں اور انھیں کے قول پر اعتماد کرنے پر مجبور ہیں تو پھر اس چیز میں ان کے اقوال کو معتبر ماننا اور حکمِ حدیث میں ان کو ناقابلِ اعتبار قرار دینا

Marfat.com

حد درجہ کی ناانصافی اور زیغِ قلب کی دلیل نہیں تو کیا ہے؟ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب۔

سوال یہ ہے کہ آپ کو آج اس کا یقین کیونکر آیا کہ لوگ وضعِ حدیث کرتے تھے؟ محض محدثین و اربابِ تاریخ کے کہنے سے! پس اگر آپ ان کے اس قول کو صحیح مانتے ہیں تو جب وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اسے درست تسلیم کیوں نہیں کرتے۔

ظنیتِ حدیث اس موقع پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ منکرینِ حدیث عموماً یہ کہتے ہیں کہ محدثین کی تصریح کے مطابق اخبارِ آحاد مفیدِ ظن ہیں یعنی ان سے یقین حاصل نہیں ہوتا اور قرآن مجید میں بحکم اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا ظن کے قبول کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، اس لئے احادیث ناقابلِ قبول ہیں۔

اس دلیل کے جواب میں حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانی شارح صحیح مسلم نے مقدمہ فتح الملہم میں بہت واضح تقریر کی ہے۔ ہم اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

مشہور یہ ہے کہ اخبارِ آحاد قرائن سے مجرد ہوں تو ظن کا فائدہ دیتے ہیں اور متواتر علم یقین کا۔ اب ہم ظن کے معنی کی تشریح کرتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔

ظن اس کیفیت کا نام ہے جو کسی علامت سے حاصل ہو۔ یہی کیفیت قوی ہو جاتی ہے تو علم بن جاتی ہے اور جب حد سے زیادہ ضعیف ہو جاتی ہے تو توہم کی حد سے متجاوز نہیں ہوتی۔ پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ اور نیز یظنون انھم ملاقوا اللہ ان دونوں میں ظن بمعنی یقین ہے۔ اس کے برخلاف ان آیتوں

اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ	وہ لوگ جنہوں نے اس میں اختلاف کیا ہے
لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مَا لَھُمْ	وہ بے شبہ اس کے متعلق شک و شبہ میں پڑے

بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ — ہیں۔ ان کو اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ بجز ظن کی پیروی کے اور کچھ نہیں۔

اور وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوْنَا — تم اللہ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرتے ہو

اور وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا۔ — ظن حق کا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

یہیں ظن سے مراد وہ اوہام ہیں جو کسی صحیح دلیل کے بغیر پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن مجید سے ظن کے معنی کی اس تعیین و تشخیص کے بعد اب دیکھنا چاہیئے کہ محدثین کے نزدیک ظن سے مراد کیا ہوتی ہے۔

پس ظن جس کا فائدہ خبر واحد دیتی ہے وہ کیفیت قوی راجح ہے جو قریب بہ یقین ہو، نہ وہ ضعیف مرجوح جو حد توہم سے متجاوز نہیں ہوتی۔ اور ظن بمعنی اول علم کی ایک نوع ہے جس پر اکثر احکام دینی و معاملاتِ دنیوی کا دارومدار ہے۔ لیکن یہ لفظ مختلف معانی میں مشترک ہونے اور وہم کے معنی میں شائع ہوجانے کی وجہ سے اکثر اشتباہ والتباس کا باعث بن جاتا ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس سے احتراز کیا جائے اور اس قسم کے مقامات میں اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

امام فخر الاسلام نے اسی وجہ سے خوب کہا ہے کہ متواتر سے علم یقین اور مشہور سے علم الطمانیت پیدا ہوتا ہے اور خبر واحد سے علم غالب الرائے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی بناء پر جو شخص اخبار آحاد پر عمل پیرا ہوتا ہے گویا وہ اس چیز کی پیروی کرتا ہے جس کا اسے علم حاصل ہے۔ اس کو ہم اتباعِ ظن جو مذموم ہے نہیں کہہ سکتے۔ خبرِ واحد کا قبول کرنا واضح ضرورتوں میں سے ہے۔ جس سے انکار بجز ایک منکر مکابر کے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ ہم شب و روز

اپنے معاملات میں اس پر عمل کرتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر مسئلہ اور ہر واقعہ میں ہر خبر واحد کے قبول کرنے کی حیثیت بالکل یکساں ہوتی ہے بلکہ وجدان صحیح اخبار کے باہمی فروق و مراتب کا خود بخود حکم کر دیتا ہے۔ فرض کیجیے، ایک شخص کہتا ہے کہ فلاں صاحب آپ کو بلاتے ہیں تو آپ کو یہ سُنکر تردد نہیں ہوتا اور اس بات کا یقین آجاتا ہے۔ لیکن اگر یہی شخص آپ سے کہے کہ آپ کو بادشاہ نے اپنی محفل میں بلایا ہے تو اس خبر کو سُن کر آپ کے دل میں اختلاج وانقباض پیدا ہو جاتا ہے اور انشراحِ صدر اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ قرائن وشواہد سے اس کی تائید نہیں ہو جاتی۔ یہی مراد ہے ان لوگوں کی جو کہتے ہیں کہ شہادت بہ قدر دعوی اور دلیل بمرتبۂ مدلول ہونی چاہیئے۔ ہمارے علمار محدثین کا تعامل اسی پر ہے۔[۱] الخ

اس تقریر پر ہم اتنا اضافہ اور کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں واقعۂ افک کے بارہ میں ہے۔

لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ	تم لوگوں نے جب یہ خبر سنی تھی تو مومن
الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ	مردوں اور عورتوں نے کیوں اچھی بات
بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا۔	کا ظن نہیں کیا۔

اس آیت سے جہاں یہ معلوم ہوتی ہے کہ ظن احتمالِ مرجوح کے معنی میں نہیں آتا بلکہ وثوق کے ساتھ کسی شے کے جاننے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی شے کے متعلق گمانِ غالب پیدا کرنے کے لئے قرائن و آثار موجود ہوں جیسا کہ واقعۂ افک میں حضرت عائشہ رض کی عصمت مآبی و پاک دامانی کا گمان غالب پیدا کرنے کے لئے قرائن موجود تھے تو ہمیں اس پر وثوق اور بھروسہ کر لینا چاہیئے اور اگر ہم قرائن کی شہادت کے

---

[۱] مقدمۂ فتح الملہم ص ۸۔

Marfat.com

باوجود ایسا نہیں کریں گے تو اس پر ہم سے ایسا ہی مواخذہ ہوگا جیسا کہ آیتِ بالا میں منافقین کی اڑائی ہوئی خبر کو سُنکر حضرت عائشہؓ کے معاملہ میں مذبذب ہو جانے والے مسلمان مردوں اور عورتوں سے ہوا۔

ظن کے معنی کی اس تحقیق و تنقیح کے بعد یہ مسئلہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ احادیث سے جو فائدہ ظن حاصل ہوتا ہے اس کی بنا پر حدیثیں کس حد تک قابلِ عمل ہیں اور ان سے احکام کے استنباط میں اور قرآن مجید کی مختلف الاحتمالات آیات کے معانی کی تعیین میں کس حد تک مدد لی جاسکتی ہے۔

فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ

Marfat.com

محدثین کی بے لوث خدمات علم و مذہب

بعض لوگ حدیث کی بے اعتباری ثابت کرنے کے لئے یہ بھی کہتے ہیں کہ حدیث کی تدوین چونکہ خلفائے بنی امیہ اور خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں ہوئی ہے۔ اور بعض ائمہ حدیث مثلاً امام زہری خلفاء سے راہ ورسم رکھتے تھے اس لئے حدیث کا ذخیرہ وقت کے عام سیاسی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکا۔

اب آیئے تاریخ کی روشنی میں یہ دیکھیں کہ یہ بدگمانی کہاں تک صحیح ہے؟ یہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ خلفائے بنی امیہ سیاسی حیثیت سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سخت مخالف تھے اور اسی طرح خلفائے بنی عباس حضرتِ معاویہؓ کو اپنا زبردست سیاسی حریف سمجھتے تھے۔ اس بناء پر اگر محدثین نے ان خلفاء کی جنبہ داری کی ہوتی تو بنوامیہ کے عہد میں حدیثوں کا دفتر حضرت معاویہؓ کے مناقب اور حضرت علیؓ کے مثالب سے مملو نظر آتا اور پھر خلفائے عباسیہ اپنے عہد میں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کی منقبت میں اور حضرت معاویہؓ کی مذمت میں کثرت سے حدیثیں روایت کرواتے لیکن ذخیرۂ احادیث کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی حدیثوں سے دفتر احادیث خالی ہے۔ اور مناقب صحابہ کے ذیل میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے فضائل بیان بھی کئے گئے ہیں تو ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ انھیں کی کیا خصوصیت ہے اور صحابہ کے فضائل بھی مذکور ہیں اور کہیں کسی کتاب میں اگر اس قسم کی کوئی حدیث ہے بھی جس سے بیجا حمایت کی بو آتی ہو تو اسے محدثین نے موضوع بتا کر ساقط الاعتبار قرار دیدیا ہے۔

پھر محدثین کے واقعاتِ زندگی دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ گدایانِ سکندر دل کس استغنا کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور بے لوث و بے غرض ہونے کی وجہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر

Marfat.com

ہیں بڑے سے بڑے جابر و ظالم بادشاہ کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ علم و بصیرت کی روشنی میں جو بات انھیں حق معلوم ہوتی تھی اسے برملا کہتے تھے اور جان و مال، عزت و آبرو کسی چیز کا خیال اعلانِ حق سے انھیں باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ خلفاء سے راہ و رسم رکھنے میں امام زہریؒ اور امام مالکؒ کا نام زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کا بھی حال یہ تھا کہ حق کے معاملہ میں خلیفہ کی رضا جوئی کی ذرا پرواہ نہیں کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ولید بن عبد الملک نے امام زہریؒ سے کہا کیا تم کو یہ روایت پہنچی ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی ان میں علیؓ بھی داخل تھے؟ امام زہریؒ نے فرمایا "نہیں" البتہ تمہاری قوم کے دو آدمی یعنی ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن اور ابوبکر بن عبد الرحمٰن بن حارث نے مجھ سے روایت کی کہ حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا کہ علیؓ اس الزام سے بری تھے۔

ایک روایت میں ہے کہ ہشام بن عبد الملک کا خیال تھا کہ قرآن مجید میں حضرت عائشہؓ کے واقعۂ افک کے سلسلہ میں جو

وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ مِنْھُمْ	جس نے ان میں سے اس الزام میں بڑا حصہ لیا
لَہٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔	ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

فرمایا گیا ہے تو اس سے مراد حضرت علیؓ ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ سلیمان بن یسار ہشام کے پاس آئے تو اس نے پوچھا والذی تولی کبرہ سے کون مراد ہے؟ وہ بولے "عبد اللہ بن ابی" ہشام بولا "جھوٹ کہتے ہو وہ علیؓ ہیں" انھوں نے کہا "امیر المومنین جو کچھ کہتے ہیں وہی اس کو خوب جانتے ہیں پھر زہریؒ آئے تو ان سے بھی یہی سوال کیا اور انھوں نے وہی جواب دیا جو سلیمان بن یسار نے دیا تھا اس نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو وہ علیؓ ہیں۔ انھوں نے کہا "میں جھوٹ کہونگا؟ تمہارے باپ نہ ہو اگر آسمان سے ایک مناد۔ پکارے کہ خدا نے جھوٹ جائز کر دیا میں تب بھی جھوٹ نہ بولوں گا۔ مجھ سے عروہ، سعید عبد اللہ اور علقمہ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ وہ عبد اللہ بن ابی تھا۔ اس واقعہ کے اخیر میں ہے کہ ہشام نے کہا "ہم نے اس بڈھے کو غصہ دلا دیا۔[1]

[1] فتح الباری ج ۷، ص ۲۳۶، ۲۳۷ طبع قدیم

Marfat.com

اسی قسم کا بلکہ اس سے زیادہ صاف واقعہ حضرت اعمش کا ہے۔ ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک نے ان کو لکھا کہ آپ حضرت عثمانؓ کے فضائل اور حضرت علیؓ کے معائب قلمبند کر لیجئے انھوں نے خط بکری کے منہ میں ڈالدیا جواس کو چبا گئی، پھر قاصد سے کہا جا کر کہدینا یہی تمہارا جواب ہے۔ قاصد بولا "خلیفہ نے قسم کھائی ہے اگر میں جواب لیکر نہ پہنچا تو وہ مجھ کو قتل کر دے گا" یہ سنکر حضرت اعمش نے مجبوراً جواب لکھا "اے امیرالمومنین اگر حضرت عثمانؓ میں تمام دنیا کی خوبیاں ہوں تو وہ تمہارے لئے مفید نہیں اور اگر حضرت علیؓ میں تمام جہان کی برائیاں ہوں تو وہ نقصان رساں نہیں صرف اپنی ہی ذات کا خیال رکھو۔"[۱]

حجاج بن محمد بن یوسف ثقفی ظلم وستم کی دنیا کا نمایاں ہیرو ہے، ایک مرتبہ اس کے سامنے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا تو اس نے کہا "وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریات میں داخل نہ تھے۔ اس مجلس میں یحیی بن یعمر موجود تھے انھوں نے کہا "اے امیر تو جھوٹ بولتا ہے۔" بولا "اس پر قرآن سے دلیل لاؤ ورنہ میں تم کو قتل کردوں گا انھوں نے یہ آیت پڑھی۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ	انھیں کی نسل میں سے داؤد، سلیمان
وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَ	ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون ہیں۔
هٰرُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى	اور ہم نیک کام کرنے والوں کو ایسا ہی صلہ
الْمُحْسِنِيْنَ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَ	دیتے ہیں اور ایسے ہی ہیں زکریا، یحیی، عیسیٰ
عِيْسٰى وَاِلْيَاسَ۔	اور الیاس علیہم السلام ہیں۔

اور پھر کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام ماں کے ذریعہ سے حضرت آدمؑ کی نسل میں داخل ہیں۔ پس اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی ماں کے واسطہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت میں داخل ہیں۔ حجاج بولا "تم کہتے تو سچ ہو لیکن یہ بتاؤ تم نے میری مجلس میں مجھ کو کیوں جھٹلایا" فرمایا اس معاہدہ خداوندی کی وجہ سے۔

[۱] ابن خلکان ج ۲ ص ۲۱۳ و ۲۱۴

Marfat.com

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ	اور جب اللہ نے اہل کتاب سے یہ وعدہ لیا کہ
أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ	وہ کتاب کو لوگوں کے سامنے بیان کریں گے
وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ	اور اس کو چھپائیں گے نہیں ان لوگوں نے
ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا	اس قول وقرار کو پس پشت ڈال دیا۔

حجاج اس حق گوئی کی تاب نہ لا سکا اور حضرت یحییٰ بن لعیمر کو خراساں کی طرف جلا وطن کر دیا[1]۔

امام اوزاعی شام کے امام تھے وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب سفاح کا چچا عبداللہ بن علی شام میں آیا تو اس نے ایک دربار منعقد کیا اور اس میں مجھ کو بلایا۔ میں وہاں پہنچا تو سواری سے اتار لیا گیا اور دو آدمیوں نے میرے بازو پکڑ کر مجھ کو ایسے مقام پر کھڑا کر دیا جہاں سے وہ میرا کلام سن سکے۔ اب اس نے پوچھا "عبدالرحمٰن بن عمرو الاوزاعی تمہارا ہی نام ہے؟" میں نے کہا، "اللہ امیر کی اصلاح کرے، یہ میرا ہی نام ہے" بولا "بنو امیہ کی خونریزی کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا "تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ تھا۔ اس لئے مناسب یہ تھا کہ تم اس کو پورا کرتے" وہ بولا "ہمارے اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں تھا۔ اوزاعی فرماتے ہیں۔ اس وقت میرا دل سراسیمہ ہو گیا۔ لیکن قیامت کے دن خدا کے خوف کا تصور کیا تو یہ ڈر اور اضطراب جاتا رہا، اس لئے میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ بنو امیہ کا خون تم پر حرام تھا وہ یہ سن کر اس قدر برہم ہوا کہ آنکھیں نکل آئیں اور گردن کی رگیں پھول گئیں، کہنے لگا "خدا تم پر رحم کرے تم نے ایسا کیونکر کہا" میں نے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کسی مسلمان کا خون اس وقت تک جائز نہیں جب تک تین حالتوں میں سے ایک حالت پیش نہ آئے، یا تو اس نے شادی شدہ ہونے کی حالت میں زنا کیا ہو، یا کسی کو قتل کر دیا ہو یا وہ مرتد ہو گیا ہو" عبداللہ بن علی نے کہا "کیا ہماری حکومت دینی نہیں ہے؟" میں نے کہا کیونکر؟ کہنے لگا "کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے لئے وصیت نہیں کی تھی"، میں نے کہا "اگر وصیت

[1] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۷۶۔

کی ہوتی تو دو شخصوں کو حکم نہ بناتے" اس پر وہ مارے غصہ کے آگ بگولا ہو گیا۔ اب مجھے یقین تھا کہ میرا سر قدموں پر گرا چاہتا ہے۔ لیکن اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ان کو نکال دو۔ میں وہاں سے نکل کر تھوڑی دور آیا تھا کہ میرے پاس ایک سوار آیا۔ میں سمجھا یہ میرا سر کاٹنے آیا ہے اس خیال سے میں سواری سے اترا کہ دو رکعت نماز پڑھ لوں۔ اس نے سلام کیا اور کہا کہ امیر نے آپ کے پاس دنانیر بھیجے ہیں، امام ہمام نے یہ دینار قبول تو کر لئے لیکن فیاضی اور سیر چشمی کا یہ عالم تھا کہ گھر پہنچتے پہنچتے ختم کر دیئے [1]

یہ چند واقعات مشتے نمونہ از خروارے ہیں ورنہ محدثین کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کیجئے آپ کو بے شمار واقعات اسی قسم کے نظر آئیں گے۔ کسی حاکم وقت یا بادشاہ کی استرضا کے لئے حدیثیں وضع کرنا تو بہت بڑی بات ہے۔ کوئی محدث کسی جزئی مسئلہ میں جو رائے رکھتا تھا وہ بادشاہ کی رضامندی کے لئے اس کے اعلان و اظہار سے بھی باز نہیں آتا تھا۔ امام مالکؒ فرماتے تھے "جبری طلاق واقع نہیں ہوتی" منصور نے اس پر ناراض ہو کر ان کو نہایت بے رحمی کے ساتھ ذلیل کیا۔ لیکن امام جنت مقام پھر بھی یہی کہتے رہے" جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں انس کا بیٹا مالک ہوں اور کہتا ہوں کہ طلاقِ مکرہ واقع نہیں ہوتی اور اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ کو دُرّوں سے مارا گیا۔ شدید سے شدید عقوبت دی گئی لیکن وہ بدستور اسی کا اعلان کرتے رہے القرآن کلام اللہ غیر مخلوق تو کیا ائمہ دین جو کہ فقہی مسائل تک میں حکومت کی مخالفت اور جسمانی تکلیف و اذیت کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، ان سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ انھوں نے خود احادیث وضع کی ہوں گی یا احادیثِ موضوعہ کے قبول کرنے میں تساہل و تکاہل سے کام لیا ہو گا؟ سبحانک ھٰذا بھتان عظیم۔

محدثینِ کرام کی یہ جماعت مادی اعتبار سے کتنی ہی بے بضاعت اور بے سروسامان ہو

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۰ و ۱۷۱۔

لیکن حق یہ ہے کہ یہ لوگ گدایانِ دارادل وسکندر دماغ تھے، اپنے ذریعۂ معاش سے انھیں جو کچھ ملتا تھا اس پر صبر وشکر کے ساتھ قناعت کرتے تھے اور کسی سلطنت وحکومت کے جاہ وجلال اور دولت وثروت کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔ حضرت سعید بن المسیب کے پاس چار سو دینار تھے وہ اسی سے تجارت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خلافتِ بنو امیہ کی جانب سے ان کی خدمت میں ۳۰ ہزار درہم پیش کئے گئے لیکن انھوں نے فرمایا

لاحاجۃ لی فیہا ولا فی بنی مروان حتی القی اللہ فیحکم بینی وبینھم [۵۱]

مجھکو نہ درہموں کی ضرورت ہے اور نہ بنو مروان کی۔ یہاں تک کہ میں اللہ سے ملوں اور وہ میرے اور ان کے درمیان فیصلہ کرے۔

خلفار سے ان بزرگوں کی بے نیازی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ عبدالملک بن مروان نے ہر چند چاہا کہ حضرت سعید بن المسیب اپنی صاحبزادی کا نکاح اس کے لڑکے اور ولی عہد ولید سے کردیں لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک دن جب شدید سردی پڑ رہی تھی، عبدالملک نے انھیں پٹوایا اور ان پر پانی بہانے کا حکم دیا۔ [۵۲]

محدثین کی احتیاط کوشی کا یہ عالم تھا کہ اتقوا مواضع التھم کے مصداق خلفار اور امرار کے عطیات اور تحائف بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ جعفر برمکی نے حضرت عیسیٰ بن یونس کو ایک لاکھ درہم پیش کئے تو انھوں نے بہ کمالِ استغنا یہ کہکر واپس کردیا کہ کہیں اہلِ علم یہ نہ کہیں کہ میں نے حدیث کی قیمت لے لی۔[۵۳] مامون رشید نے بھی ان کو دس ہزار کی رقم دینی چاہی لیکن انھوں نے اس کے قبول کرنے سے بھی انکار کردیا اور فرمایا ولا شربت ماء یعنی حدیث کے معاوضہ میں تو میں ایک گھونٹ پانی بھی قبول نہیں کرونگا۔[۵۴]

ایک بار امیر یمن نے حضرت طاؤس بن کیسانؒ کی خدمت میں پانچسو دینار بھیجے لیکن انھوں نے ان کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ امام ابو حنیفہؒ تجارت کرکے زندگی بسر کرتے تھے۔

---

[۵۱] ابنِ خلکان ج ۱ ص ۲۰۶ [۵۲] ایضاً ج ۱ ص ۲۰۷ [۵۳] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۸ [۵۴] ایضاً ج ۱ ص ۲۵۹

اور سلاطین کے عطیات قبول نہیں کرتے تھے۔ خلیفہ مکتفی باللہ نے امام محمد بن جریر طبری سے ایک کتاب لکھوائی اور اس پر ان کو صلہ دینا چاہا تو انھوں نے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ لوگوں نے کہا ضرورت کے مطابق کچھ تو لے لیجئے۔ فرمایا میں امیر المومنین سے درخواست کروں گا کہ جمعہ کے دن سوال کرنے کی ممانعت کر دیں۔

بتائیے کیا ایسے بے نیاز، بے لوث، خوددار اور مخلص و دیانت شعار بزرگوں کی نسبت حدیثیں وضع کرنے یا احادیث ضعیفہ و موضوعہ کے قبول کرنے میں کسی قدر بھی جنبہ داری یا کسی کی رورعایت کرنے کا شک اور شبہ کیا جا سکتا ہے؟ ہاں بدگمانی یا منطقیانہ و فلسفیانہ شبہات کا علاج نہیں۔ جن کی وجہ سے دنیا کی سب سے زیادہ یقینی چیز بھی غیر یقینی قرار پا سکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ دنیوی اور دینی احکام و امور پر اس شک کا مطلقاً کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایسے شکی لوگوں کی نسبت ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

وما علینا الا البلاغ وآخر دعوانا اَنِ الحمد للہ رب العالمین۝

Marfat.com

ایک خط اور اس کا جواب

آخر میں ہم اس خط کو مع اس کے جواب کے درج کرتے ہیں جو رسالہ برہان میں "فہم قرآن" کی تین قسطیں ملاحظہ فرمانے کے بعد ہمارے محترم دوست مولانا عبدالمالک صاحب آروی نے لکھا تھا اور جس میں انھوں نے اپنے بعض ایسے شکوک و شبہات کا اظہار بے تکلفی کے ساتھ کر دیا تھا جو غالباً اکثر انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں گذرتے ہوں گے۔

حضرت مولانا صاحب زاد کرمہ۔ السلام علیک

آج "برہان" ملا۔ آپ نے "فہم قرآن" کے سلسلہ میں چودہ علوم کی معرفت لازم ٹھہرائی ہے، لغات، صرف و نحو اور تفسیر صحابہ (یعنی احادیث کی کتب تفسیر) کے علاوہ اور کون علوم ہیں؟ اور پھر سوال یہ ہوتا ہے کہ کسی فقیہ یا عالم دین کی اس اُپج یا اجتہاد سے معارف قرآن اور نکات قرآن پر نقادانہ نظر ڈالنے کے لئے ان چودہ علوم کا جاننا لازم کیسے آسکتا ہے میں اس کو نہیں سمجھا ذرا تفصیل سے سمجھایئے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جب تک درس نظامی کی فرسودہ کتابوں پر سر نہ کھپایا جائے فہم قرآن، تدبر فی القرآن کی منزل آہی نہیں سکتی، اب آپ ہی فرمائیے کہ اللہ میاں باوجود اس قدر رحم و کرم کے ایسا جبر کیونکر پسند فرمائیں گے، چودہ علوم؟ معاذ اللہ! تو کیا باضابطہ ایک شخص بی، اے پاس کر کے اگر لغات صرف و نحو اور احادیث کی مدد سے قرآن مجید کے دقائق و نکات سمجھنا چاہے تو گویا وہ اس سے بالکل محروم رہے گا۔ کیونکہ اب اس کے پاس وقت تو ہے نہیں کہ آٹھ سال تک دیوبند یا ندوہ جا کر حصول خیر و برکت کرے۔ حالانکہ جہاں تک متن کے ترجمہ کا تعلق ہے اور اس سے استنباط مسائل کا، لاطینی

اور انگریزی زبانوں میں قرآن مجید کے متعلق ایسی ایسی کتابیں ملتی ہیں کہ عہدِ حاضر میں کسی ندوی یا (معاف کیجئے) دیوبندی کا وہاں تک گزر بھی نہیں ہوسکتا۔ اسی پر نیاز بگڑتے ہیں تو آپ چیں بجبیں ہوتے ہیں، بایں علم و فضل، روشن خیالی و وسعتِ مشربی آپ پر بھی مولویوں کی "برہمنیت" طاری ہوگئی۔ اور آپ نے ویدوں کی طرح تعلیماتِ قرآنی اور اس کے فہم و عرفان کو بھی اپنی جماعت تک محدود کرلیا۔

"خدا توفیقِ کیشِ کفر بخشد دیں پناہاں را"

محب محترم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والا نامہ آیا، آپ یقین کیجئے میں کسی کی تنقید سے ناراض نہیں ہوتا، چہ جائیکہ آپ ایسے مخلص دوست کی تنقید سے، جس کی نیت، جس کے خلوص و محبت پر مجھ کو اعتمادِ تام ہے، آپ اس سے بھی زیادہ سخت اور ترش لہجہ میں کہئے میں برا نہیں مانوں گا، مگر ہاں شرط یہ ہے کہ آپ کا خلوص جو میرے ساتھ ہے اس خلوص سے کم نہ ہونے پائے جو آپ کو حضرت نیاز سے ہے۔

جس چیز پر تنقید کی گئی ہے اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اول تو آپ اس معنی کو پیشِ نظر رکھئے جو میں "فہم قرآن" سے مراد لیتا ہوں اور جس کو سامنے رکھکر میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ میرا مقصد جیسا کہ میں نے اس مضمون کے دوسرے نمبر میں تحریر کردیا ہے فہم قرآن سے یہ ہے کہ کوئی شخص اس کو پڑھ کر مجتہدانہ طور پر استنباطِ احکام کرسکے اور کلام کے مدلول و منطوق کو کما حقہٗ سمجھ سکے، تو اب اس معنی کے پیشِ نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ استنباطِ احکام کا حق کس کو حاصل ہے اور کون مجتہدانہ طور پر قرآن کے فہم کا ادعا کرسکتا ہے۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں فہم قرآن کے اس معنی کو ملحوظ رکھ کر لکھ رہا ہوں ورنہ اگر آپ فہم قرآن سے احکام امر و نہی کو معلوم کرنا اور جو مضامین اس میں بیان کئے گئے ہیں ان کو سطحی طور پر جان لینا مراد لیتے ہیں تو میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا۔ اور اس اعتبار سے بے شبہ فہم قرآن کے لئے شرائط وہ نہیں ہیں جو میں لکھ رہا ہوں۔

Marfat.com

جہاں تک اس مسئلہ کی اصل حقیقت کا تعلق ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ کسی بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں۔ دیوانِ غالب کو دہلی اور لکھنؤ کے لوگ جس طرح پڑھتے ہیں ایک پشاوری بھی اس سے اتنا ہی مزہ لیتا ہے لیکن کیا اس پر تنقید کا حق ہر ایک کو حاصل ہے؟ کیا اس پر نقد کرنے کے لئے اردو زبان کے مالہٗ وماعلیہ، اس کے محاورات وطرقِ استعمال، قواعد، فصاحت و بلاغت کے آئین وضوابط، ذوقِ شعری، فلسفہ وغیرہ وغیرہ ان چیزوں کے نہ صرف جاننے بلکہ ان میں ایک نظرِ وسیع پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غالب کا یہ شعر:-

مری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اس کا تھوڑا بہت مطلب ہر اردو خواں اور کالج کا ہر ایک گریجویٹ سمجھ سکتا ہے لیکن کیا اس کی شرح کا حق ہر ایک کو ایسا ہی ہے جیسا کہ عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم، عبدالمالک آروی، نیاز فتحپوری اور حسرت موہانی کو ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر آپ کلام مجید کے متعلق اس حیثیت سے نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ وہ ایک متکلم کا کلام ہے. کس طرح یہ فرما سکتے ہیں کہ اس کے مدلول ومنطوق کو سمجھنے کے لئے عربی کی معمولی شدبد کافی ہے، اس ادعا سے آپ کے خیال واستنتاج کے برعکس ویدوں کی طرح قرآن مجید کا اسلامی برہمنوں کے ساتھ مخصوص ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ ہمارے ادعاء کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کو مجتہدانہ طور پر سمجھنے کے لئے چند شرائط ہیں ٹھیک ایسے ہی جیسے ہر آسان سے آسان علم وفن میں کمال پیدا کرنے کے لئے چند شرائط ہوتے ہیں۔ ہر شخص جو ان شرائط کو پورا کرسکے گا فہم قرآن کا مدعی ہوسکتا ہے۔ اس میں ذات، پات مقام ونسب وغیرہ کسی کی کوئی قید نہیں۔ جس طرح طب آسان ہے مگر اس کے لئے قانونِ شیخ وغیرہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ ہر شخص ڈاکٹر، وکیل اور پروفیسر ہوسکتا ہے بشرطیکہ اس نے ایم بی بی ایس، ایل ایل بی، یا ایم اے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر رکھی ہوں۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں قرآن آسان ہے۔ ہر شخص کو اس میں

Marfat.com

تدبر اور تفکر کرنا چاہئے مگر اس کے لئے چند شرائط ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ادعا سے میری" برہمنیت" کس طرح لازم آجاتی ہے۔

اب رہا چودہ علوم کی شرط کا معاملہ تو یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ چودہ علوم براہ راست فہم قرآن کے لئے ضروری نہیں، بلکہ علماء ادب وبلاغت کے نزدیک کوئی شخص عربی نظم ونثر کو بخوبی سمجھ نہیں سکتا جب تک وہ ان علوم میں دسترس نہ رکھتا ہو اور فہم قرآن کے لئے اولین ضرورت عربی کلام کو کماحقہ سمجھنے کی صلاحیت ہے اس بنا پر لازم یہ آگیا کہ فہم قرآن عجمیوں کے لئے ان علوم کے بغیر دشوار ہے یہ کس نے کہا کہ ندوہ یا دیوبند میں ہی ان علوم کی تحصیل کیجئے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ان علوم کی بھی ضرورت نہیں اگر آپ کسی اور طریقہ سے کلامِ عربی کو سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں تو سبحان اللہ! پھر احمق ہے جو آپ سے کہے کہ ان علوم کو حاصل کیجئے۔

میں اگر ان علومِ ادب کے بغیر امراء القیس، اعشیٰ، طرفہ کے عربی کلاموں کو ان کی فصاحت و بلاغت کے ادراک وشعور کے ساتھ سمجھ نہیں سکتا تو ظاہر ہے ان کے بغیر قرآن مجید کو جو عربی زبان کی انتہائی فصیح وبلیغ کتاب ہے کس طرح سمجھ سکتا ہوں۔ پس ہر وہ شخص جو آج فہم قرآن کا مدعی ہے اس سے دریافت کیجئے کیا وہ شعر عرب کو جانتا ہے؟ کیا وہ عربی شعراء کے کلام کو بے تکلف سمجھ سکتا ہو اور ان کے نکات ولطائف کو معلوم کر سکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو اسے کیا حق ہے کہ وہ محض ترجمہ کی مدد سے قرآنی آیات کی تشریح وتوضیح شروع کر دے۔ اقبال کی رموزِ بیخودی کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ لیکن بتائیے کیا ایک انگریزی ترجمہ کے ذریعہ اقبال کو جاننے والا اقبال کے کلام سے اتنا ہی محظوظ ہو سکتا ہے جتنا ایک ایرانی یا فارسی کا کوئی خوش نداق شخص؟

آپ نے مجھ کو مولویانہ "برہمنیت" کا طعنہ دیا ہے۔ حالانکہ میرا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ میں "ہر بوالہوس کی حسن پرستی" گوارا نہیں کر سکتا، ہاں "شیوۂ اہلِ نظر" رکھنے والے شوق سے آئیں اور قرآن کے حُسن جہاں آرا کے جلووں سے بہرہ اندوز ہوں۔ میں حسن کو صرف ایک تفریحی نظر بازی کی چیز نہیں سمجھتا بلکہ میں اس کی بارگاہ میں سودائے عشق سے بھرے ہوئے سروں کو

خم دیکھنا چاہتا ہوں۔

آپ نے یہ بجا لکھا ہے کہ غریب نڈلیوں اور دیوبندیوں کو تو اُن کتابوں کی ہوا بھی نہیں لگتی جو لاطینی اور انگریزی زبانوں میں قرآن مجید کے متعلق موجود ہیں، لیکن سوال صرف یہ ہے کہ اس سے نقص کیا لازم آیا؟ زیادہ سے زیادہ یہی کہ ایک غیر زباندان نے جو تفسیر کی تھی وہ معلوم نہیں ہو سکی، لیکن اگر ایک شخص عربی نہیں جانتا تو آپ جانتے ہیں، وہ قرآن فہمی کے اعتبار سے کس قدر گھاٹے میں ہے وہ اس زبان کو نہیں جانتا جس میں قرآن نازل ہوا۔ اس کے اقوال وافعال سے بے خبر ہے جس پر قرآن اترا، اس ماحول سے ناآشنا ہے جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ اور ان چیزوں کے متعلق اگر اس کے پاس چند معلومات ہیں بھی تو ان لوگوں کی دی ہوئی جن کو "اجنبی" یا "مردِ بیرونِ خانہ" کہا جا سکتا ہے۔ اب فرمائیے نقصانِ عظیم میں کون ہے؟ پہلا شخص یا دوسرا؟ بھائی اس دور میں سب سے بڑی مصیبت تو یہی ہے کہ ہم قرآن کی تفسیر بھی ابنِ عباسؓ اور ابنِ عمرؓ کے بجائے انگریزوں کی زبان سے سننا چاہتے ہیں، کہئے کیا آپ کی غیرت گوارا کریگی کہ آپ اردو کے ایک شعر کا مطلب داغ وامیر کے بجائے کسی انگریز سے دریافت کریں۔ درآنحالیکہ وہ اردو کے ذوق شعری سے ناآشنائے محض ہو۔

آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ کی شرط کے مطابق ایک شخص جو "بی اے" ہے اور تدبر فی القرآن کرنا چاہتا ہے اگر اس سے یہ کہدیا جائے کہ تم پہلے چودہ علوم حاصل کرو تب اس قابل ہو سکتے ہو تو اس سے نرا جبر لازم آئے گا اور اللہ تعالیٰ اس قدر فضل وکرم کے باوجود کس طرح یہ جبر گوارا کرے گا۔" میں کہتا ہوں کہ اگر ہر شخص طبیب نہیں ہو سکتا تو کیا وہ اپنے امراض کے علاج کے لئے کسی طبیبِ حاذق پر اعتماد نہ کرے، آپ کی تحریر سے تو یہ لازم آتا ہے کہ ہر شخص جسے اپنے کسی مرض کے علاج کی ضرورت ہو اُسے طب حاصل کرنی چاہیئے۔ ہر شخص جو عدالت میں کوئی مقدمہ لڑنا چاہتا ہے اس کو بیرسٹری کا ڈپلومہ لینا چاہیئے، جس شخص کو مکان بنانے کی ضرورت ہو اس کو انجنیری کی تعلیم حاصل کرنی ضروری ہے اور اسی طرح جو شخص قرآن مجید میں تدبر کرنا چاہتا ہی

Marfat.com

وہ تمام مشاغل دنیویہ کے ہوتے ہوئے بھی قرآن کو مجتہدانہ طور پر سمجھ سکتا ہے۔ پس ہر شخص کو اجتہادی طور پر "تدبر فی القرآن" کی دعوت دینا یہ جبر ہے، یا یہ کہ تقسیم عمل کے اصول پر کام کیا جائے اور ہم جس طرح دنیوی معاملات میں ڈاکٹروں، بیرسٹروں، پروفیسروں اور انجنیروں کی جماعت پر اعتماد کرتے ہیں اسی طرح دینی و مذہبی معاملات میں بھی ایک جماعت ہو جس پر ہم اعتماد کلی کریں اور ہر ایک شخص سے یوں نہ کہیں کہ اس کو خود اس جماعت (علما دین) سے بے پروا ہو کر اپنی رائے اور عقل کے مطابق تفسیر کرنی چاہیے۔ آپ شوق سے "تدبر فی القرآن" کیجئے خدا آپ کے عزائم میں برکت اور حوصلوں میں وسعت عطا فرمائے لیکن اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کو محض اس بنا پر کہ وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آتی ہے اور اگرچہ اس کو بڑے بڑے ائمۂ کرام نے لکھا ہے رد نہ کیجئے۔

Marfat.com

Marfat.com

سلسلۂ ندوۃ المصنفین دہلی
(۱۱)

وحی الٰہی

تالیف

مولانا سعید احمد ایم، اے

قیمت غیر مجلد
3/٨/-

ندوۃ المصنفین دہلی

قیمت مجلد
4/-/-

Marfat.com

Marfat.com

سلسلہ ندوۃ المصنفین
(۱۱)

وحی الٰہی

مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب، جس میں وحی اور اس سے متعلقہ مسائل
کے تمام گوشوں پر وقت کے جدید اسلوب میں دلپذیر بحث کی گئی ہے۔

تالیف
مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم، اے
مدیر برہان

دہلی
ندوۃ المصنفین اردو بازار

Marfat.com

135306

طبع دوم

جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۷۱ھ | مارچ سنہ ۱۹۵۲ء

قیمت مجلد چار روپے

" غیر مجلد تین روپے

مطبوعہ اشوکا پریس دھلی

فہرست مضامین وحیِ الٰہی

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
دیباچہ	۵	ایک سوال اور اس کا جواب	۳۶	مشرکین کے اعتراضات کی تردید	۷۲
وحی کی ضرورت	۷	مزید تشریح	۳۸	حضرت جبریل کی توثیق	۷۶
عقل کی کوتاہی	۸	یہ آواز کس کی تھی	۴۰	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق	۷۷
فلاسفہ کا اعتراف عجز و نارسائی	۱۰	تمثل یعنی فرشتہ کا کسی		قرآن کا افترا کیا ہی نہیں جا سکتا	۷۸
عقل اور دل	۱۲	انسانی شکل میں آنا	۴۲	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے	
موجبات تسکین و تیقن	۱۵	فرشتہ کا اپنی اصلی شکل میں آنا	۴۳	متعلق قرآنی تصریحات	؍؍
وحی کے لغوی و اصطلاحی معنیٰ	۲۳	علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کی تقریر	۴۶	قرآن آپ کے قلب پر نازل ہوا	۸۲
وحی اور الہام کا فرق	۲۶	چھٹا طریقۂ وحی	۵۴	لوح محفوظ کا بیان	؍؍
وحی کی حقیقت	؍؍	ساتواں طریقۂ وحی	؍؍	قرآن کو کلام اللہ بھی کہا گیا ہے	۸۴
امام غزالی اور دوسرے متکلمین		آنحضرت اور مسئلہ رویت		قول بشر کہنے پر عذاب دوزخ	
کی آراء	۲۷	باری کی تحقیق	؍؍	کی وعید	۸۵
ابن سینا کی رائے	۲۸	قرآن اور وحی	۶۱	قرآن مع عربی الفاظ کے	
حافظ ابن تیمیہ کی رائے	۳۰	قرآن کے منزل من اللہ		وحی الٰہی ہے	۸۶
وحی کی مختلف صورتیں	۳۱	ہونے پر تحدی	۶۱	تنقیحات و نتائج	۸۷
رویائے صادقہ	؍؍	بعض جزئی واقعات سے		خدا کی صفات ذاتیہ پر	
رویائے صادقہ سے آغاز وحی		استدلال	۶۴	ایک عام بحث	۹۰
کی حکمت	۳۲	عدم اختلاف سے قرآن کے منزل		صفات کی حقیقت	۹۳
نفث فی الروع	۳۳	من اللہ ہونے پر استدلال	۶۸	صفت ذات اور صفت فعل	۹۵
صلصلۃ الجرس	۳۴	اہل کتاب قرآن کے منزل من اللہ		تعدد صفات اور وحدانیت ذات	۹۶
اس حالت کی شدت	۳۵	ہونے سے باخبر ہیں	؍؍	صفات کا ظہور حوادث ہیں	۹۸

Marfat.com

صفات لاعین ولاغیر ہیں ۱۰۰
حوادث کا قیام ذاتِ باری سے ۱۰۱
ایک تنبیہ ۱۰۳
کلام الٰہی ۱۰۷
قرآن مع الفاظ کے کلام الٰہی ہے "
کیا کلام کے لئے نطق ضروری ہے ۱۱۱
زبانِ حال کی وسعتِ گویائی ۱۱۳
قرآن مجید میں خدا کی صفت
کلام کا ذکر ۱۱۴
کلام صفت کمال ہے ۱۱۵
خدا کلام کرتا ہے "
خدا اپنی شان کے مطابق
کلام کرتا ہے ۱۱۶
خدا ندا کرتا ہے ۱۱۷
قرآن اور نطق ربانی ۱۱۸
انسانوں سے کلام الٰہی کی
صورتیں ۱۱۹
وما کان لبشر ان یکلمه اللہ الا وحیا
کی تفسیر "
آیت کی تفسیر میں علامہ سید
محمد انور شاہؒ کی تقریر ۱۲۰
ملکۂ نبوت اور وحی ۱۲۲
حکمت "

مراتب کمال ونقص کا تفاوت ۱۲۳
استکمال وتکمیل "
فکر وحدس ۱۲۴
عقل کے مراتب متفاوتہ ۱۲۵
ملکۂ نبوت وہبی ہے کسبی نہیں ۱۲۸
ایک اور نظریہ ۱۲۹
نبی کی بشریت ۱۳۵
وحی اور محققین یورپ ۱۳۸
مجالس تحقیق ۱۳۹
تسلسل وحی اور
نزول جبریل ۱۴۸
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کا حزن وملال ۱۴۸
فترت کے بعد نزولِ وحی اور
اس کا تسلسل ۱۵۰
وحی غیر متلو ۱۵۴
قرآن مجید وحی الٰہی
کیوں ہے ۱۵۷
وصفِ اعجاز "
وجوہ اعجاز "
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی امیت ۱۶۰
واقعات غیب ۱۶۳

واقعاتِ آئندہ کی پیشینگوئی ۱۶۶
غلبۂ روم کی پیشینگوئی "
جنگ روم وایران کا واقعہ "
ایرانیوں کی فتح ۱۶۷
مشرکین مکہ کی مسرت ۱۶۸
کفار مکہ کا استبعاد اور
اس کی وجہ "
پیشینگوئی کی صداقت کا ظہور ۱۷۰
چند اور پیشینگوئیاں ۱۷۱
فصاحت وبلاغت ۱۷۴
فصاحت وبلاغت ذوقی و
وجدانی چیز ہے ۱۷۵
بلغاء وشعراء عرب پر قرآنی
بلاغت کا اثر ۱۷۷
عدم اختلاف ۱۸۴
احکام وشرائع ۱۸۵
قرآن کا محکم دستور العمل "
قرآن کی روح سے تشبیہ ۱۸۸
حضرت علیؓ کا ارشاد "
قرآن مجید کا اسلوب
بیان اور بعض عیسائی
مصنفین ۱۸۹
اشعار موضوعہ کی تنقید ۱۹۱

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دنیا میں سینکڑوں سوالات ہیں جن کے جواب میں انسان سب کچھ کہنے کے بعد آخر کار ایک ایسے مرحلے پر پہونچتا ہے کہ پھر اس کے لئے جواب کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہاتھی اس قدر فربہ اور توانا کیوں ہے؟ چیونٹی کیوں اتنی نحیف و زار ہے؟ آم کے درخت پر آم ہی کیوں لگتے ہیں جامنیں کیوں نہیں پیدا ہوتیں؟ غم سے رونا اور خوشی سے ہنسنا ہی کیوں آتا ہے اس کا برعکس کیوں نہیں ہوتا؟ یہ اور اس طرح کے سینکڑوں سوالات ہیں جن کے جواب کا آخری مرتبہ یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کو اشیاء کے طبعی خواص اور ان کے نوعی مختصات پر محول کر دیا جائے پھر اگر اس کے بعد بھی یہ سوال کیا جائے کہ اس شے کی یہ طبعی خاصیت کیوں ہے اور یہی کیوں ہے کوئی اور چیز کیوں نہیں؟ تو اس کے جواب میں ایک ملحد کہے گا کہ مادہ کی ترکیب اسی طرح ہوئی ہے۔ لیکن موحد جواب دیگا کہ خدا نے ہر شے کی صورتِ نوعیہ میں ایک الگ خاصیت رکھی ہے۔ جواب دونوں کے مختلف ہوں گے لیکن ہر ایک کا یہ جواب ایک آخری جواب ہوگا کہ اگر اس کے بعد بھی سائل "کیوں" سے سوال کرے تو اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

وحی کا مسئلہ اسی طرح کے مسائل میں سے ہے۔ اس کی حقیقت کے سمجھانے میں ہم بتا سکتے ہیں کہ خدا کلام کرتا ہے۔ خاص خاص انسان (انبیاء) اس کا کلام سنتے اور سمجھتے ہیں اور ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان دو دعووں پر جو عقلی اعتراضات کئے جائیں ان کو رفع کر دیں، لیکن

اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص "ایسا ہی کیوں ہوتا ہے" کہہ کر ہم سے سوال کرے گا تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ اچھا پہلے تم ہمارے ہزاروں "کیوں" کا جواب دیدو۔ پھر ہم بھی تمھیں سمجھا دیں گے کہ خدا انبیاء میں ہی کیوں کلام ربّانی کو سمجھنے کی استعداد رکھتا ہے ہمہ شما میں کیوں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔

زیرِ نظر کتاب میں وحی الٰہی پر جو بحث کی گئی ہے اس کا مقصد انھیں سوالات کا جواب دینا ہے جو واقعی ایک طالب تحقیق کے دل میں اس مسئلہ پر غور کرنے کی راہ میں پیدا ہو سکتے ہیں ان کے علاوہ وہ لوگ جو از راہ بغض و عناد اپنے "کیوں" کا سلسلہ کہیں ختم ہی نہیں کرتے وہ اس کے مخاطب نہیں ہیں۔

ان اوراق میں کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بیان کردہ حقیقت وحی کو عقلی اور نقلی حیثیت سے عام فہم اندازِ بیان کے ساتھ پیش کر دیا جائے یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہو سکی ہے؟ اس کا فیصلہ ارباب نظر و خبر کریں گے۔ واللہ ھو المستعان وعلیہ التکلان

سعید احمد اکبر آبادی

ندوۃ المصنفین دہلی

۳۱ / اگست ۱۹۴۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

وحی کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ زیورِ علم و عقل سے آراستہ کیا اور اس نے انسان کے جسمانی نشو و نما اور اس کی مادی زندگی کی ترقی و فلاح کے لئے کارگاہِ ہست و بود کو رنگ رنگ کے نقش و نگار سے سجایا اور ابن آدم کی تربیت و کامرانی کے لئے ایک مخصوص نظام کے ماتحت قطعی و حتمی وسائل معیشت پیدا کئے چنانچہ وہ پانی پیتا ہے، ہوا میں سانس لیتا ہے۔ بادلوں سے بارش ہوتی ہے جو اس کے کھیتوں اور باغوں کو سرسبز و شاداب کر دیتی ہے اور جس سے اناج اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ آگ سے وہ اپنی غذا تیار کرتا ہے۔ آفتاب کی دھوپ سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں جن کی تخلیق میں انسان کی صنعت و حرفت کو کوئی دخل نہیں ان پر ہی حیاتِ انسانی کے قیام و بقا کا دارومدار ہے یہ تمام اشیاء وہ ہیں جن کو مادی زندگی کے قدرتی وسائل و ذرائع کہا جاتا ہے، لیکن اس مادی زندگی سے بڑھکر انسان کی ایک اور زندگی ہے جسکو روحانی اور اخلاقی زندگی کہتے ہیں اور اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ یہی وہ اصل حیات ہے جس پر انسان کی اجتماعی زندگی کا صالح اور درست نظام قائم رہ سکتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان کی تمام تمدنی ترقیات، عمرانی ایجادات و اختراعات اور عقلی تحقیقات و اکتشافات

انسانیت کی تعمیر میں مفید ثابت ہونے کے بجائے خود اس کے لئے سم قاتل بن جائیں اور اس کی سوسائٹیاں وحشیوں اور درندوں کے مہیب ریوڑ کی شکل میں تبدیل ہو کر رہ جائیں جس طرح پورے نظامِ شمسی کے قیام وبقا کا دار ومدار اجرام فلکی کے باہمی جذب وانجذاب پر ہے ٹھیک اسی طرح انسانی سوسائٹی کے نظم ونسق اور اسکی فلاح ونجاح کا انحصار حاسۂ اخلاقی یا روحانی اعمال وضوابط پر ہے۔[لے]

اس بنا پر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ رب العالمین جس نے انسان کی مادی وجسمانی زندگی کے قرار و قیام کا خود تکفل کیا۔ اس کے لئے ایسے قدرتی وسائل و ذرائع پیدا کئے جن کی صنعت وتخلیق میں انسان کے اپنے دست ایجاد کو مطلقًا دخل نہیں ہے۔ وہ ہمیں اخلاقی اور روحانی زندگی کے ایسے قدرتی اصول وآئین نہ بتاتا جو صالح تمدن کے اساس وبنیاد بنیں اور جو قطعی وحتمی ہونے کی وجہ سے ہر ملک اور ہر زمانہ میں ہر شخص کیلئے لائق عمل اور درخور قبول وپذیرائی ہوں اور ان میں کسی کے لئے اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔

عقل کی کوتاہی کہا جاسکتا ہے اس طرح کے اصول وضوابط کے لئے یہ کیا ضروری ہے کہ وہ خدا کے بنائے ہوئے ہوں اور اس نے ہی انسان کو ان کی تلقین کی ہو جس طرح انسان اپنے رہنے کے لئے مکانات بناتا ہے۔ گرمی سردی سے محفوظ رہنے کی غرض سے اپنے لئے کپڑے بنتا اور تیار کرتا ہے اور اسی طرح کی ہزاروں صنعتیں اس نے اپنے نفع کے لئے ایجاد کر رکھی ہیں، وہ یہ بھی کرسکتا ہے کہ اپنے لئے اخلاقی ضوابط وقواعد بنائے اور اپنی روحانی تشنگی کو فرو کرنے کے لئے خود ہی کوئی نسخہ کیمیا تجویز کرلے۔ عقل جس طرح مادی ترقی کی راہ میں رہنمائی کرتی ہے، اخلاق اور روحانیت کے میدان میں بھی وہ اسی طرح شمع ہدایت

[لے] ڈاکٹر اقبال مرحوم نے یورپ کی عقلی ترقیات کا اسی بنا پر نہایت بلیغ پیرایہ میں ماتم کیا ہے کہ وہاں ان سب ترقیوں کے باوجود اخلاق وروحانیت کا فقدان ہے اور اس لئے انسانی زندگی کا شیرازۂ اطمینان وسکون حد درجہ پراگندہ و پریشان ہے فرماتے ہیں

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا ‏— زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا ‏— اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

بن سکتی اور اس کا ناخن تدبیر دونوں جگہ مشکل اور پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی میں کارگر ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ کسی انسان کی عقل کتنی ہی کامل و مکمل ہو نقص سے مبرا نہیں ہو سکتی۔ انسان خود اپنی فطرت و طبیعت کے اعتبار سے ناقص و غیر مکمل ہے۔ اس بنا پر اس کی کوئی قوت بھی خواہ ظاہری ہو یا باطنی، مادی ہو یا روحانی من کل الوجوہ کامل نہیں ہے۔ ہر معاملہ میں صحت کے ساتھ خطا، کمال کے ساتھ نقص اور تذکر کے ساتھ سہو و نسیان کا خدشہ لگا ہوا ہے اور کیوں نہ ہو امکان وحدوث کی ظلمت کے ساتھ کمالِ بے خطا کا نور جمع کس طرح ہو سکتا ہے جس طرح انسان رنگ اور شکل میں ایک دوسرے سے متباین ہیں ٹھیک اسی طرح اپنے قوائے فکریہ و باطنیہ کے لحاظ سے بھی وہ مختلف اور ایک دوسرے سے جدا ہیں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی خوش نصیب عقل حقیقت کے بحر ناپیدا کنار میں غوطہ زنی کر کے صداقت و حقانیت کے چند آبدار موتی حاصل کر لے لیکن اس کے پاس وہ قوت کہاں ہے جس سے وہ تمام دنیا کو اس صداقت کا معترف بنا سکے۔ کوئی انسانی اختراع و ایجاد خواہ کتنی ہی حقیقت سے قریب ہو اختلاف کی گنجائش سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کا تو پوچھنا ہی کیا ہے آج تک دنیا کی ممتاز عقلیں بھی کسی ایک مسئلہ پر متفق الرائے نہ ہو سکیں۔ فلسفہ یونان کے جو بنیادی نظریے تھے اور جو قرنہا قرن تک عالم میں مقبول و رائج رہے آخر آج موجودہ فلسفۂ یورپ نے ان کو پرزہ پرزہ کر کے فضا میں منتشر کر دیا ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ آج فلسفۂ حال کی عمارت جس بنیاد پر کھڑی ہے مستقبل میں کوئی قوم اپنے جدید نظریات و افکار کی قوت سے اسے پاش پاش نہیں کر دیگی اور اس عمارت کے کھنڈروں پر ایک نئے نظام فکر و عمل کی دنیا نہیں بسائیگی۔ قرنوں اور صدیوں کے بعد جو کچھ ہوگا اسے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن اتنا تو اب بھی دیکھا جا رہا ہے کہ فلسفۂ جدیدہ کی شاندار عمارت کو ارتیاب و شک کا گھن ابھی سے لگنا شروع ہو گیا ہے۔ مولانا عبد الباری ندوی استاذ فلسفہ جدیدہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن "فہم انسانی" کے مقدمہ میں اس رازِ سربستہ کا افشا اس طرح کرتے ہیں ۔

Marfat.com

"اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد جدید فلسفہ کی تاریخ زیادہ تر نام بدل کر کھلے یا چھپے اقرارِ جہل کی تاریخ بن کر رہ گئی، لاک کے یہاں یہ اقرار حسیت کے نقاب میں ہے اور برکلے کے ہاں ادعائے تصوریت کے مگر اتنی باریک اور شفاف کہ روپوشی سے زیادہ رونمائی کی زینت ہے آخر برکلے کے بعد ہی ڈیوڈ ہیوم نے اس رونما نقاب کو بھی تار تار کر دیا اور نہ صرف جہل و ارتیابیت کا کھل کر اقرار کیا بلکہ اپنے کو ارتیابی ہی کہلانا پسند کیا۔

فلاسفہ کا اعتراف عجز و نارسائی

عقلِ انسانی کی کوتاہی اور اس کے عجز و قصور کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ وہ عظیم المرتبت فلاسفۂ عالم جن کے فلسفیانہ افکار و نظریات عقل و فکر کی تاریخ ارتقاء کا آخری نقطۂ عروج مانے جاتے رہے ہیں جب عالم حقیقت کی لامحدود وسعتوں میں انھیں قدم قدم پر حیرت و گمشدگی سے سابقہ پڑا تو خود انھیں بھی بجز اس کے کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ وہ برملا عقل کی کوتاہ بینی اور فکر کی نارسائی کا اعتراف کریں سقراط کا یہ مقولہ حدِ تواتر تک مشہور ہے "ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے" انگلستان کا مشہور فلسفی ڈیوڈ ہیوم صاف لفظوں میں اقرار کرتا ہے کہ

"انسان عقلی مخلوق ہے، اور اس لحاظ سے علم اس کی خاص دماغی غذا ہے لیکن ساتھ ہی انسانی ذی عقل و فہم کے حدود اتنے تنگ ہیں کہ اس باب میں اس کو وسعت و اذعان دونوں حیثیات سے بہت ہی کم اپنے فتوحات سے تشفی نصیب ہو سکتی ہے"۔

"فہم انسانی" میں ہی ایک اور جگہ فلسفہ کا اس طرح مذاق اڑاتا ہے۔

"مکمل سے مکمل فلسفۂ طبیعی بھی صرف یہ کرتا ہے کہ ہمارے جہل کو ذرا اور دور کر دیتا ہے جس طرح مکمل سے مکمل فلسفہ مابعد الطبیعات اور اخلاقیات کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ ہمارے اس جہل کے وسیع حصوں کی پردہ دری کر دیتا ہے، مطلب یہ ہے کہ فلسفہ اسرارِ کائنات کی نہیں صرف ہمارے جہل کی پردہ دری کرتا ہے اس کا حاصل اگر کچھ تھا یا ہو سکتا ہے تو انسان

Marfat.com

کی کمزوری اور کوتہ چشمی کا تماشا دیکھنا دکھانا جس سے بھاگنے کی کوشش کے باوجود بار بار دوچار ہونا پڑتا ہے"۔

ہیوم تو خیر ارتیابی تھا۔ ہر چیز کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا، مادہ پرستوں کا ابوالآباء دیمقراطیس (متولد ۴۶۰ ق م) تک کا قول ہے کہ کوئی بات سچ نہیں اور اگر ہے تو ہم کو معلوم نہیں۔[۵]

پس جب عقل خود ناقص ہے تو کسی صحیح نتیجہ تک پہونچنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جائیں گے یعنی قیاس استقراء اور تمثیل ان کی نسبت کیونکر بوثوق کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی صحیح اور یقینی نتیجہ تک ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کے یقینی علم کے لئے مشاہدہ سے بڑھ کر کوئی اور قوی دلیل نہیں ہو سکتی لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ قدیم فلاسفہ میں تو لا ادریہ کا ایک مستقل گروہ تھا ہی جو کہا کرتا تھا کہ ہمیں کسی شئے کی کوئی حقیقت معلوم نہیں۔ یورپ کے جدید فلاسفہ کی صف میں بھی برکلے جیسے فلسفی نظر آتے ہیں جو کہتے ہیں کہ کسی شئے کا وجود صرف وہی ہے جو ذہن میں ہے اس کے علاوہ وجود خارجی کے کوئی معنی نہیں۔ اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان فلاسفہ نے جو کچھ کہا وہ ٹھیک ہے۔ بلکہ مدعا صرف یہ دکھانا ہے کہ اگر عقل کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور خدا کی ہدایت اس کی دستگیری نہ کرے تو خود اس کی کوششیں بسا اوقات فرطِ حیرت کی ناکامی و مایوسی پر منتہی ہوتی ہیں اور ادراکِ حقیقت کی کسی روشنی تک پہونچنے کے بجائے وہ لاعلمی و نادانی کی تاریکیوں میں خود اپنے آپ کو بھی گم کر دیتی ہے۔

اس موقع پر اتنی بات اور یاد رکھنی چاہیئے کہ جب طبعیات میں عقل کی کوتاہ رسی کا یہ عالم ہے کہ وہ قطعی طور پر کسی چیز کی ذاتیات اور عرضیات میں بھی امتیاز نہیں کر سکتی اور اسی بنا پر اربابِ منطق

---

[۵] یہاں یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ اس باب میں جن فلاسفہ کے اقوال نقل کئے گئے ہیں وہ سب فہم انسانی سے ماخوذ ہیں جو پروفیسر عبدالباری ندوی کے قلم سے ڈیوڈ ہیوم کی کتاب ہیومن انڈرسٹینڈنگ کا نہایت عمدہ ترجمہ ہے اس کے علاوہ موصوف کی دو اور کتابیں "برکلے" اور "مبادی علم انسانی" جو برکلے کی کتاب کا ترجمہ ہے یہ دونوں بھی پیش نظر رہی ہیں

تسلیم کراتے ہیں کہ کسی چیز کی بھی حدِ تام بیان کرنی ناممکن ہے، تو ظاہر ہے مابعد الطبیعیات میں اس کی لنگ پی کا کیا حال ہوگا اور چونکہ فضائل اخلاق اور روحانی کمالات کا تعلق ایک بڑی حد تک حقائق مابعد الطبیعیات کے تصور سے ہے اس لئے عقل اس راہ میں ہماری کامیاب رہنما ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ ہم اس پر اعتمادِ کلی کر سکتے ہیں۔

عقل اور دل اس مقام پر مزید توضیح و تشریح کی غرض سے اتنا اور یاد رکھئے کہ انسان کو جتنے معاملات پیش آتے ہیں، ان کا تعلق صرف عقل سے ہوتا ہے یا فقط دل سے اور یا دونوں سے اور یہ واقعہ ہی کہ انسانی زندگی کا قیام و بقا اور اس کی روحانی و اخلاقی دنیا کا نظم و نسق مبنی ہے اس بات پر کہ انسان عقل اور دل دونوں سے کام لے کیونکہ جس طرح عقل مصدرِ شعور و احساس ہی۔ اسی طرح دل جذبات و عواطف کا سرچشمہ ہی اگر ہم عقل (Reason) کے ہی تابع فرمان ہو جائیں اور دل (Feeling) کو ہم پر کوئی دسترس حاصل نہ ہو تو ہم اس فلسفی کی طرح ہو کر رہ جائیں گے جس کو شادی میں غم اور غم میں شادی کی تصویر نظر آتی ہے اور جو اپنی ہستی کے قطرہ کو وجودِ ابدی کے بحرِ ناپیدا کنار میں فنا کر دینے کے بعد ہر قسم کے فعل و عمل سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم عقل سے بالکل صرفِ نظر کر لیں اور اپنے تمام معاملات اور افعال و اعمال دل کے میلانات و عواطف کے تابع بنا لیں تو اس کا انجام بھی بجز تباہی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا اس وقت ہماری مثال انتہائی عیش پرست اور ظالم و جابر انسان کی سی ہوگی۔ یا پرلے درجہ کے مغلوب الجذبات نرم خو اور رہر آگیں شخص کی سی۔ غرض یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں خیالات و احساسات کا توازن مفقود ہو کر انسانی اجتماعیات کے شیرازہ کو درہم برہم کر کے رکھ دیگا۔ اس لئے ضرورت ہی کہ دونوں میں ارتباط و التیام ملحوظ رکھا جائے لیکن محبت کے عام نفسیاتی قانون کے مطابق دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کی طرف نسبتہً زیادہ مائل ہونا چاہیے۔ اس مرحلہ پر ہمارا دعویٰ ہی کہ عقل کو ایک بڑی حد تک "ادب خوردہ دل" ہونے کی ضرورت ہی جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے عقلِ محض کی رہنمائی ہمارے لئے کشو دِ کار کا قابلِ اطمینان ذریعہ نہیں۔ البتہ وہ

Marfat.com

عقل جو علامہ اقبال مرحوم کے بقول "ادب خوردگی دل" کے زیور سے آراستہ ہے وہ ہماری روحانی تشنگی کو فرو کرنے کا بہت کچھ سامان رکھتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

نقشے کہ بستہ ہمہ اوہام باطل ست
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل ست

ذیل کے شعر میں بھی انھوں نے اسی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔

جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے
یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار

فلسفہ اشراق جن لوگوں نے تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جب مسیحیت اور فلسفہ محض دونوں انسان کی روحانی تشنگی کے فرو کرنے میں ناکام ثابت ہوئے جس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت عقل کو مطمئن کرنے میں ناکامیاب رہی اور فلسفہ روح اور دل کے لئے کوئی سامانِ تسکین فراہم نہیں کر سکا تو افلاطون کے متبعین نے فلسفہ اور مذہب دونوں کی آمیزش سے ایک معجون مرکب تیار کی جس کا نام فلسفۂ اشراق (Neo-Platonism) رکھا گیا[1]۔ اس کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ طبیعاتی مسائل و مباحث کے ساتھ ساتھ اخلاقیات اور الٰہیات اور روحانیت کے مسائل بھی اس میں شامل تھے۔ فلسفہ کے اس نئے اسکول کا بانی فلاطینس (Plotinus) تھا جو سنہ ۲۰۵ء میں مصر میں پیدا ہوا اور سنہ ۲۷۰ء میں روم میں انتقال کر گیا۔

اسباب و علل خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس فلسفہ کو مشرق میں اور مغرب میں دونوں جگہ بہت فروغ ہوا اور غالباً یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایشیا کے دل و دماغ پر تو اس فلسفہ کا اتنا زبردست استیلاء ہوا کہ مذہبی عقائد کی مضبوط بنیادیں تک متزلزل ہو گئیں۔ لیکن چونکہ اس فلسفہ کا تمام تار و پود عقل کی موشگافیوں سے ہی تیار ہوا تھا اور اگرچہ اس میں ضمیر (کانشنس) کی پکار کو بھی دخل تھا لیکن وہ مغلوب تھی اور غلبہ عقل کو ہی تھا اس لئے معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کے میدان میں انھیں قدم قدم پر ٹھوکریں کھانی پڑیں اور یہ رہ نوردانِ حکمت و دانائی جانفروشانہ تگ و دو کے بعد بھی اس سرچشمۂ ہدایت تک نہ پہونچ سکے جو روح اور دل کے

[1] فلسفۂ اشراق پر مفصل معلومات کے لئے دیکھو Encyclopaedia of Religion & Ethics V.9, pp: 307-319

Marfat.com

لئے واحد سرمایۂ تسکین ہے۔

فلسفۂ اشراق خدا کو مانتا ہی نہیں، بلکہ وہ اس کو تمام کائنات میں جاری و ساری مانتا ہے اس کے نزدیک خدا منبع خیر ہے اور مادہ مخزنِ شر و ظلمات اس کے اذعان و یقین میں خدا حقیقتِ واحدہ ہے اور انسانی روح اس کا پرتو، اس عقیدہ کے ساتھ ساتھ فلسفۂ اشراق روحانیت، اخلاق، تزکیۂ باطن اور تصفیۂ نفس کی طرف بھی دعوت دیتا ہے اور انسان کو لذائذ جسمانی ترک کر کے تقویٰ و طہارت کی زندگی بسر کرنے پر ابھارتا ہے یہ سب کچھ سہی لیکن اصل یہ ہے کہ چونکہ اس فلسفہ کی بنیاد کسی خدائی قانون (وحی الہیٰ) پر نہیں تھی اور یہ محض عقل کی لاٹھی کے سہارے کھڑا ہوا تھا۔ اس بنا پر خود خدا کی صفات و ذات کی نسبت اس فلسفہ نے ایسی موشگافیاں کیں کہ انھوں نے انسان کی روح کو دلاسا دینے کے بجائے اسے ایک اور ہولناک ورطۂ حیرت و تذبذب میں پھنسا دیا مثلاً اس فلسفہ نے بتایا کہ۔

(۱) خدا علۃ العلل ہے اور چونکہ علۃ تامہ سے معلول کا صدور بالاختیار و بالارادہ نہیں ہوتا بلکہ بالاضطرار ہوتا ہے اس لئے عالم کی تخلیق بھی خدا سے اضطراراً ہوئی ہے، اس میں اس کی مشیت اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں، اس کی مثال بالکل آگ کی سی ہے کہ جب وہ پائی جائیگی تو حرارت پیدا ہوگی ہی، خواہ آگ کے لئے ارادہ ہو یا نہ ہو۔

(۲) خدا کی ذات اس قدر ارفع و اعلیٰ ہے کہ ہم اس کی طرف کسی صفت مثلاً علم، ارادہ اور خیر کا بھی انتساب نہیں کر سکتے، حد یہ ہے کہ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ وجود رکھتا ہے۔ کیونکہ ہر موجود کا تصور ممکن ہے اور خدا کا تصور ہو ہی نہیں سکتا (لَا يُحَدُّ وَلَا يُتَصَوَّرُ)

(۳) انسان کی روح اگر حسی لذتوں میں مبتلا رہے گی تو وہ قالب بدلتی رہے گی خواہ وہ کسی انسان کا ہو یا حیوان کا یا نباتات کا۔

غرض یہ ہے کہ اس فلسفہ نے کہیں درپردہ لاادریت کی تلقین کی اور کہیں دیدانت فلسفہ کے

Marfat.com

دیکھا دیکھی تناسخ کا اقرار کیا۔ یہ لوگ چلے تھے حق کی تلاش میں، لیکن جب عقلِ محض کی قیادت راہ طلب کی جانگسل صعوبتوں کی حریف نہ بن سکی تو انجام کار حضرت موسیٰ کی قوم کی طرح خود اپنے وجود کو بھی وادیٔ حیرت میں گم کر کے بیٹھ رہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ یہ فلسفہ روحانیت اور اخلاق کے چند در چند مواعظہ حسنہ کے باوجود تمام دنیا کا تو کیا ذکر ہے کسی ایک انسانی سوسائٹی میں بھی عظیم الشان روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا نہیں کر سکا، بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس فلسفہ نے انسان کو دماغی بلند پروازیوں میں مشغول کر کے اسے عملی جدوجہد سے محروم کر دیا اور اس کی عملی توتوں کو اس درجہ مضمحل بنا دیا کہ وہ تقریباً از کار رفتہ ہو کر رہ گئیں۔ مرزا غالب نے شاید اسی قسم کے لوگوں کی نسبت کہا ہے۔

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت — دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

موجبات تسکین و یقین عقل منطق اور فلسفہ ان سب دروازوں سے مایوس لوٹنے کے بعد پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھا بتاؤ اطمینان و سکون کا وہ خزانہ کہاں ہے جو انسانیت کی روحانی طلب کو سکون عطا کر سکے قبل اس کے کہ آپ اس کا جواب معلوم کریں، یہ جان لینا ضروری ہے کہ یقین کی ماہیت کیا ہے؟ اور یہ کس طرح پیدا ہوتا ہے۔

کم وبیش تمام علماء نفسیات نے یقین کی ماہیت اور اس کے اسباب و علل پر بحث کی ہے لیکن نفس یقین کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہے بلکہ اس کی مختلف قسمیں ہیں مثلاً منطقی یقین (Logicat Certainty) نفسیاتی یقین (Psychologicat Certainty) اور مذہبی یقین (Religious Certainty) اور یقین کا تحقق انھیں اقسام میں سے کسی ایک قسم کے ضمن میں ہوتا ہے، ان اقسام کی تعریفیں جدا جدا ہیں لیکن ان سب میں مابہ الاشتراک یہ ہے کہ یقین ایک طرح کا نفسی میلان ہے جو خاص خاص موثرات خارجی و ذہنی کے زیر اثر انسان کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے[1] اس نفسی میلان کو پیدا کرنے کے لئے نہ فلسفیانہ اور منطقی

[1] تفصیلی معلومات کیلئے دیکھو Encyclopaedia of Religion & Ethics v. 11 pp. 320 to 330

Marfat.com

دلائل کی ضرورت ہی اور نہ ریاضی و اقلیدس کی بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ میلان نہ علم پر موقوف ہے اور نہ جہل پر اس کا انحصار نہ سچ پر ہے اور نہ جھوٹ پر، فرض کیجیے ایک ڈاکٹر ہے جسے آپ جانتے ہیں کہ اس نے اب تک جتنے علاج بھی کئے ہیں ان میں وہ ناکام رہا ہے اس بنا پر اگر آپ کا کوئی عزیز بیمار ہو جائے تو چونکہ آپ کو اس ڈاکٹر کی نالائقی کا یقین ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص آپ کو اس ڈاکٹر کے علاج کا مشورہ دیگا بھی تو آپ فوراً انکار کر دیں گے لیکن آپ کے برخلاف ایک اور شخص ہی جو کم از کم ڈاکٹر موصوف کے بیس کامیاب علاجوں کا مشاہدہ خود اپنی آنکھ سے کر چکا ہے۔ اس لئے اگر آپ اپنے مریض عزیز کے علاج سے متعلق اس شخص سے مشورہ کریں گے تو وہ بے تامل و تردد کہے گا کہ اسی ڈاکٹر سے رجوع کیجیے کیونکہ اسے اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ کے باعث ڈاکٹر کی قابلیت و مہارتِ فن کا ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ آپ کو ڈاکٹر کی عدم قابلیت کا اس مثال سے واضح ہوا ہوگا کہ یہاں ڈاکٹر کی قابلیت کی نسبت شخص مذکور الصدر کا نفسی میلان (یقین) اس کے تجربہ پر مبنی ہے۔

اب اس کے بعد اس پر غور کیجیے کہ تجربہ کبھی مسلسل مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے، اور کبھی عملِ ذوق و وجدان سے۔ آپ نے اردو شاعری میں رندِ بادہ خوار اور زاہدِ تقویٰ شعار کی نوک جھونک دیکھی ہوگی دیکھیے زاہد شراب کی برائی کا یقین رکھتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس رندِ بادہ آشام کو شراب کی جانفروزی کا اس درجہ یقین ہے کہ وہ دعویٰ سے کہتا ہے :۔

جاں فزا ہی بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا　　　سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

پھر زاہد اس کے اس یقین کو توڑنے کے لئے دلائل و براہین پیش کرتا ہے تو وہ ان کے جواب میں صرف اتنا کہتا ہے ع

ذوقِ این بادہ ندانی بخدا تا نچشی

غرض یہ ہے کہ یقین جس کی حقیقت ایک نفسی میلان کے سوا اور کچھ نہیں ہے مختلف جذبات قلبی کیفیات

کی وجہ سے پیدا ہوتا ہو اس بنا پر کوئی ایک شخص کسی دوسرے کو اس لئے مطعون نہیں کرسکتا کہ وہ کسی چیز کی نسبت اس کی طرح یقین واذعان کیوں نہیں رکھتا ہاں لعن طعن اور ملامت اگر ہو سکتی ہو تو وہ محض اس بات پر ہو سکتی ہو کہ اُس دوسرے شخص کے دل میں وہ کیفیت کیوں پیدا نہیں ہوتی جس کیوجہ سے دل میں اُس چیز کی نسبت نفسی میلان پیدا ہوتا، چنانچہ قرآن مجید نے ان کفار کے متعلق جو کلمۂ حق قبول نہیں کرتے تھے۔ یہ نہیں کہا کہ انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کے وحی ہونے کا یقین کیوں نہیں آتا بلکہ

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ	اللہ نے اُن کے دلوں اور اُن کے کانوں پر مہر
وَعَلٰٓی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (بقرہ)	لگا دی ہو اور انکی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہو۔

فرماکر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہو کہ ان لوگوں میں فطرتاً اتنی صلاحیت واستعداد ہی نہیں کہ ان کے دل میں آنحضرت اور قرآن کی حقانیت وصداقت کے متعلق نفسی میلان پیدا ہو۔

اس تقریر سے یہ ظاہر ہو جاتا ہو کہ یقین بذات خود کوئی مستقل چیز نہیں بلکہ وہ ثمرہ ہوتا ہو ایک خاص طرح کے طبعی وقلبی جذبات وتاثرات کا، اب اس مقدمہ کو ذہن نشین کر کے آپ غور کریں گے تو بیّن طور پر محسوس ہوگا کہ وحی الٰہی انسان کے دل میں جس طرح اطمینان وسکون پیدا کر دیتی ہو وہ بالکل ایک نفسیاتی طریقہ ہو اور اس لئے انسان اس پیغام ربانی کو سُن کر اُس شک وتردد سے دوچار نہیں ہوتا جس کا سبب بالعموم منطقی طرز بحث واستدلال ہوتا ہو۔

مثلاً اگر اس کو یہ بتانا ہو کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہو تو وہ اس سے بحث نہیں کرتا کہ خدا کلام کرتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کرتا ہو تو کس طرح؟ کیا اُس کے لئے نطق پایا جا سکتا ہو؟ کیا نطق کے لئے عضلات واعصاب کی ضرورت نہیں ہو؟ جبریل رسول اللہ کے قلب پر کلام خداوندی کا القا کرتے ہیں تو کس طرح؟ اس کی حقیقت کیا ہو؟ وہ جانتا تھا کہ یہ مابعد الطبیعیاتی حقائق ہیں جن کی گرہ کشائی آجتک کسی

Marfat.com

کے ناخن تدبیر نے کی ہو اور نہ کر سکے، جب مشاہدات اور محسوسات کی دنیا میں ہی قدم قدم پر ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں تو عالم مجردات و معقولات کی وسعتیں کس طرح انسان کی محدود عقل میں سمٹ سمٹا کر جمع ہو سکتی ہیں اس لئے قرآن نے اس طریقہ بحث و استدلال کو چھوڑ کر ایک بالکل نفسیاتی اور بہت زیادہ موثر طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور دعوت دی کہ آپ کے ایک ایک عمل اور ایک ایک حرکت و سکون کو نہایت گہری تنقید مگر انصاف اور عدل کی نگاہ سے دیکھو، اسے جانچو، پرکھو اور بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی اُس ذات گرامی کو جھوٹ بولتے دیکھا ہے؟ کیا تمھیں کبھی ان کی کوئی حرکت مشتبہ نظر آئی ہے؟ کیا اُن کے کسی قول و فعل پر بھی تمھیں کبھی حرف گیری کا موقع ملا ہے؟ اگر ان سب باتوں کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی میں ہے تو یقین کرو کہ جس ذات نے عمر کا بہترین حصہ (۴۰ سال) اس تقویٰ و طہارت، معصومیت اور فضائل اخلاق کیساتھ بسر کئے ہیں وہ آج بھی جھوٹ نہیں بول سکتا اور آج بھی ان کی زبانِ حق ترجمان کسی نا ملائم اور نا درست بات سے آشنا نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر چڑھ کر پہلی مرتبہ قریش کو دعوت اسلام دی تو یہی طریقہ اختیار کیا کہ اُن سے پوچھا "بتاؤ! تم مجھ کو کیا سمجھتے ہو؟ جب سب نے بیک آواز اقرار کر لیا کہ "آپ تو امین صادق ہیں، آپ نے آج تک کوئی بات جھوٹ نہیں کہی،" تو آپ نے اُن تک اسلام کا پیغام جان التیام پہنچایا اور خود قرآن بھی سید کونین کی زبان اقدس سے یوں گویا ہوتا ہے۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ — میں نے تو تمھارے درمیان مدت تک عمر گذاری

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس) — ہے کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وحیِ الٰہی پیغمبر کو ایک فاضل و کامل معلم یا ایک شفیق و عقلمند باپ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور انسان کے کانشنس یا اسکے ضمیر و وجدان Inner feeling سے اپیل کرتی ہے کہ جس طرح شاگرد وجدانی طور سے استاد پر اور بیٹا باپ پر اعتماد کلی رکھتا ہے اور اس لئے

اُستاد کی تعلیمات اور باپ کی نصیحتوں کو شک وشبہ کی نظر سے نہیں دیکھتا اسی طرح تمام دنیا کو پیغمبر کی ذات پر اعتماد رکھنا چاہیے اور اس کی تعلیمات وہدایات کو گوشِ حقیقت نیوش سے سُن کر حرزِ دل وجاں بنا لینا چاہیے۔

پس یہ ثابت ہو گیا کہ اصل صداقت وحقانیت اور کامل اطمینان وسکون کا سُراغ صرف وحیِ الٰہی کے ذریعہ ہی مل سکتا ہے اور انسان کی روحانی تشنگی صرف اسی سرچشمۂ ہدایت کے آبِ زلال سے بجھ سکتی ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔ "مذہبی دیوانوں" کا کیا ذکر ہے، خود اُن لوگوں نے جو کرہ فلسفہ کی سب سے اونچی سطح پر نظر آتے ہیں اس حقیقت کا کھُلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔

"ہم کو حصولِ صداقت سے مایوس ہو جانا چاہئے بجز اس صورت کے کہ ہم یہ مان لیں کہ اس کا علم براہ راست خود اسی ذات کی طرف سے عطا ہوتا ہے جو اس کا ابدی سرچشمہ ہے، یعنی خود خدا کی طرف سے، اور یہی وہ آخری حل تھا جو نو فلاطینیوں نے اختیار کیا اور جس کو ارتیابیت نے ناگزیر کر دیا تھا۔ علمی تفکر کی راہ سے حصول یقین کی مایوسی ہی اس پر مجبور کر سکتی تھی کہ صداقت کو وحی کے اندر پانے کی کوشش کی جائے جو فکر سے بالاتر ہے[1]"

ایک اور فلسفی کہتا ہے۔

"انسان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں، ہاں خدا کے پاس ہے۔ اور مدعی جاہل انسان خدا سے اسی طرح سیکھتا ہے جس طرح بچہ بڑوں سے[2]"

اس جملہ میں جس طرح "بچہ بڑوں سے" کی تشبیہ نہایت بلیغ ہے۔ قائل کی مراد یہ ہے کہ جس طرح بچہ بڑوں سے کوئی بات سیکھتا ہے اور بڑوں کی عظمت وجلالت اور ان پر کامل اعتماد کی اذعانی کیفیت کے قلب پر مستولی ہونے کی وجہ سے بچہ کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خطرہ نہیں گذرتا کہ بڑوں کا سکھایا ہوا سبق

---

[1] جائنٹ کی تاریخ مسائل فلسفہ ص ۱۱۴ [2] لیوس کی سوانحی تاریخ فلسفہ ص ۸۲

Marfat.com

غلط ہوگا۔ اسی طرح انسان جب کسی بات کو اس اذعان کے ساتھ قبول کرتا ہو کہ یہ منجانب اللہ ہے تو اُسے اس وقت کسی تردد و تذبذب سے دوچار ہونا نہیں پڑتا اور وہ اپنے قلب میں اطمینان و سکون کی ایک جاں فروز کیفیت محسوس کرتا ہے۔"

ڈیوڈ ہیوم کو سب جانتے ہیں کہ ارتیابی تھا اور وحی و الہام کا بھی منکر تھا لیکن پھر بھی ایک موقع پر سازِ فطرت کے نغمہ کی ایک ہلکی سی آواز اُس کے زبانِ قلم سے ظاہر ہو ہی گئی۔ وہ لکھتا ہے:۔

"جہاں تک تجربہ اس طرح کے مسائل کی تائید کرتا ہے۔ وہاں تک تو یہ استدلال پر مبنی ہوتے ہیں لیکن ان کی اصلی اور محکم بنیاد وحی و ایمان پر ہے[1]"

مولانا عبدالباری ندوی نے فہمِ انسانی کے دیباچہ میں اسی حقیقت کو نہایت دلچسپ اور بلیغ پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"ظواہرِ عالم کی نسبت ہم بہت کچھ جانتے اور جان سکتے ہیں لیکن حقائقِ عالم کی نسبت کچھ جاننے کا دعویٰ کریں تو نرا جہلِ مرکب ہوگا اور بقول سقراط ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے۔ اس زندگی کو ہم چاہے جتنا سنواریں اور بنائیں لیکن اس کے آگے اور پیچھے کی اگر کچھ فکر ہو تو "اوّل و آخرِ ایں کہنہ کتاب افتادست" نہ پیچھے کا کچھ نشان ملا نہ آگے کی کچھ خبر دے سکتے ہیں سوائے اس کے کہ بس بیچ کے اوراق اُلٹ پلٹ کر لال بجھکڑوں کی طرح ہرن کے پاؤں میں چکّی کا پاٹ باندھتے رہیے، غرض اپنے یا کائنات کے آغاز و انجام حقیقت و ماہیت، غرض و غایت کے بارہ میں، یہ یا اس طرح کے جتنے سوالات یا ان کی تفصیلات ہوں خالص عقل و استدلال نے ان کے بارے میں کبھی اذعان و اطمینان نہیں بخشا، بلکہ فلسفہ سے انسانیت کی یہ پیاس اپنے حلق میں صرف کانٹوں کا اضافہ کرتی رہی اور جہاں انسانی عقل و فہم نے تجربہ کی راہ سے ذرا

---

[1] فہم انسانی ص ۳۳

بھٹک کر اس خارزار میں اپنے دامن کو الجھایا تو خود فلسفہ کی ساری تاریخ گواہ ہو کہ طفلانہ ہمت نے دو ہی چار قدم ڈالے تھے کہ شک اور ریب، جہل اور لاعلمی کے کانٹوں نے ہر طرف سے دامن پکڑنا شروع کیا، ایک نکلا نہیں اور دس نے پکڑا، جال کے اندر جتنا پھڑ کو، وہ اتنا ہی کھال کے اندر گھستا جاتا ہے۔

انسانیت کی بیشتر آبادی ہمیشہ اس وادی میں وحی وایمان کی رہنمائی کو قبول کرکے چلتی رہی عقل کو اگر دخل دیا بھی تو زیادہ تر قبول ہی کے لئے۔ البتہ مغرب جہاں سے آفتاب نکلتا نہیں بلکہ جہاں ڈوبتا ہو وہاں کی نئی پرانی دنیا دونوں کو وحی وایمان سے کچھ قدرۃً بُعد رہا ہے تو اُس کے فلسفہ کی نئی پُرانی دونوں تاریخوں کی جو کم وبیش ڈھائی ہزار سال کی وسعت میں پھیلی ہیں۔ ورق گردانی کر جاؤ، جتنا آگے بڑھتے جاؤ گے اتنا ہی دانش کی جگہ نادانی اور علم کی جگہ لاعلمی سے دوچار ہوتے جاؤ گے۔" (دیباچہ فہم انسانی)

اس حقیقت کو ایک اور مثال سے سمجھئے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے تمام مشاہدات کا تعلق بینائی سے ہے لیکن کیا یہ صحیح ہو کہ مشاہدہ کا انحصار صرف قوت بصارت کے صحیح وسالم ہونے پر ہو؟ ہرگز نہیں! بصارت کے ساتھ ساتھ خارجی روشنی کی بھی ایسی ہی ضرورت ہو جیسی کہ بینائی کی۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی تیز نظر ہو لیکن اگر کوئی خارجی روشنی نہ ہو، آفتاب کی ہو، یا کسی لیمپ یا بجلی کی اور تمام فضا تاریک ہو، تو ظاہر ہے کہ یہ تیز نظری کسی کام کی ثابت نہیں ہوگی پس اسی طرح عقل میں قدرت کی طرف سے جو قوت بصیرت ودیعت رکھی گئی ہو وہ اپنی جگہ مسلم اور درست لیکن جس طرح بصارت بغیر خارجی روشنی کے محض بیکار ہو۔ اسی طرح عقل کی روشنی صرف اُسی وقت کارآمد ہوسکتی ہو جبکہ خارج میں بھی اُس کی رہنمائی کے لئے کوئی قوی روشنی موجود ہو۔ اور یہ روشنی وہی ہے جس کو مذہب کی اصطلاح میں "وحی" کہتے ہیں۔ آیت ذیل میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔

Marfat.com

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ	وہ (خدا) وہی ہے جو خود اور اس کے فرشتے تم پر
لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ	رحمت بھیجتے ہیں تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے نکالکر نور کیطرف
وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا (الاحزاب)	لے آئے اور اللہ مومنوں پر بڑا رحم کرنے والا ہے۔

بصارت اور بصیرت میں صرف ظاہر و باطن کا فرق ہے، ورنہ دونوں کا حال افادہ کے اعتبار سے بالکل یکساں ہے۔ جس طرح آفتاب سماوی کے بغیر بصارت ناکارہ ہے ٹھیک اسی طرح عقل و خرد کی بصیرت خورشید حقیقت کی جلوہ پاشیوں کے بغیر اپنی ذاتی صلاحیتوں کے باوجود قطعاً بے فائدہ ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس روشنی کے بغیر ہی محض عقل کے سہارے چلنا چاہتا ہے تو وہ اُس بیوقوف سے کسی طرح کم درجہ کا احمق نہیں ہے جو نہایت شدید تاریکی میں بھی اپنی آنکھوں پر اعتماد کرکے سرپٹ دوڑنا چاہتا ہے۔

ترجمان حقیقت ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے

انجام خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دوری

افکار کے نغمہائے بے صوت — ہیں ذوقِ عمل کیواسطے موت

دل در سخنِ محمدی بند — اے پورِ علی[ا] زبوعلی چند

ا مشہور مسلمان فلسفی شیخ ابوعلی سینا۔

135306

وحی کے لغوی و اصطلاحی معنیٰ

وحی کے معنیٰ لغت میں حسب ذیل ہیں :-

الوحیُ الاشارۃُ والکِتابۃُ والرسالۃُ — وحی کے معنیٰ اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا دلمیں ڈالنا

والکلامُ الخفی وکل ما القیتہ الیٰ غیرک — چھپا کر بولنا اور جو کچھ تم کسی دوسرے کے خیالمیں ڈالو۔

اشارہ کرنا - ایک شاعر کہتا ہے :-

تریٰ عینہا عینی فتعرف وحیہا — وتعرف عینی ما بہ الوحی یرجع

قرآن مجید میں ہے :-

فَاَوْحٰی اِلَیْھِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُکْرَۃً وَّعَشِیًّا — تو اشارہ سے کہا انکو کہ یاد کرو صبح اور شام

لکھنا - عجاج کا شعر ہے -

حتی نحاھُمْ جَدُّنا والناجی — لقد رکان وحاہ الواحی

"خط اور کتاب" لبید کا شعر ہے جو سبعہ معلقہ کے چوتھے معلقہ میں ہے -

فَمَدَافِعُ الرَّیَّانِ عُرِّیَ رَسْمُھَا — خَلَقًا کَمَا ضَمِنَ الوُحِی سلامُھا

"حکم دینا" عجاج کہتا ہے -

وحی لھا القرار فاسْتَقَرَّت — وشَدَّھا بالراسیات الثُّبت

"چھپا کر بات کرنا" ابو ذویب کہتا ہے :-

فقال لھا وقد اوحت الیہِ — آلا لِلّٰہِ اُمُّکِ ما تعیف

"آواز" ابو زبیدہ کا مصرعہ ہے۔

مرجّن الجرف یوحی اعجم

لیکن اہل لغت کہتے ہیں کہ اس لفظ کے معنی دوسروں سے چھپا کر کسی سے چپکے چپکے بات کرنے کے ہیں کسائی عرب کا محاورہ بتاتا ہے "وحیت الیہ بالکلام واوحیۃ الیہ ہو ان یکلم بکلام تخفیہ من غیرہ" یعنی کسی سے اس طرح باتیں کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ" ابو اسحاق لغوی کہتا ہے "واصل الوحی فی اللغۃ کلّہا اعلام فی خفاءٍ" وحی کا اصل مفہوم تمام لغت میں چھپا کر اطلاع دینا ہے۔

قرآن مجید میں بھی یہ لفظ متعدد معنوں میں آیا ہے۔

شیطان کا وسوسہ پیدا کرنا۔

یُوحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ وَّاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ	انکے بعض بعض کو وحی کرتے ہیں اور بیشبہ شیطان
لَیُوْحُوْنَ اِلٰی اَوْلِیَآءِهِمْ	اپنے دوستوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتے ہیں

دل میں کسی بات کا ڈال دینا

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی اَنْ	اور ہم نے موسیٰ کی ماں کے دلمیں یہ بات
اَرْضِعِیْهِ	ڈالی کہ تم اُن کو دودھ پلاؤ۔

اس آیت میں بھی وحی دل میں بات ڈالنے کے معنی میں ہے۔

وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ	اور جبکہ میں نے (حضرت عیسیٰ) کے حواریوں کے دل میں
اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ	یہ بات ڈالی کہ تم مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لے آؤ

فطری حکم جس کو وحی نوعی بھی کہتے ہیں۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ	اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو وحی کی کہ تو پہاڑوں
مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا	میں گھر بنالے۔

Marfat.com

کام پر مقرر کرنا

وَاَوْحیٰ فِیْ کُلِّ سَمَاءٍ اَمْرَهَا — اور خدا نے ہر آسمان کو اُس کے کام پر مقرر کر دیا

پھر یہ فطری حکم ذی روح کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ بے جان چیزوں کے لئے بھی وحی کا لفظ فرمایا گیا ہے مثلاً اس آیت میں۔

یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بِاَنَّ — اُس دن زمین اپنا سب احوال بتائیگی کیونکہ آپکے

رَبَّکَ اَوْحیٰ لَهَا۔ — ربنے اس کو ان باتوں کی ہدایت دیدی ہے

چپکے بات کرنا۔

یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلیٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ — یہ ایک دوسرے کو چکنی چپڑی باتیں وحی کرتے ہیں

وحی کے یہ معانی لغت کے اعتبار سے تھے لیکن شریعت اسلام کی اصطلاح میں وحی خاص اس ذریعۂ غیبی کا نام ہے جس کے ذریعہ غور و فکر، کسب و نظر، اور تجربہ و استدلال کے بغیر خاص اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اُس کے فضل و لطفِ خاص سے کسی نبی کو کوئی علم حاصل ہوتا ہے۔ وحی کا استعمال اس معنیٰ خاص میں اس کثرت سے ہوا ہے کہ اس معنیٰ میں منقولِ شرعی بن گیا ہے اور اس لئے جب کسی نبی کے ذکر میں وحی کا لفظ بولا جائے گا تو اُس سے لامحالہ یہی معنیٰ مراد ہوں گے۔ چنانچہ قرآن مجید کی آیات اسکی شاہد ہیں، اور جس کا ثبوت آیندہ باب سے مل جائے گا

اس کی مثال لفظ صلوٰۃ و زکوٰۃ اور حج کی سی ہے کہ اگرچہ ان کے لغوی معنیٰ اُن معانی مصطلحہ سے مختلف ہیں جن کے لئے اسلامی شریعت میں یہ مخصوص ہو چکے ہیں لیکن اصطلاحی معانی میں انکا استعمال اس کثرت سے ہوتا ہے کہ اب ان کے علاوہ کسی معنیٰ میں یہانتک کہ لغوی معنیٰ میں بھی انکا استعمال صحیح نہیں ہے البتہ ہاں اگر سیاق یا سباق میں کوئی قرینہ ہو تو اُس وقت کوئی دوسرے معنیٰ مراد لئے جا سکتے ہیں پس اسی طرح جب وحی کا لفظ مطلقاً بولا جائیگا تو اُس سے مُراد یہی اصطلاحی معنیٰ خاص مراد ہونگے لیکن قرینہ کے

موجود ہونے کی صورت میں دوسرے معنی بھی مراد لئے جاسکتے ہیں جیساکہ مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے۔

وحی اور الہام کا فرق | اس موقع پر وحی اور الہام کا فرق بھی معلوم کر لینا چاہئے۔ وحی کے معنی اوپر معلوم ہو چکے۔ الہام کے لغوی معنی ہیں "القاء الشئ فی القلب دل میں کسی چیز کا ڈالنا۔ قرآن مجید میں ہے۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا — اللہ نے نفس انسانی کو بُری باتوں اور نیک باتوں دونوں کا الہام کر دیا ہے۔

وحی اور الہام میں یہ امر تو مشترک ہے کہ دونوں کسی چیز کے معلوم کر لینے کا ذریعۂ غیبی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ الہام ایسا وجدان ہے جو نفس کو حاصل ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ شئ مطلوب کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ علم کا مبدا، کیا ہے، گویا یہ وجدان بھوک، پیاس، غم اور خوشی کے وجدان کی طرح ہے۔ بخلاف وحی کے کہ اُس میں علم کا مبدا پورے طور پر معلوم ہوتا ہے پھر ان میں ایک مابہ الفرق یہ بھی ہے کہ الہام نبی اور غیر نبی دونوں کو ہوتا ہے لیکن وحی انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی غیر نبی کو علم کا یہ ذریعۂ غیبی میسر نہیں ہو سکتا۔

وحی کی حقیقت | وحی کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس کا صحیح علم تو بجز خدا کے اور کسے ہو سکتا ہے۔ البتہ فلاسفہ نے اپنی بساط کے مطابق کچھ پتہ چلانے کی فکر کی ہے لیکن اس کا حاصل اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وحی کے امکان وجواز میں جو بظاہر عقلی استبعاد نظر آتا ہے اُسے دور کریں اور یہ ثابت کر دیں کہ علم و اطلاع کے جس ذریعۂ غیبی کو وحی کہتے ہیں اُس کا تحقق انسان کے باطنی قوی اور ملکات کی دریافت وتحقیق کی روشنی میں ناممکن نہیں ہے۔ فلاسفۂ یونان کے تتبع میں متکلمینِ اسلام نے بھی اس رَوِش کو اختیار کیا ہے اور اُنھوں نے بھی فلسفہ کی تحقیق اور اس کی اصطلاحات کی روشنی میں وحی کی حقیقت کا کھوج لگانے کی سعی کی ہے تاکہ وہ اُن اعتراضات و شکالات کا جواب دے سکیں جو وحی ایسی مابعد الطبیعی چیزوں پر فلسفہ کیطرف سے کئے جاتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان ائمہ اسلام کی نیت نہایت مبارک اور پاک تھی، اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف

Marfat.com

سے اُن کو اجرِ جبرئیل بھی عطا ہوگا۔ لیکن اس راہ سے اصل حقیقت کا سُراغ پانے میں کس حد تک کامیاب ہو سکے ہیں؟ اس کا جواب نہایت مشکل ہے۔ ہم ذیل میں محض اسی رفعِ استبعاد کے نقطۂ نظر سے، اور نیز یہ دکھانے کے لئے کہ وحی کی حقیقت کی تشریح و بیان کے سلسلہ میں فلسفہ کہاں تک پرواز کر سکا ہے۔

امام غزالی اور دوسرے متکلمین کی آراء۔ اس باب میں امام غزالی اور بعض فلاسفۂ اسلام کا بیان نقل کرتے ہیں مقاصد المراصد میں ہے۔

واما الوحی والالهام فالنفس الناطقة	باقی وحی اور الہام تو اُن کی حقیقت یہ ہے کہ
اذا کانت قویة بحیث لم یکن	نفس ناطقہ جب اس قدر قوی ہوتا ہے کہ بدن
اشتغالها بالبدن مانعاً من الاتصال	کے ساتھ مشغول ہونے کے باوجود مبادی قدسیہ
بالمبادی القدسیة وکانت المتخیلة	سے متصل ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ قوتِ متخیلہ
قویة بحیث تقوی علی استخلاص	اس قدر قوی ہوتی ہے کہ حس مشترک کو حواس
الحس المشترک عن الحواس الظاهرة	ظاہری سے نجات دے سکتی ہے تو نفس ناطقہ
اتصلت حالة الیقظة بالعقول	بیداری کی حالت میں بھی عقول مجردہ اور نفوس
المجردة والنفوس السماویة وحصل	سماویہ سے متصل ہو جاتا ہے اور اس کو غیب
لها ادراک المغیبات علی وجه کلی	کی باتوں کا ادراک کلی طور پر ہوتا ہے اور پھر قوت
ثم المتخیلة تحاکیها بصورة جزئیة	متخیلہ اس کے مشابہ ایک جزئی صورت پیدا کر لیتی
مناسبة لها وتنزل الی الحس المشترک	ہے یہ صورت حس مشترک میں اُتر کر مشاہد اور محسوس
فتصیر مشاهدة محسوسة وقد یعرض	ہو جاتی ہے اور بعضوں کو یہ پیش آتا ہے کہ وہ
بعضهم ان یسمع کلاماً منظوماً او یشاهد	مسلسل کلام سنتے ہیں یا کوئی اچھی صورت دیکھتے
منظراً بهیاً یخاطبه بکلام منظوم فیما	ہیں جو اُن سے مسلسل الفاظ کے ذریعہ سے باتیں کرتی ہے

Marfat.com

يَتَعَلَّقُ بِأَحْوَالِهِ وَأَحْوَالِ مَا يَقْرُبُ مِنْهُ — یہ باتیں خود انھیں کے متعلق ہوتی ہیں یا اُن کے تعلقات کے متعلق۔

اِس کے علاوہ معارج القدس میں نبوت کے زیرِ عنوان امام غزالی نے جو بسیط مضمون لکھا ہے اُس میں ایک فصل نبوّت کے خواص میں ہے اُس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

ولها خواص ثلث احدها تابعة لقوة التخيل والعقل العملى — نبوت کے تین خاصے ہیں، ایک خاصہ قوت تخیل اور عقل عملی کا تابع ہے۔

اس کے بعد اس خاصہ کو بہت شرح وبسط سے بیان کیا ہے جس کا حاصل وہی ہے جو مقاصد المراصد کی مندرجۂ بالا عبارت سے مستفاد ہوتا ہے۔

ابنِ سینا کی رائے | اس مضمون کو شیخ بوعلی سینا کے حوالہ سے ابوالبقا نے مختصر اور جامع ومانع الفاظ میں اسی طرح ادا کیا ہے چنانچہ تعریفات میں جہاں وحی کی تعریف لکھی ہے لکھا ہے

فنحن نرى الاشياء بواسطة الحس والنبى يرى الاشياء بواسطة القوى الباطنة ونحن نرى ثم نعلم والنبى يعلم ثم يرى — ہم حس کے واسطے سے اشیا کو دیکھتے ہیں اور نبی اشیا، کو قویٰ باطنہ کے ذریعہ دیکھتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں پھر جانتے ہیں اور نبی جانتا ہے پھر دیکھتا ہے۔

اس کے علاوہ شیخ ابوعلی بن سینا نے اپنی متعدد کتابوں میں وحی، الہام اور معجزات وخوارق عادت پر کلام کیا ہے۔ اشارات کا ایک مستقل عنوان اسی بحث کے لئے وقف ہے۔ رسالہ الفعل والانفعال میں لکھا ہے۔

"وحی اور کرامات تاثیر النفسانی فی النفسانی میں داخل ہیں، کیونکہ وحی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کسی امر عقلی کا القا خفی اُن نفوس بشریہ میں ہے جو اس القا کو قبول کرنے کی استعداد رکھتے ہوں۔ اگر یہ القا، جاگنے کی حالت میں ہو تو اسے وحی کہتے ہیں۔ اور

اگر نیند کی حالت میں ہو تو اس کا نام نفث فی الروع ہے "

(مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن صـ۳)

اس کے بعد نفث فی الروع کی چند مثالیں احادیث سے نقل کی ہیں۔

ابنِ سینا کی یہ وحی کی تعریف نہایت مجمل اور مغالطہ انگیز ہے۔ اپنے ایک اور رسالہ "الرسالۃ العرشیہ" میں خدا کی صفات پر بحث کے ضمن میں صفتِ کلام پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"خدا کی ساتویں صفت متکلم ہونا ہے۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ وہ ذات واحد ہے، اور علل اربعہ سے منزہ ہے۔ اس بنا پر اُس کے متکلم ہونے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اس کے لئے عبارتیں پائی جاتی ہیں، یا اُس کے لئے نفس کے خطرات اور فکر و تخیل کے ادراکات پائے جاتے ہیں جن پر الفاظ دلالت کرتے ہیں بلکہ خدا کے متکلّم ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اُس کی طرف سے بواسطہ قلم نقاش جس کو عقل فعال یا مقرب فرشتہ کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے لوح قلب پر علوم کا فیضان ہوتا ہے پس کلام خدا اُن علوم کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص ہیں اور علم میں تعدد و تکثر نہیں ہوتا جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَۃٌ کَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ — اور ہمارا کام تو بس ایک دم کی بات ہے۔ جیسے لپک نگاہ کی۔

تعدد اور تکثر تو حدیث نفس اور خیال و حس میں ہوتا ہے۔

اصل میں یہ صورت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ کے ذریعہ علم غیب کو حاصل کرتے تھے۔ اور قوتِ تخیل اس کو قبول کر کے مختلف حروف واشکال کی صورت سے مصور کر دیتی تھی، اس کے بعد نفس کی لوح جواب تک خالی ہوتی تھی اسمیں یہ عبارتیں اور صورتیں منتقش

Marfat.com

ہوجاتی تھیں، اب ان سب کا اثر یہ ہوتا تھا کہ آپ منظوم ومرتب کلام سنتے تھے اور ایک انسانی جسم کو دیکھتے تھے۔ پس اسی کا نام وحی ہے، الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا نفس مبارک ایک صاف وشفاف صیقل شدہ آئینہ کی طرح تھا جس میں القاکرنیوالے اور وہ معانی ومطالب جن کا القا کیا جاتا تھا۔ دونوں مصور ہوجاتے تھے کبھی ان معانی منقشہ کا ظہور عبرانی زبان میں ہوا اور کبھی عربی میں، گویا یوں کہیئے کہ مصدر ایک ہے اور مظاہر متعدد ہیں۔ اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نفس یا ذہن کے ذریعہ کس طرح ملائکہ کی رویت کرلیتے تھے، کیونکہ حس کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی محسوسات کو حواس ظاہری کیواسطے سے قبول کرتی ہے اور کبھی مشاعرِ باطنہ کیواسطہ سے، ہم میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں فرق یہ ہے کہ ہم پہلے دیکھتے ہیں پھر جانتے ہیں اور آنحضرتؐ پہلے جانتے پھر دیکھتے تھے۔

(مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ص ۱۲)

حافظ ابن تیمیہ کی رائے لیکن اس معاملہ میں حافظ ابن تیمیہؒ نے مجموعۃ الفتاوی اور بعض تصنیفات میں زیادہ صاف بیانی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے ابن سینا اور اُسؑ کے ہم خیال فلاسفہ کی تغلیط کی ہے اور ساتھ ہی امام غزالی پر نکتہ چینی کی ہے کہ وہ بھی فلسفہ سے مرعوب ہوکر وحی اور نبوت کے باب میں بعض ایسی باتیں بیان کرگئے ہیں جو قرآن وحدیث کی تصریحات کے خلاف ہیں، اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہ عقل فعّال کے وجود سے انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر عقل فعال کا وجود صحیح تسلیم کرلیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت وہبی نہیں کسبی ہے

بہرحال قرآن مجید سے وحی کے متعلق جو معلوم ہوتا ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ فرشتہ (جو فلاسفہ کے قول کے مطابق نفسِ انسانی کی صفات کا نام نہیں بلکہ وہ جواہر مجردہ اور قائمہ بالذات ہیں) خدا کا پیغام لیکر آنحضرت صلی اللہ پر نازل ہوتا تھا اور آپ کے قلب مطہر پر اس پیغام الٰہی کا القا کرتا تھا۔

وحی کی مختلف صورتیں

احادیث سے معلوم ہوتا ہے آپ پر وحی مختلف طریقوں سے نازل ہوتی تھی۔ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد جلد اوّل میں انھیں حدیثوں کے پیش نظر وحی کی حسب ذیل صورتیں بیان کی ہیں۔

۱۔ رویائے صادقہ	سچ خواب دیکھنا
۲۔ نفث فی الروع یا القاء فی القلب	دل میں پھونکنا یا دل میں ڈالنا
۳۔ صلصلۃ الجرس	گھنٹہ کی آواز کی طرح آنا
۴۔ تمثّل	فرشتہ کا کسی شکل میں متشکل ہو کر نظر آنا

۵۔ فرشتہ کا اپنی اصلی صورت میں نظر آنا۔

۶۔ وہ طریقہ مکالمہ جو معراج میں پیش آیا

۷۔ بلا واسطہ مکالمہ

اب ہم ہر ایک کو تفصیل سے لکھتے ہیں۔

رویائے صادقہ رویائے صادقہ کے معنیٰ ہیں سچا خواب، یعنی جو کچھ رات کو خواب میں دیکھا فوراً ہی یا کچھ دنوں کے بعد بعینہٖ اس کے مطابق کوئی واقعہ ظاہر ہوگیا۔ اس خواب کو نبوت کا چھیالیسواں جزء بتایا گیا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوسعید الخدری سے روایت ہے "الرؤیا الصالحۃ جزء من ستۃ واربعین جزءاً من النبوۃ"۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہیئے کہ رویاء صادقہ کو نبوۃ کا جزء محض اس لئے فرمایا گیا ہے کہ جس طرح نبی کی خبر بالکل صحیح ہوتی ہے اور اس میں کذب و دروغ کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا

Marfat.com

اسی طرح یہ خواب بالکل سچا ہوتا ہے جو رات کو خواب میں نظر آیا۔ دن کو وہی آنکھوں نے دیکھ لیا۔

یہی وجہ ہے کہ رویا، صادقہ کو نبوت کا جزء قرار دیا گیا ہے رسالت کا نہیں کیونکہ نبوت کے معنی بعض غیبی امور سے واقف ہونا اور ان کی اطلاع دینا ہے اور چونکہ رویا، صادقہ میں بھی یہی ہوتا ہے اس لئے اس کو نبوت کا ایک جزء کہا جا سکتا ہے لیکن رسالت کا مقام اس سے بلند ہے اس کے مفہوم میں احکام شرعیہ کی تبلیغ و اشاعت اور اوامر و نواہی سے لوگوں کو خبردار کرنا داخل ہے۔ ظاہر ہے رویا، صادقہ کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

یہی رویا، صادقہ ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ہوا۔ صحیح بخاری کے پہلے باب میں حضرت عائشہ سے روایت ہے۔

اول ما بدیٔ بہٖ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرویا الصالحۃ فی النوم فکان لا یریٰ رویا الا جاءت مثل فلق الصبح	سب سے پہلی وہ چیز جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ہوا نیند میں رویا، صالحہ ہے حضور جو خواب دیکھتے تھے وہ صبح کے تڑکے کی طرح صحیح نکلتا تھا۔

لہ یہ واضح رہنا چاہیئے کہ انبیاء کرام کا خواب ہمارے خواب اور اُن کی نیند ہماری نیند کی طرح نہیں ہوتی۔ اس عالم میں اُن کی آنکھیں اگرچہ بند ہوتی ہیں لیکن دل بیدار ہوتا ہے۔ بخاری میں ہے۔

تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم — ان کی آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی نسبت فرماتے ہیں تنام عینی ولا ینام قلبی، اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ عربی زبان میں رویا صرف اس خواب کو کہتے ہیں جو کسی حقیقت کے اخبار و اعلام یا اُس کی جانب اشارہ و ایما پر مبنی ہو، عام خواب جس میں شیطانی وساوس کو زیادہ دخل ہو اُسے حلم جمع احلام کہتے ہیں۔

چنانچہ بخاری کتاب الرویا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے۔ (بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ پر)

Marfat.com

رویائے صادقہ سے آغاز وحی کی حکمت حافظ ابن حجر خواب سے وحی کے آغاز کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ عالمِ بیداری میں حضور پر پورے پر جو وحی نازل ہونے والی تھی اس کے لئے بطور تمہید و توطیہ پہلی وحی خواب کے ذریعہ نازل کی گئی تاکہ آپ اس طرح خوارقِ عادات ایسی چیزوں کے لئے یک گونہ عادی ہو جائیں۔

نفث فی الروع دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتے آپ کے قلب پر بغیر نظر آئے کسی بات کا القاء کر دیتا تھا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "روح القدس نے میرے قلب میں یہ بات ڈال دی کہ کوئی نفس اُس وقت تک نہیں مریگا جبتک کہ وہ اپنے رزق کی تکمیل نہیں کرلیگا پس تم اللہ سے ڈرو اور طلب میں خوش روشی سے کام لو اور خبردار رہو کہ کہیں رزق کا متاخر ہو جانا تم کو اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ اللہ کی معصیت کی راہ سے اس رزق کو طلب کرو کیونکہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی طاعت و بندگی سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

الرؤیا من اللہ والحلم من الشیطان — رویا اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور حلم شیطان کیطرف سے

پھر ان خوابوں میں جو خوابہائے پریشان ہوتے ہیں انھیں اضغاثِ احلام کہتے ہیں۔ سورۂ یوسف کی آیت ذیل میں تینوں لفظ جمع ہو گئے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ

اے درباریو اگر تم خوابوں کی تعبیر بیان کر سکتے ہو تو میرے خواب کے بارے میں اپنی رائے بیان کرو۔ ان لوگوں نے کہا "یہ تو اوہام پریشان ہیں اور ہم ان اوہام و خیالات کی تعبیر سے واقف نہیں۔"

لیکن حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیریؒ کی تحقیق یہ ہے کہ رویا کے معنی خواب کے نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ایسی حالت کا نام ہے جو نہ پورے طور پر بیداری ہے اور نہ کامل نیند بلکہ ان دونوں کی ایک درمیانی حالت ہے حضرت الاستاذ فرماتے ہیں کہ یہ میرا ذاتی خیال تھا لیکن مدت کے بعد علامہ فرید وجدی کی دائرۃ المعارف دیکھنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ میں جو کچھ رویا کی حقیقت سمجھتا تھا وہی بعینہٖ محققینِ یورپ کا خیال ہے۔ (فیض الباری مطبوعہ مصر ج ۱ صفحہ ۲۲)

Marfat.com

صلصلۃ الجرس | تیسری صورت یہ تھی کہ وحی صلصلۃ الجرس یعنی گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی تھی صحیح بخاری میں ہے "حارث بن ہشام نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا "کبھی کبھی وحی میرے پاس گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ میرے اوپر سخت ترین ہوتی ہے جب یہ مجھ سے منقطع ہوتی تھی تو فرشتہ جو کچھ کہتا تھا وہ سب مجھ کو یاد ہو جاتا تھا (باب بدء الوحی)

وحی کی اس خاص نوعیت کو سمجھنے کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ صلصلۃ اصل میں اس آواز کو کہتے ہیں جو لوہے کے ایک ٹکڑے کو دوسرے ٹکڑے پر مارنے سے پیدا ہوتی ہے لیکن پھر اس میں توسع کر لیا گیا ہے اور اس لفظ کا اطلاق ہر اُس آواز پر ہونے لگا ہے جس میں جھنجھناہٹ (طنین) ہو۔ وحی کی آواز کو اس آواز سے تشبیہ دی گئی ہے اور وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح گھنٹہ کی آواز صوتِ محض کی صورت میں سنائی دیتی ہے اور اُس کا کوئی مبدا، و مقطع نہیں ہوتا۔ اسی طرح وحی یا پیغامبر وحی کی اس آواز میں بھی کوئی مبدا، یا مقطع نہیں ہوتا تھا۔ اس بنا پر یہ آواز مرکب نہیں بلکہ بسیط ہوتی تھی۔ شیخ اکبر محی الدین بن عربی نے وجہ شبہ یہ بیان کی ہے کہ جس طرح گھنٹہ کی آواز کے لئے کوئی جہتِ خاص نہیں ہوتی بلکہ وہ تمام جوانب وجہات سے سُنائی دیتی ہے اسی طرح وحی کی اس آواز کے لئے بھی کوئی جانب یا جہت نہیں ہوتی تھی حضرت الاستاذ نے اس وجہ شبہ کو نہایت لطیف کہا ہے[1]، لیکن خود ایک جگہ فرماتے ہیں۔

وصلصلۃ الجرس ھھنا کنقرات	اور نزول وحی کیوقت گھنٹہ کی سی آواز ٹیلیگرام کی گھڑگھڑاہٹ
التلغراف لاداء الرسالۃ[2]	کی طرح ہے جو پیغام رسانی کے لئے کی جاتی ہے۔

اس تشبیہ سے اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ تار کی گھڑگھڑاہٹ میں آواز تو سنائی دیتی ہے لیکن بولنے والا نظر نہیں آتا۔ اسی طرح وحی کی اس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محض آواز سنتے تھے لیکن بولنے والا نظر نہ آتا تھا۔

---

[1] فیض الباری مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۱۹ [2] مشکلات القرآن ص ۱۲۴

Marfat.com

اس حالت کی شدت | جیسا کہ صلصلۃ الجرس والی حدیث میں مذکور ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حالت بہت شاق گذرتی تھی حضرت عائشہ فرماتی ہیں "آپ پر وحی نازل ہوتی تھی اور دن نہایت سرد ہوتا تھا پھر بھی (وحی کے بارے) آپ پر دباؤ اس قدر شدید ہوتا تھا کہ آپ کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلتا تھا، اور اگر آپ کسی سواری پر ہوتے تھے تو سواری بوجھ کے مارے زمین پر بیٹھ بیٹھ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طرح وحی آئی حضرت زید بن ثابت اُس وقت آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور سید کونین کا فرق مبارک ان کی ران پر تھا حضرت زید پر وحی کا اتنا شدید بار رہا کہ اُن کا جسم دبا جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پارہ پارہ ہو جائے گا۔

حضرت عبادۃ بن صامت کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ کو اضطراب پیدا ہو جاتا اور چہرہ مبارک کا رنگ بدل جاتا۔ آپ اس وقت سر جھکا لیتے اور جو صحابہ آپ کے پاس بیٹھے ہوتے تھے وہ بھی سر نیچا کر لیتے تھے، وحی کے بعد آپ سر اُٹھاتے تھے[1]

صفوان بن یعلی بن اُمیہ بیان کرتے ہیں کہ یعلی کو بڑی خواہش تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی ہوئی دیکھیں، خدا نے اُن کی مراد پوری کی۔ ایک مرتبہ جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ میں قیام فرما تھے یعلی کو یہ سعادت نصیب ہو گئی اُس کی تفصیل یہ ہے کہ جعرانہ کے دوران قیام میں آں حضرت صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا جس نے خوشبو لگا رکھی تھی اور سوال کیا "اے رسول اللہ! آپ اس شخص کی نسبت کیا فرماتے ہیں جس نے ایک خوشبو لگے ہوئے جبہ میں ہی احرام کی نیت کر لی" یہ سوال سنکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی دیر انتظار فرمایا، یہانتک کہ آپ پر یکایک وحی نازل ہوئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ حضور کا چہرہ مبارک سُرخ ہے اور سانس بھی تیز ہو گیا ہے جیسے کوئی تھکا ہوا ہو، تھوڑی دیر کے بعد جب یہ کیفیت دور ہو گئی تو آپ نے سائل کو بُلا کر

---

[1] یہ واقعہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کیف نزل الوحی کے ماتحت ہی بیان کیا ہے۔

Marfat.com

اُس کے سوال کا جواب دیا۔ [1]

ایک سوال اور اس کا جواب اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وحی وحی تو سب برابر ہے پھر اس کی وجہ کیا ہے کہ آپ پر وحی کی یہ قسم (صلصلۃ الجرس) بقیہ طرقِ وحی کی بہ نسبت زیادہ گراں گذرتی تھی؟ اگر ایک نوعِ وحی کا تحمل بہ آسانی ہو سکتا تھا تو اس نوعِ وحی کا تحمل کیوں دشوار تھا؟ اس کا جواب جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے، یہ ہے کہ انسان میں دو قوتیں ہیں ایک قوتِ بشریت اور دوسری قوتِ ملکیت، پھر فرشتے جب اُن نفوسِ قدسیہ پر نازل ہوتے ہیں جن میں نبوت کی استعداد ہوتی ہے تو ان کو ظلمتِ بشری سے نکل کر عالم نور میں آنے کی وجہ سے سخت کش مکش اور مزاحمت باطنی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کش مکش کی وجہ سے ان کے تمام اعصاب متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال اس طرح سمجھئے کہ انسان نیند کی حالت میں کوئی ہیبت انگیز خواب دیکھتا ہے تو اگرچہ اُس خواب کا تعلق جسم سے نہیں ہوتا لیکن نفس کے تعلق بالجسم کے باعث اس خواب کا اثر جسمانی اعضاء و جوارح پر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے صلصلۃ الجرس کی تشریح بھی اسی تاثر و انفعال کی روشنی میں کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

واما الصلصلۃ فحقیقتہا ان الحواس	رہا صلصلۃ تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ حواس سے
اذا صادمہا تاثیر قوی تشوشت فتشوش	جب کوئی قوی تاثیر متصادم ہوتی ہے تو وہ متشوش
قوۃ البصر ان یری الوانا الحمرۃ والصفرۃ	ہو جاتے ہیں چنانچہ قوتِ بصر کی تشویش یہ ہے کہ
والخضرۃ ونحو ذالک وتشویش قوۃ	مختلف رنگ مثلاً سرخی، زردی اور سبزی نظر
السمع ان یسمع اصواتا مبہمۃ کالطنین	آئیں وغیرہ ذالک، اور قوتِ سمع کی تشویش یہ
والصلصلۃ والہمہمۃ فاذا تم الاثر	ہے کہ مبہم آوازیں سُنائی دیں مثلاً طنین صلصلۃ

[1] صحیح بخاری باب نزل القرآن بلسان قریش

حصل العلم — اور سمجھ، پھر جب اثر تمام ہو جاتا ہے علم حاصل ہو جاتا ہے

حجۃ اللہ البالغہ میں ہی ایک دوسرے مقام پر باب الایمان بصفات اللہ تعالیٰ کے ماتحت اسی مضمون کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

وربما یحصل عند توجہ الی الغیب — اور بسا اوقات نبی کے غیب کی طرف متوجہ ہونے

وانقہار الحواس صوت صلصلۃ الجرس — اور حواس کے مغلوب ہونے کی صورت میں گھنٹہ

کما قد یکون عند عروض الغشی من — کے بجنے کی سی آواز آتی ہے جیساکہ غشی کے عالم

رویۃ الوان حمر وسود[1] — میں سُرخ اور سیاہ رنگ نظر آتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ یہ وہ خاص وقت ہوتا تھا جبکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم عالم مادیت سے ورارالورار ہو کر ملاءِ اعلیٰ سے بہت زیادہ قریب ہو جاتے تھے اور اُس وقت اگرچہ آپ کے حواسِ ظاہری میں تشویش پیدا ہو جاتی تھی لیکن ساتھ ہی آپ کی تمام روحانی قوتیں باطنی احساس وشعور اور ملکوتی صفات وخصائص مکمل طور پر عالم لاہوت کے جلوہ زار میں پہنچ جاتے تھے اور وہاں آپ وہ سنتے تھے جسے دوسرے نہیں سُن سکتے اور ان حقائق سے علیٰ وجہ الیقین آشنا ہوتے تھے جنکو نہ مادّی حواس محسوس کر سکتے ہیں اور نہ جسمانی آلاتِ ادراک وشعور انھیں دریافت کر سکتے ہیں اور چونکہ اس وقت آپ کی جہتِ بشری اور جہتِ ملکوتی میں تصادم ہوتا تھا اس لئے اُس کا اثر آپ کے اعضاء واعصاب پر بھی پڑتا تھا اور اس اثر کے باعث آپ کو گھنٹہ کی سی آواز سنائی دیتی تھی جبینِ اقدس عرق آلود ہو جاتی تھی اور اس تاثر میں اس درجہ شدت ہوتی تھی کہ آپ کے پاس جو صاحب بیٹھے ہوتے تھے انھیں بھی اس حالت کا بیّن طور پر احساس ہوتا تھا جب یہ کش مکش ختم ہو جاتی تو آپ کی یہ حالت یعنی اعصاب کا تاثر بھی زائل ہو جاتا تھا اور تمام وحی من وعن آپ کو یاد ہو جاتی تھی، چنانچہ حدیث کے الفاظ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۲۰۶ جدید اڈیشن۔

Marfat.com

فیفصم عنی وقد وعیت عنہ | وحی مجھ سے جب منقطع ہوجاتی تھی تو مجھ کو اسوقت سب کچھ یاد ہوجاتا تھا۔

میں اس امر کا ہی اظہار فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کو صلصلۃ الجرس کے لفظ سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ آپ محض آواز سنتے تھے اور وحی کا مضمون نہیں سمجھتے تھے۔ یا وحی کا مضمون اسوقت سمجھ لیتے تھے، لیکن وہ آپ کو محفوظ نہیں رہتا تھا۔ غور کیجئے بصیغہ ماضی وَعَیتُ فرمانا اُس مضمون کو زیادہ موکد اور موثق طریقہ پر بیان کرنے کے لئے ہی ہو۔

مزید تشریح | صلصلۃ الجرس کی مخصوص نوعِ وحی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مقام پیش آتا تھا اس کا تعلق محض رُوح اور نفس سے ہو اس لئے اس کی تشریح اگر کوئی کرسکتا ہے تو صرف وہی شخص کرسکتا ہو جو اپنی باطنی اور رُوحانی قوتوں کے باعث عقل اور نفس کے ملکات اور عالم تجرد کے ساتھ ان دونوں کے تعلقات سے آگاہ ہو حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی سے بڑھ کر ان اسرار ورموز کا محرم کون ہوگا! آپ حجۃ اللہ البالغہ کی جلد دوم بحث فی المقامات والاحوال میں فرماتے ہیں۔

ان القلب لہٗ وجہان وجہ یمیلُ	قلب کے دو رُخ ہیں۔ ایک رخ بدن اور اعضاء کی
الی البدن والجوارح ووجہٗ یمیل	طرف مائل رہتا ہے اور دوسرا رخ تجرد اور صرافت
الی التجرد والصرافۃ وکذالک العقل	کی طرف متوجہ رہتا ہے اسی طرح عقل کے بھی دو رخ ہیں
لہ وجہان وجہٌ یمیل الی البدن	ایک رخ بدن اور حواس کی طرف مائل ہوتا ہو اور
والحواس ووجہ یمیل الی التجرد	دوسرا رخ تجرد اور بساطتِ محض کی جانب،
والصرافۃ فسموا مایلی الجانب السفلی	پس جو رُخ جانب اسفل سے متصل ہے اسے قلب
قلباً وعقلاً وما یلی الجانب الفوق	اور عقل کہتے ہیں اور جو جانبِ فوق سے ملا ہوا ہو اُسے
روحاً وسراً فصفۃ القلب الشوق	روح اور سر کہتے ہیں اور قلب کی صفت شوق

Marfat.com

المزعج والوجد وصفة الروح	بے پایاں اور وجد ہے، روح کی صفت مانوس و
الانس والانجذاب وصفة العقل	منجذب ہونا ہے اور عقل کی صفت ان چیزوں پر
اليقين بما يقرب مأخذه من مأخذ	یقین کرنا ہے جن کا ماخذ علومِ عادیہ (رسمیہ) سے
العلوم العادية كالايمان	قریب ہو جیسے ایمان بالغیب اور توحید افعالی
بالغيب والتوحيد الافعالي وصفة	اب رہا سِر تو اس کا کام ان حقائق کا مشاہدہ کرنا ہے
السر شهود ما يجل عن العلوم	جو علومِ عادیہ سے بلند و بالا ہیں، اس کے معنی بجز
العادية وانما هو حكايةٌ ما عن	اس کے کچھ اور نہیں کہ یہ اُس مجردِ محض سے حکایت
المجرد الصرف الذي ليس في	ہوتی ہے جو نہ زمان میں ہے اور نہ مکان میں اور
زمانٍ ولا مكانٍ ولا يوصف	جو نہ کسی وصف سے موصوف کیا جا سکتا ہے اور
بوصفٍ ولا يشار اليه باشارة	نہ جس کی طرف کوئی اشارہ ہو سکتا ہے۔

غور کیجئے! حضرت شاہ صاحب نے کس خوبی اور وضاحت سے بتایا ہے کہ روح کی صفت اُنس اور انجذاب ہے اور سر کی صفت شہود و معائنہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ روح کی صفت انفعالی ہے اور سر کی صفت فعلی ہے۔ ان کیفیتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی سعادتمند روح پر جب آفتابِ حقیقت پرتو فگن ہوتا ہے تو اس کی شعاعیں شبنم کے قطروں کی طرح اس روح کو اپنے جلوہ گاہ انوار میں جذب کر لیتی ہیں۔ پھر عقل کا دوسرا رُخ جو جانبِ فوق سے متصل ہے۔ یعنی سِر، وہ اُبھرتا ہے اور اب وہ اُس مجرد صرف سے حکایت کرنے لگتا ہے جو ولا عینٌ رأت ولا اذن سمعت کا مصداق ہے اور زمان و مکان کی حد بندیوں سے بلند و بالا ہے۔

اِس موقع پر یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ قلب اور عقل یہ دونوں جس طرح انبیاء میں ہوتے ہیں، اور انسانوں میں بھی ہوتے ہیں لیکن فرق یہ ہوتا ہے کہ انبیاء کرام میں قلب اور عقل کا وہ رخ جو روح اور سِر

کہلاتا ہے اس درجہ بلند اور قوی ہوتا ہے کہ کسی اور انسان میں یہ بات نہیں ہوتی۔ اس بنا پر انکو عالم فوق سے اتصال ہوتا ہے اور انھیں ایسے ایسے مقامات اور احوال و مزایا پیش آتے ہیں جو دوسروں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔ قرآن مجید میں حضور پر نور کی زبانِ حق ترجمان سے جو ارشاد فرمایا گیا ہے "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ یُوحیٰ اِلَیَّ" تو اس میں اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُمْ اعضا و جوارح میں انسانوں کے ساتھ مشارکت کی بنا پر ہے اور پھر یوحی الیّ جو فرمایا گیا ہے تو اس میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب و عقل کے دو فوقانی رخ جو حضرت شاہ ولی اللہ کی زبان میں روح اور سِر ہیں وہ اس درجہ بلند اور ارفع ہیں کہ آنحضرت مہبطِ وحی ہیں۔

مگر بات یہ ہے کہ انسان، انسان ہونے کے باوجود جس طرح ایک بزدل انتہائی بہادر انسان کے شجاعانہ کارناموں کو، ایک غبی پرلے درجہ کی ذکاوت و ذہانت رکھنے والے انسان کی دماغی بلند پروازیوں اور ذہنی کمالات کو نہیں سمجھ سکتا، اور جب اُن کا ذکر سنتا ہے تو حیرت و استعجاب سے انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح "مجرد صرف" "ذاتِ حق" اور حقیقت مطلقہ سے قرب و اتصال کے باعث انبیاء کرام پر جن اسرار الٰہیہ و کونیہ کا فیضان ہوتا ہے، ہم لوگ جب ان کا ذکر سنتے ہیں تو ہمیں حیرت ضرور ہوتی ہے اور بسا اوقات وہ امور ہمارے لئے ناقابلِ فہم ہوتے ہیں لیکن ہمیں یہ بات کبھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ ہمارے لئے کسی چیز کا ناقابلِ فہم ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ اُس کے وجود کا انکار ہی کر دیا جائے۔ مولانا شبلی مرحوم نے صحیح بخاری کی حدیث وحی پر کلام کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے۔ آپ نے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کیا دیکھا؟ ناموس اعظم (حضرت جبریل) نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوئے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کرسکتیں" ایک مادرزاد اندھے کو روشنی کی حقیقت لاکھ لکھو کر سمجھائیے کوئی بات اُسکے ذہن نشین نہیں ہوتی تو کیا محض اس بنا پر نابینا کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ روشنی کے وجود کا ہی سرے سے انکار کر دے۔

یہ آواز کس کی تھی | سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے بیان کی روشنی میں صلصلۃ الجرس کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے نفس آواز سے بحث نہیں کی یعنی یہ نہیں بتایا کہ یہ آواز خدا کی تھی یا فرشتہ وحی کی، یا خود وحی کی آواز تھی۔ انھوں نے صرف اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ یہ آواز خواہ کسی کی ہو اس کو زبانِ نبوت نے گھنٹہ کی آواز سے کیوں تشبیہ دی ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مختصراً اس کا بھی ذکر کر دیا جائے کہ یہ آواز کس کی تھی؟ اس باب میں سب سے زیادہ نمایاں مسلک امام بخاری کا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ آواز خدا کی ہوتی تھی جو تمام فضا میں گونج جاتی تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور اس کو نہیں سن سکتا تھا چنانچہ صحیح بخاری کتاب التوحید میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی یہ روایت نقل کرتے ہیں۔

اذا تکلم اللہ بالوحی سمع اھل السموٰت شیئًا فاذا فزع قلوبھم وسکن الصوت عرفوا انہ الحق ونادوا ماذا قال ربکم قالوا الحق	اللہ تعالیٰ جب کلام بالوحی کرتا ہے تو اہل سمٰوٰت کچھ سنتے ہیں پھر جب ان کے قلوب سے خوف و ہراس کم ہو جاتا ہے اور آواز ٹھہر جاتی ہے تو وہ پہچانتے ہیں کہ یہی حق تھا اور وہ آپس میں ندا کرتے ہیں کہ تمھارے رب نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں کہ حق کہا!

اس سلسلہ میں امام بخاری نے ایک روایت بھی نقل کی ہے جو عبداللہ بن انیس سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں کو جمع کریگا اور ان کو ایسی ندا دیگا کہ قریب و بعید سب اُسے یکساں سُنیں گے، پھر آگے چل کر ایک باب کا ترجمہ "وکلم اللہ موسیٰ تکلیماً" باندھا اور اس کے ذیل میں چند احادیث نقل کیں جن سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ چونکہ آیت بالا میں کلّم فعل کی تاکید مصدر تکلیم کے ساتھ لائی گئی ہے اس لئے علم نحو کے قواعد کے مطابق یہاں کلام سے مراد حقیقت ہے مجاز نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے وادیِ سینا میں جو آواز سنی تھی وہ سچ مچ خدا ہی کی آواز تھی

امام بخاری نے فرقہ جہمیہ کی تردید میں کتاب التوحید میں اور بھی احادیث پیش کی ہیں اور ان سے خدا کے لئے صوت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اس بنا پر صلصلة الجرس والی حدیث میں جس آواز کا ذکر ہے وہ امام بخاری کے نزدیک خدا کی ہی آواز ہو۔

ارباب تصوف وعرفان میں شیخ اکبر کا جو مقام ہو اہل علم سے پوشیدہ نہیں، وہ بھی خدا کے لئے صوت مانتے ہیں۔ چنانچہ وحی پر کلام کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ اللہ کی آواز کے لیے کوئی جہت اور سمت متعین نہیں کیجا سکتی اور چونکہ گھنٹہ کی آواز کا حال بھی یہی ہو کہ وہ ہر طرف سے سُنی جاتی ہے اس بنا پر ہی صوت بالوحی کو گھنٹہ کی آواز سے تشبیہ دی گئی ہے، لیکن علماء کی اکثریت جسمیں صحیح بخاری کے شارحین بھی داخل ہیں اس بات کی قائل ہو کہ یہ آواز فرشتۂ وحی کے پروں کی۔ یا فرشتہ کی زبانی وحی کی ہوتی تھی۔ حافظ ابن حجر ان میں سے پہلی شق کے قائل ہیں۔ واللہ اعلم۔

تمثل یعنی فرشتہ کا کسی انسانی شکل میں آنا

وحی کا چوتھا طریقہ یہ تھا کہ فرشتۂ وحی کسی انسان کی شکل وصورت میں آتا تھا اور وہ آپ سے خطاب کرتا تھا یہاں تک آپ کو وہ پوری بات یاد ہو جاتی تھی جو وہ آپ سے کہتا تھا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت عمرؓ سے روایت ہو کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آیا جس کے کپڑے بہت زیادہ سفید اور بال بہت سیاہ تھے اس پر کوئی علامت سفر بھی نہیں تھی اور ہم میں سے کوئی ایک شخص بھی اُسے نہیں جانتا تھا۔ یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اس طرح بیٹھ گیا کہ اپنے گھٹنے حضور کے گھٹنوں پر ٹیک لئے اور اپنے دونوں ہاتھ آپ کی رانوں پر رکھ دیئے پھر اسلام۔ ایمان، احسان، قیامت اور علاماتِ قیامت سے متعلق آپ سے چند سوالات کئے۔ آپ ان سوالات کے جوابات دیتے جاتے تھے اور سائل ہر جواب پر "صدقت" (آپ نے سچ فرمایا) کہتا جاتا تھا، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں ہمیں بڑا تعجّب ہوتا تھا کہ یہ شخص سوال کرتا ہے اور جواب ملنے پر تصدیق بھی کرتا جاتا ہو گویا کہ اُسے ان سوالات کے جوابات کا علم پہلے سے ہی تھا۔ سوال د

جواب کے ختم ہونے پر یہ شخص واپس چلا گیا تو آنحضرت نے حضرت عمرؓ سے دریافت فرمایا "تم جانتے ہو کہ یہ کون شخص تھا؟" انھوں نے جواب دیا "اللہ اور اس کا رسول اعلم ہیں" آپ نے فرمایا "یہ جبرئیل تھے جو تم کو دین سکھانے آئے تھے"

صحابہ میں حضرت دحیہؓ خوبصورتی اور حسن وجمال کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ اس لئے فرشتۂ وحی کبھی کبھی ان کی شکل میں بھی آتا تھا۔ صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے کہ ایک مرتبہ جبرئیل امین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور باتیں کرنے لگے۔ اس وقت آنحضرت کے پاس ام سلمہ بیٹھی ہوئی تھیں آپ نے اُن سے پوچھا "یہ کون ہیں" وہ بولیں "یہ تو دحیہ ہیں" ام سلمہ کا بیان ہے کہ بخدا میں انکو دحیہ ہی سمجھتی رہی یہاں تک کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سُنا جس میں آپ نے جبرئیل امین کے آنے کی خبر دی۔ تب میں سمجھی کہ جبرئیل دحیہ کی شکل میں آئے تھے۔[۱]

اسی طرح کا ایک واقعہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے ساتھ پیش آیا، ایک مرتبہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ایک شخص سے گفتگو کر رہے ہیں جو سواری پر سوار ہے۔ جب گھر واپس آئے تو ام المومنین نے پوچھا "یہ کون شخص تھا جس سے آپ گفتگو کر رہے تھے؟ ارشاد ہوا "یہ جبرئیل تھے انھوں نے مجھ کو حکم کیا ہے کہ میں بنو قریظہ کی طرف چلا جاؤں۔[۲]

فرشتہ کا اپنی اصلی شکل میں آنا | وحی کا پانچواں طریقہ یہ تھا کہ فرشتہ اپنی اصلی شکل میں آتا تھا اور اللہ کا پیغام آپ تک پہنچا تھا۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل کو ان کی اصلی شکل میں دو مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ واقعۂ معراج میں سدرۃ المنتہی کے پاس اور ایک دفعہ کسی اور مقام پر غالباً اجیاد میں بعض علماء کی رائے ہے کہ قرآن مجید میں سورۂ النجم کی مندرجہ ذیل آیات انھیں

---

[۱] باب کیف نزل الوحی

[۲] یہ واقعہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کیف نزل الوحی کے ماتحت نقل کیا ہے۔

Marfat.com

دو واقعوں سے متعلق ہیں معراج کے علاوہ آنحضرتؐ نے جو جبریل امین کو ان کو انکی اصلی شکل میں دیکھا تھا اس کا ذکر ان آیات میں ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى	انکو بڑی طاقتوں والے اور مضبوط نے تعلیم دی پھر وہ
وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى	سیدھا ہو گیا اور وہ بہت اوپر آسمان کے کنارہ
فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى	پر تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور لٹک گیا۔ اب فاصلہ
فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى مَا كَذَبَ	دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم تھا اور اب خدا
الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى	نے اپنے بندہ پر وحی کی۔ جو کی۔ دل نے جو کچھ دیکھا
مَا يَرٰى	اُسے جھوٹ نہیں کہا۔ کیا تم لوگ پیغمبروں سے اُن
	چیزوں پر جھگڑتے ہو جو اُنھوں نے دیکھی ہیں۔

ان آیات میں جبریل امین کی جو صفات بیان کی گئیں ہیں سورۂ تکویر میں بھی اُن میں سے بعض کا ذکر ہے ارشاد ہے

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِىْ قُوَّةٍ	یہ کہا ہوا ہی ایک کریم قاصد کا جو طاقتور ہے۔ اور جو
عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ	عرش کے مالک خدا کے نزدیک مرتبہ والا ہی اس کی
ثَمَّ اَمِيْنٍ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ	اطاعت کی جاتی ہے اور وہ وہاں امانت دار ہی
وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ	اور تمھارے ساتھی (آنحضرت) مجنون نہیں ہیں۔
	انھوں نے فرشتہ کو اُفق مبین پر دیکھا ہے

سورۂ النجم اور سورۂ تکویر کی ان آیتوں پر غور کیجیے، ان میں یہ بات مشترک ہی کہ جبریل امین کی صفت ذی قوۃ اور امین بیان کی گئی ہی اور یہ بھی فرمایا گیا ہی کہ آنحضرت نے ان کو اُفقِ اعلیٰ پر دیکھا ہے۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ اس مرتبہ فرشتۂ وحی کا نزول کسی غیر معمولی اور عظیم د

جلیل شکل میں ہوا اور دوسری یہ کہ فرشتہ نے خود اپنی زبان سے وحی کا تلفظ کیا تھا، اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْم سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے، پھر دونوں صورتوں میں فرشتہ کے ورود و نزول کے بیان کے بعد یہ بھی تصریح کردی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا اور سنا وہ سرتاسر حق تھا اور آپ کا دل ایک ایک بات کی تصدیق کر رہا تھا اسے کوئی اشتباہ نہیں تھا۔

دوسرا واقعہ حضرت جبریلؑ کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کا جو معراج میں پیش آیا اس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی	اور آنحضرت نے دوسری مرتبہ بھی اترتے ہوئے
عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَہٰی عِنْدَھَا	جبریل کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا ہے جس کے
جَنَّۃُ الْمَاْوٰی اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ	پاس جنۃ الماویٰ ہے اسوقت سدرہ پر عجیب و
مَا یَغْشٰی مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی	غریب انوار چھائے ہوئے تھے (مگر) نہ نگاہ بہکی
	اور نہ اس نے سرکشی کی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، علماء کے ایک گروہ کا خیال یہی ہے کہ سورۃ النجم کی آیات بالا دونوں واقعوں سے متعلق ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے اس کی تصدیق و تائید بھی ہوتی ہے لیکن اس مقام پر ایک شبہ یہ ہو کہ فاوحی الی عبدہ ما اوحی میں اگر اوحی کی ضمیر مرفوع مستتر کو جبریلؑ کیطرف لوٹایا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وحی کے کرنے والے جبریل امین ہیں حالانکہ اسی سورۃ کے شروع میں عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی، فرما کر ان کی حیثیت موحی کی نہیں بلکہ معلم کی بتائی گئی ہو اور قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی ایحاء کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہو مثلاً ایک مقام پر ہو "وَاِنِ اھْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْ اِلَیَّ رَبِّیْ" ایک جگہ ہو "ذٰلِکَ مِمَّا اَوْحٰی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ" ایک سورۃ میں ہے "وَالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ ھُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ"

Marfat.com

ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے "ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡهِ اِلَیۡکَ" اگر کہیں یُوحیٰ بِہٖ صیغہ مجہول لایا بھی گیا ہے تو وہاں بھی "مِنۡ رَّبِّیۡ" فرما کر اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ایحاء اللہ تعالیٰ کا ہی فعل ہے جیسے اس آیت میں :- "قُلۡ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ مِنۡ رَّبِّیۡ" ہاں! اس میں شک نہیں کہ بعض آیات میں ایحاء کی نسبت خود جبریل امین کی طرف بھی کی گئی ہے لیکن ایسے واقع پر ان کی حیثیتِ رسول بھی متعین کر دی گئی ہے اور ساتھ ہی خدا کا ذکر ہے جیسے اس آیت او یُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَیُوۡحِیَ بِاِذۡنِهٖ مَا یَشَآءُ اس سے مقصد یہ ہے کہ جہاں التباس واشتباہ کا خدشہ نہ ہو جبریل ع کی طرف ایحاء کی نسبت کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

یہ اور اس طرح کے بعض اور اشکالات کے باعث سورۃ النجم کی یہ آیات بھی مشکلات قرآن میں شمار کی گئی ہیں جن پر افسوس ہے کہ مفسرین اور علماء سیرت نے کچھ زیادہ توجہ نہیں کی اور جو کلام کیا ہے وہ محض سطحی اور سرسری ہے۔ اس موقع پر ہم ذیل میں مختصراً وہ تقریر نقل کرتے ہیں جو حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ الکشمیری رح نے "مشکلات القرآن" میں کی ہے اور جسے مولانا شبیر احمد العثمانی رح نے فتح الملہم کی جلد اول میں صفحہ ۳۳۵ - ۳۳۶ پر نقل کیا ہے۔ حضرت الاستاذ فرماتے ہیں :-

علامہ کشمیری کی تقریر اس سورۃ میں نجم (ستارہ) کی قسم اس لیئے کھائی گئی ہے کہ اس کے بعد جو کلام ہے وہ آسمان کی خبر اور معراج وغیرہ سے متعلق ہے۔ ان آیتوں کا خلاصہ اور لُبِّ لباب یہی چیزیں ہیں اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی میں فعل بہ صیغہ مجہول لایا گیا اور مُوحِی کی کوئی تعیین نہیں کی گئی، کیونکہ ایحاء بجز اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے لئے ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ وصف خدا میں منحصر ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جو اوصاف موصوف کی ذات میں منحصر ہوں اُن کا ذکر خود موصوف کے تسمیہ سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے مثلاً مَرَرۡتُ بِاَکۡرَمِ الۡقَوۡمِ" اس کے بعد فرمایا گیا "عَلَّمَهٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی" اس میں موحی کے ذکر کے بعد مُعَلِّم کی طرف

Marfat.com

انتقال ہے۔ کیونکہ یہاں دو گرامی شخصیتوں کا ذکر ہے، ایک اللہ تعالیٰ جو موحی ہے اور دوسرا معلم جو جبرئیل ہیں۔ اس کے بعد معلم کے اوصاف بتائے گئے کیونکہ کلام اہل مکہ کے ساتھ ہے اور یہ لوگ جبریل کی معرفت نہیں رکھتے تھے اس لئے جبریل کا فعل اور اُن کی صفات بیان کی گئیں اور یہی وہ اوصاف ہیں جو سورۂ تکویر میں بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ان آیات کا مقصد گویا یہ بتانا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کس طرح آتی تھی؟ اور اسکی صفت کیا تھی؟

حضرت الاستاذ نے اسکے بعد حافظ ابن قیم کی تفسیر کی روشنی میں ذو مِرَّۃٍ فَاسْتَوٰی کے مطلب کی تشریح کی ہے جس کا یہاں ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ پھر فتدلّٰی کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:۔

جیسا کہ قاضی بیضاوی نے ذکر کیا ہے اس میں اس بات کیطرف اشارہ ہے کہ اس حالت میں جبریل اپنے مکان سے متجاوز نہیں ہوتے تھے کیونکہ تدلّٰی کے معنٰی ہیں استرسال مع التعلق جیسے پھل کے لٹک آنے کو تدلّٰی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جبریل امین کی تدلی کی مثال اُس روشنی کی مانند ہے جو فضا میں پھیلی ہوئی ہو اور کسی روشندان میں سے ہو کر بھی گذر رہی ہو، اس کو دیکھنے والا اپنے گھر میں دیکھتا ہے مگر پھر بھی وہ جانتا ہے کہ روشنی اپنے موضع سے منفصل نہیں ہے۔ تدلّی کے لفظ سے جب یہ معنٰی مراد لئے جائیں تو اس سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ حضرت جبریل کس طرح بصورت بشر آتے تھے۔ اسکے بعد فرمایا گیا "فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ" اس میں ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے۔ جبریل کی طرف نہیں، امام طبری کے نزدیک اس کے معنٰی یہ ہیں "فاوحیٰ اللہ الیٰ ما اوحی" یہی معنٰی امام مسلم کے نزدیک مراد ہیں۔ اور امام بخاری نے شریک بن ابی نمر سے جو روایت نقل کی ہے اس سے بھی یہی معنٰی مستفاد ہوتے ہیں امام احمد (مسند صفحہ ۱۴۹/۳) نے ثابت عن انس کے طریق

سے جو روایت کی ہے اس سے بھی اسی معنیٰ کی تائید ہوتی ہے۔ ان سب روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت "فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی" واقعۂ معراج (لیلۃ الاسریٰ) سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں اُن روایات کی مراجعت کرنی چاہیے جو ابن کثیر (ص ۳۲۵/۵) میں بہ طریق بن ابی الکہتلہ اور مسند احمد ص ۴۰۷/۱ میں امام احمد سے منقول ہیں۔

پوچھا جاسکتا ہے کہ اس صورت میں جبکہ "اوحیٰ الی عبدہٖ ما اوحیٰ" میں اوحیٰ کا فاعل جبریل کے بجائے خدا کو بنایا جائے۔ انتشارِ ضمائر اور انفکاک فی النظم لازم آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شبہ بے بنیاد اور نادرست ہے کیونکہ ایجاد کا وصف اللہ تعالےٰ میں منحصر ہے اور سورۂ النجم کی ان آیات میں دو کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک موحی اور دوسرا معلم اس بنا پر اوحیٰ کی ضمیر مرفوعِ مستتر خدا کی طرف ہی راجع ہونی چاہیے۔ انتشار ضمائر معنیٰ میں التباس و اشتباہ کا سبب ہوتا ہے اس بنا پر وہ ناجائز ہے لیکن یہاں معنیٰ میں اشتباہ کا امکان ہی نہیں۔

علاوہ ازیں ایک بات یہ بھی ہے کہ ان آیتوں میں عطف، واو کے ذریعہ سے نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ ایک مرتب سلسلہ ہے جسمیں بعض چیزیں بعض چیزوں پر خارج میں مرتب ہوتی چلی گئی ہیں اور ان سب کی انتہا اللہ پر ہوتی ہے اس اعتبار سے "فاوحی الی عبدہٖ ما اوحی" اس مضمون کے لئے بہ طور خلاصہ ہے جو "اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی" میں بیان کیا گیا ہے۔ اب پھر اسی مضمون کو بیان کیا جارہا ہے جیسا کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں کیا گیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا "مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی" اس کو ماقبل سے منفصل لایا گیا اور عطف نہیں کیا گیا۔ کیونکہ یہ دل سے اللہ کی رویت اور جبریل امین کی انکی اصلی شکل میں

رویت کے مضمون پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں روایتیں معراج سے پہلے کی ہیں پھر ما رای میں اللہ اور جبریل کی رویت کے علاوہ وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو آپ نے شب معراج میں دیکھیں۔ چنانچہ آگے چل کر فرمایا گیا ہے۔

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیَاتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی — آنحضرت نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں

سورہ بنی اسرائیل میں ذکر ہے۔

لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیَاتِنَا — تاکہ ہم آپ کو اپنی آیات دکھائیں۔

پھر اسی مقام پر ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْ اَرَیْنَاکَ — اور جو رویا ہم نے آپ کو دکھایا ہے ہم نے

اِلَّا فِتْنَۃً لِّلنَّاسِ — اس کو لوگوں کیلئے آزمائش کی چیز بنایا ہے

اس آیت میں جو فتنہ ہے یہ وہی ممارات (جھگڑنا) ہے جس پر " اَفَتُمَارُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی فرما کر ممارات کرنے والوں کو زجر و توبیخ کی گئی ہے۔

اس تقریر سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی کی تقدیر عبارت یوں ہے مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ عَبْدَنَا مَا رَاٰی اس رای کا فاعل عبد یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ رویت عام ہے خواہ دل کے ذریعہ سے ہو یا آنکھ کے ذریعہ۔ اس صورت میں کذب متعدی بدو مفعول ہوگا اور اس میں کوئی دشواری نہیں کیونکہ تکذیب کی طرح کذب بھی متعدی بدو مفعول ہو کر آتا ہے مثلاً یوں کہیں صَدَقْتُ فلاناً الحدیث و کذبتہ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو ایک مفعول پر ہی مقتصر مانا جائے۔ جیسا کہ امام نووی نے فراء سے نقل کیا ہے اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ دل نے اس معاملہ میں جھوٹ نہیں کہا بلکہ اس نے وہی کہا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں عیاناً دیکھا۔

Marfat.com

آگے چلئے ارشاد ہوتا ہے" وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی" اس میں اگر رَاٰی کا فاعل آنحضرتؐ کو نہیں بلکہ فواد کو بنایا جائے تو یہ زیادہ واضح بات ہوگی اور اب اس صورت میں معنیٰ یہ ہوں گے کہ قلب نے جو کچھ دیکھا تھا اس کو مِن وعَن بیان کر دیا اور اس میں جھوٹ نہیں کہا۔ یہاں رویت سے مراد رویتِ فواد ہوگی اور بعد میں جو رویت بصر کا ذکر ہے تو واضح رہنا چاہیے کہ ان دونوں میں کوئی تصادم اور تعارض نہیں ہے کیونکہ رویت امر واحد ہے خواہ دل سے ہو یا آنکھ سے فرق صرف فاعل کا ہے اس لئے عبارت میں انفکاک اور نظم میں انتشار پیدا نہیں ہوتا۔

مرفوع احادیث اور صحیح آثار سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی رویت دو مرتبہ ہوئی ہے ایک مرتبہ دل سے اور دوسری مرتبہ آنکھ سے مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی کے بعد جو اَفَتُمٰرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی" ہے اس میں بجائے صیغہ ماضی کے یریٰ بصیغہ مضارع فرمانا بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ رویتِ اولیٰ کے علاوہ کوئی اور رویت ہے۔ حضرت ابنِ عباس کا ایک اثر ہے اس سے بھی اس کی ہی تائید ہوتی ہے آپ فرماتے ہیں" محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ آنکھ سے اور دوسری مرتبہ دل سے" علامہ طبرانی نے اس اثر کو اوسط میں نقل کیا ہے اور سوائے جہور بن منصور الکوفی کے اسکے تمام راوی صحیح کے رُواۃ ہیں، جہور بن منصور کو بھی ابنِ حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے

اس کے بعد فرماتے ہیں" وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی" میں جو رویت ہے وہ خدا اور جبریل دونوں سے متعلق ہے۔ جبریل امین کی رویت تو ظاہر ہے۔ اللہ کی رویت ماننے کی صورت میں یہ کہنا پڑیگا کہ جس طرح بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ خدا رات کے ثلث آخر میں سماء دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں بھی نَزْلَۃً اُخْرٰی کے معنی نزول الٰہی کے ہو سکتے ہیں اب رہا "عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَہٰی" تو یہ واضح رہنا چاہیے کہ ظرف یعنی عِندَ سدرۃ المنتہیٰ مرئی کے ساتھ متعلق نہیں بلکہ رویت کیساتھ ہے جیسے کہتے ہیں" رأیتُ الھلال عند المسجد" اس تقریر کی بنا پر

Marfat.com

عِندَ سدرۃ المنتہیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو متعین کرتا ہو نہ کہ جبرئیل یا خدا کے مقام کو۔

حضرت الاستاذ کی یہ تقریر نہایت مفصل ہے[۵] اور آپ نے اس میں عجیب و غریب نکات و لطائف مستند حوالوں کی روشنی میں بیان کئے ہیں۔ ہم نے مذکورہ بالا انتخاب میں جستہ جستہ وہی فقرے نقل کئے ہیں جو ہمارے موضوع بحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تقریر سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سورۃ النجم کی آیاتِ مبحوث عنہا صرف واقعہ معراج سے متعلق ہیں اور ان میں لیلۃ الاسراء کے ہی احوال و کیفیات کو نہایت بلیغ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ وحی اس واقعہ کی ابتدائی منزل ہے اس لئے شروع میں وحی کی صفت اور اس کی کیفیت و امکان پر روشنی ڈالی گئی ہے

آیات النجم کی مذکورہ بالا تفسیر کے مطابق حضرت جبرئیلؑ کی ان کی اصلی شکل میں رویت ایک تو وہ ہے جو معراج میں ہوئی۔ اب رہی دوسری رویت جس کا ذکر حضرت عائشہؓ نے کیا ہے تو اس کی نسبت مختلف روایتیں ہیں حضرت عائشہ کی ہی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسری رویت کا واقعہ ایک مقام پر جس کا نام اجیاد ہے پیش آیا تھا۔ بعض روایتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غارِ حرا میں آپ پر جب پہلی وحی "اقرأ باسمِ ربّکَ" نازل ہوئی تو اس دفعہ جبرئیل اپنی اصلی شکل میں ہی تشریف لائے تھے ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے اور بخاری کی احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ہم ذیل میں پوری حدیث نقل کرتے ہیں تاکہ اس خاص مسئلہ کے علاوہ وحی کی بعض اور کیفیات پر بھی روشنی پڑ جائے۔

"حضرت عائشہ ام المومنین سے روایت ہے کہ سب سے پہلی وحی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ خواب میں بصورت رویائے صالحہ تھی آنحضرتؐ جو خواب دیکھتے تھے وہ صبح کے روشن اجالے کی طرح سچ نکلتا تھا۔ پھر آپ کو تنہائی محبوب ہوگئی غارِ حرا میں جا کر آپ تنہا کچھ دن بسر کرتے تھے اور گھر آنے سے پہلے کئی کئی شب عبادت میں مصروف رہتے تھے کھانے پینے کی چیزیں بھی ساتھ

---

۵ پوری تقریر کے لئے دیکھو مشکلات القرآن مطبوعہ علمی ڈابھیل از صفحہ ۲۴۰ تا ۲۶۲

لے جاتے تھے جب وہ سامان ختم ہو جاتا تو گھر واپس آتے اور پھر نیا سامان لے کر غار میں تشریف
لے جاتے۔ یہاں تک کہ غار میں ہی حق آپ کے سامنے آیا اور وہ فرشتہ "آپ کے پاس پہونچا اور اس
نے کہا" پڑھ" آپ نے فرمایا" میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" حضور فرماتے ہیں" اب اس فرشتہ نے مجھ کو پکڑ کر
اتنا دبایا کہ میں تھک گیا۔ پھر اس نے مجھ کو چھوڑ دیا اور کہا" پڑھ" میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا
ہوا نہیں ہوں" اب اس فرشتہ نے مجھ کو پکڑ لیا اور پھر دبایا یہاں تک کہ میں تھک گیا۔ پھر اس نے مجھ کو
چھوڑ دیا اور کہا" پڑھ" میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" فرشتہ نے تیسری مرتبہ
پھر مجھ کو پکڑا۔ دبایا اور چھوڑ دیا اور کہا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ،	پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَاْ	کیا ہی جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا
وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ	کیا ہی پڑھ اور تیرا پروردگار بڑا بزرگ ہی جس نے
عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ	قلم کے ذریعہ سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا ہی
يَعْلَمْ	جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیتوں کے ساتھ گھر واپس آئے۔ قلبِ مبارک لرز رہا تھا۔
حضرت خدیجہ بنت خویلد کے پاس آئے اور فرمایا" مجھ کو کمبل اڑھا دو" مجھ کو کمبل اڑھا دو" لوگوں نے
آپ کو کمبل اڑھا دیا یہاں تک کہ دہشت کی وہ حالت جاتی رہی۔ پھر آپ نے حضرت خدیجہ سے سارا
ماجرا بیان کیا اور فرمایا کہ مجھ کو اپنی جان کا خطرہ ہے۔ حضرت خدیجہ بولیں ہرگز نہیں خدا آپ کو کبھی رسوا
نہیں کرے گا آپ قرابت داروں سے صلہ رحمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ لوگوں کا بوجھ خود اٹھاتے ہیں۔
اپاہجوں اور محتاجوں کے لئے کمائی کرتے ہیں۔ مہمانوں کی مہمانداری کرتے ہیں مصائب وحوادث میں
آپ حق کی امداد و اعانت کرتے ہیں" پھر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لیکر ورقہ بن نوفل کے پاس آئیں

Marfat.com

جو حضرت خدیجہ کے چچازاد بھائی تھے اور جنھوں نے عہد جاہلیت میں عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔
یہ انجیل کو عبرانی میں لکھتے تھے جتنا بھی لکھ سکتے تھے، بڈھے بہت تھے۔ بصارت جاتی رہی تھی۔ حضرت خدیجہ نے ان سے کہا "بھائی ذرا اپنے بھتیجے کی سنو" ورقہ بولے "بھتیجے! بتاؤ تم کیا دیکھتے ہو؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا کہہ سنایا" ورقہ بولے" یہ وہی ناموس (محرم اسرار) ہے جسکو اللہ نے موسیٰ پر نازل کیا تھا۔ اے کاش میں اس وقت جوان ہوتا اے کاش میں اس وقت زندہ ہوتا، جب کہ تمہاری قوم تم کو نکال دیگی" آنحضرت نے پوچھا" کیا میری قوم مجھ کو نکال دیگی؟" انھوں نے جواب دیا" ہاں جو چیز تم لے کر آئے ہو وہ ایسی چیز ہے کہ جو کوئی اس کو لے کر آیا اس کے ساتھ دشمنی کی گئی اور اگر میں اس روز تک زندہ رہا تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ نہایت قوی اور مضبوط مدد۔ اس واقعہ کو پیش آئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا[۱]۔

اس واقعہ میں اگرچہ اس کا ذکر نہیں ہے کہ فرشتۂ وحی اصلی شکل میں نازل ہوا تھا یا کسی انسانی صورت میں آیا تھا لیکن حضور کا جبریل کو فرشتہ کہنا، ان کی آمد سے خوف زدہ ہو جانا اور جبریل کے دبانے سے آپ کا تعب زدہ ہو جانا یہ سب اس امر کے قرائن ہیں کہ فرشتۂ وحی کا نزول اپنی اصلی شکل میں ہوا تھا، ساتھ ہی اس پر غور کرو کہ حضور کا اس واقعہ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہونا اور پھر ورقہ کا تسلی و تشفی کرنا کس طرح صاف صاف بتا رہا ہے کہ حضور کو جو وحی الٰہی پہونچی آپ پہلے سے اس سے باخبر نہیں تھے اور یہ جو کچھ ہوا محض خدا کے حکم سے اور آپ کے اپنے ارادہ کے بغیر ہوا۔ کیا سیدِ کونین کے پیغمبر ہونے اور آپ کے پیغام کے وحی الٰہی ہونے کی کوئی نفسیاتی دلیل اس سے بڑھ کر ہو سکتی ہے؟

[۱] اس واقعہ میں ورقہ بن نوفل نے جو کچھ کہا ہے اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی ہے اس کے پیش نظر تمام علماء اسلام کا اتفاق ہے کہ وہ مومن تھے یہاں تک کہ بعضوں نے تو ان کو صحابہ میں بھی شمار کیا ہے البتہ اس میں تردد ہے کہ آیا وہ اس امت میں بھی شمار ہو سکتے ہیں یا نہیں وجہ یہ ہے کہ دعوتِ اسلام کے ظہور سے پہلے انکی وفات ہو گئی تھی

چھٹا طریقہ وحی | ایک طریقۂ وحی یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی فرشتہ یا آواز کے توسط کے براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر وحی نازل فرماتے جیسا کہ لیلۃ المعراج میں پانچ نمازوں کو فرض کیا گیا۔

ساتواں طریقہ وحی | ایک طریقہ وحی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی فرشتہ کی وساطت کے بغیر کلام کرے جیسا کہ از روئے نصِ قرآن حضرت موسیٰ کے لئے ثابت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی معراج میں ثابت ہے۔

حافظ ابن قیم وحی کے یہ سات طریقے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ بعض علمار نے ان طریقوں پر ایک اور طریقہ کا اضافہ کیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ پس پردۂ وحجاب نہیں بلکہ تمام حجابوں کو اٹھا کر منظروں کے سامنے جلوہ نما ہو اور شرفِ خطاب وکلام عطا فرمائے علامہ فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ وحی ان لوگوں کے نزدیک تو متحقق ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ سیدِ اولادِ آدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک دیدارِ الٰہی سے شاد کام وفائز المرام ہوئی تھی، لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ مسئلہ علمائے سلف وخلف میں مختلف فیہ رہا ہے (روایتیں دونوں قسم کی ہیں) اگرچہ اس بارہ میں جمہور صحابہ بلکہ سب کے سب ہی حضرت عائشہ کے ساتھ ہیں۔ کما حکاہٗ عثمان بن سعید الدارمی[۱]

آنحضرت اور مسئلۂ رویت باری کی تحقیق | سورۂ النجم میں جو آیات وحی سے متعلق ہیں چونکہ ان میں رویتِ باری کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر اس مسئلہ کو کسی قدر تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔ جیسا کہ علامہ ابن قیم نے فرمایا ہے یہ مسئلہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں باری تعالیٰ کی رویتِ بصری ہوئی تھی یا نہیں۔ علمار سلف وخلف میں مختلف رہا ہے اور وجہ اختلاف یہ ہے کہ آثار وروایات، مثبت ومنفی دونوں طرح کی ہیں یہ صحیح ہے کہ حضرت عائشہ کا مسلک اس باب میں یہی تھا

---

[۱] زاد المعاد ج ۱ ص ۲۵

کہ وہ رویت کی نفی کرتی تھیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت مسروق سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہ کے پاس ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ ام المومنین نے فرمایا "ابو عائشہ تین باتیں ایسی ہیں جن میں سے اگر کسی ایک کا بھی کوئی شخص قائل ہوا تو اس نے خدا پر بڑا بہتان باندھا" میں نے پوچھا "وہ کیا باتیں ہیں" ارشاد ہوا "جس شخص نے یہ کہا کہ محمدؐ نے خدا کو دیکھا اس نے خدا پر بڑی تہمت لگائی" مسروق کہتے ہیں "میں تکیہ لگائے بیٹھا تھا یہ سن کر اٹھ بیٹھا اور عرض کیا "اے ام المومنین آپ ذرا مجھ کو مہلت دیجئے اور جلدی نہ کیجئے کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ — اور آپ نے اس کو افق مبین پر دیکھا اور

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى — آپ نے اس کو دوبارہ اترتے ہوئے دیکھا

حضرت عائشہ نے جواب دیا "سب سے پہلے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت سوال کیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں جن کو میں نے ان دو مرتبوں کے علاوہ ان کی اصلی تشکل میں کبھی نہیں دیکھا، میں نے ان کو آسمان سے اترتے ہوئے اس طرح دیکھا کہ انھوں نے زمین و آسمان کے درمیان کی تمام فضا کو گھیر لیا تھا" اس کے بعد ام المومنین نے فرمایا "کیا تم نے نہیں سنا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ — نگاہیں اس کو نہیں پا سکتی اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے۔

کیا تم نے نہیں سنا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا — کسی بشر کی مجال نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ یا پس پردہ یا اس طرح کہ وہ رسول کو بھیجے۔

Marfat.com

اس کے برخلاف بعض روایتوں سے اس سوال کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس سے شریک بن عبداللہ نے جو روایت کی ہے اس کے آخر میں ہے۔

حَتّٰی جَاءَ سِدْرَةَ الْمُنْتَهٰی وَدَنَا	یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچے
الْجَبَّارُ رَبُّ الْعِزَّتِ فَتَدَلّٰی	تو عزت والا جبار خدا قریب آیا یہاں تک
حَتّٰی کَانَ مِنْهُ قَابَ قَوْسَیْنِ	آپ کے اور خدا کے درمیان دو کمانوں یا
اَوْ اَدْنٰی (کتاب التوحید)	اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا۔

صحابہ میں جو حضرات رویت کا ثبوت مانتے تھے ان میں حضرت عبداللہ بن عباس کو خاص امتیاز ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے حضرت عکرمہ کی موجودگی میں فرمایا "رَاٰی مُحَمَّدٌ رَبَّہٗ" محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔ عکرمہ بولے کہ اللہ کا ارشاد نہیں ہے "لَاتُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ" فرمایا "ہاں سچ ہے لیکن اس وقت جب کہ خدا اپنے اصلی نور میں جلوہ فروز ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دو مرتبہ دیکھا ہے" (ترمذی باب التفسیر سورۃ النجم) ترمذی میں ابوسلمہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے آیت "وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی" کی تلاوت کرنے کے بعد فرمایا "وَقَدْ رَاٰهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ"

صحیح مسلم و ترمذی میں حضرت ابوذر غفاری سے روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا "یارسول اللہ آپ نے خدا کو بھی دیکھا ہے؟" فرمایا "وہ تو نور ہے میں اسے کہاں دیکھ سکتا ہوں" اس روایت سے بہ بظاہر رویت کی نفی کا مضمون ظاہر ہوتا ہے لیکن حضرت عبداللہ بن عباس کے الفاظ میں اس کا جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ آپ کا یہ فرمانا کہ میں اس کو کہاں دیکھ سکتا ہوں" اس وقت کے لئے مخصوص ہے جب کہ خدا اپنے اصلی نور میں جلوہ فروز ہو۔ چنانچہ صحیح مسلم (ج ۱ باب الاسراء) اور ترمذی (تفسیر سورۃ النجم) میں ایک روایت ہے جس میں آنحضرت

Marfat.com

صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "میں نے صرف ایک نور دیکھا تھا۔ گویا حضرت عائشہؓ جس آیت سے رویت باری کے عدم امکان پر استدلال کرتی ہیں یعنی لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَا[ر] تو حضرت ابن عباس اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ کے معنی یہ ہیں کہ نگاہیں حضر[ت] باری عزاسمہ کا احاطہ نہیں کر سکتی اور وہ اس ذاتِ بے ہمتا و بے مثال کو اس طرح نہیں دیکھتیں جس طرح کہ وہ کسی متمکن چیز کو دیکھ لیتی ہیں اس بنا پر حضور پرنور کا نُوْرٌ اَنّٰى اَرَاهُ فرمانا بھی اسی مراد پر محمول کرنا چاہیئے۔

پھر وہ حضرات جو ثبوتِ رویت کے قائل ہیں، ان کا ایک استدلال یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کی نص وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ اس دن چہرے تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے۔

اور دوسری آیات و احادیث کے مطابق اہل سنت والجماعت کے نزدیک اتنا تو مسلّم ہے ہی کہ آخرت میں اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ پس جب آخرت میں عام اہلِ جنت دیدار الٰہی کی نعمت و دولت سے شرف اندوز ہو سکتے ہیں تو اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں یہ امتیاز حاصل ہو گیا ہو تو اس میں استبعاد کی کیا بات ہے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس نزاع کو دور کرنے کی ایک صورت یہ تجویز کی ہے کہ حضرت ابن عباس سے اس معاملہ میں جو روایات منقول ہیں وہ دو طرح کی ہیں ایک مطلق اور دوسری مقید مطلق تو وہ ہی روایات ہیں جو اوپر گذر چکیں اور جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مطلق دیدار الٰہی کا خواہ چشم ظاہر کے ذریعہ ہو یا چشم قلب سے ذکر ہے ان روایات کے ساتھ ہی بعض روایات ہیں جن میں مطلق نہیں بلکہ مقید رویت کا ذکر ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ابو العالیہ کی سند سے مذکور ہے کہ حضرت ابن عباس نے مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى کی تفسیر میں فرمایا۔

Marfat.com

رَاٰی رَبَّہٗ بِفُوَادِہٖ مَرَّتَیْنِ — آنحضرتؐ نے اپنے رب کو چشم قلب سے دو مرتبہ دیکھا

حضرت عطا کی سند سے ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا۔

رَاٰہُ بِقَلْبِہٖ — آنحضرت نے خدا کو اپنے قلب کی آنکھ سے دیکھا تھا

ابن مردویہ نے اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ بہ طریق عطا نقل کیا ہے۔

لَمْ یَرَہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِعَیْنِہٖ اِنَّمَا رَاٰہُ بِقَلْبِہٖ[۱] — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو آنکھ سے نہیں دیکھا، بلکہ دل سے دیکھا تھا۔

پس حضرت ابن عباس کی جن روایتوں میں مطلق رویت کا ذکر ہے اور چشم یا قلب کسی کی تصریح نہیں ہے۔ اگر مقید روایات کے پیش نظر اُن کو بھی رویت بالفواد پر محمول کر لیا جائے اور ساتھ ہی حضرت عائشہ کی روایات میں جو رویت کی نفی ہے۔ اس کو رویت بالعین پر محمول کر لیا جائے تو اب کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ ثبوت رویت جس اعتبار سے ہے اس اعتبار سے نفی رویت نہیں اور حضرت عائشہؓ جس رویت کی نفی کرتی ہیں یعنی رویت بالبصر حضرت ابن عباس اس کے قائل نہیں۔

ظاہر ہے کہ جہاں تک روایات و آثار کا تعلق ہے۔ حافظ ابن حجر کی اس تقریر سے حضرت ابن عباس اور ام المومنین حضرت عائشہ کے اس نزاع کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ قرآن مجید سے تو رویت بصری کا پتہ چلتا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی — قوت بینائی میں نہ تو کجی پیدا ہوئی اور نہ اس نے سرکشی کی۔

ہماری رائے میں اس موقعہ پر حضرت الاستاذ مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری نے جو تقریر کی ہے وہ اس مشکل کا بہترین حل ہے ہم اسے مختصراً ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

---

[۱] فتح الباری جدید اڈیشن ج ۸ ص ۴۹۳

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یقیناً رویت ہوئی تھی۔ لیکن بات یہ ہے کہ رویت ایک طرح کی ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کی مختلف نوعتیں ہوتی ہیں نوعیتوں کے اس اختلاف کی وجہ سے ایک طرح کی رویت کا ثبوت دوسری نوع کی رویت کی نفی ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک دوست اپنے دوست کو دیکھتا ہے۔ ایک خادم اپنے مخدوم کو دیکھتا ہے۔ ایک ادنیٰ درجہ کا آدمی ایک جلیل القدر بادشاہ کی دید کرتا ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ ان سب مثالوں میں ایک رویت دوسری رویت سے بالکل مختلف طریقہ پر پائی جارہی ہے۔ پس اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت باری عز اسمہٗ کی جو دید ہوئی تھی وہ ایک خاص طرح کی دید تھی جس کو ہم دنیا کی کسی دید پر بھی قیاس نہیں کر سکتے۔ اس بنا پر ہمارا دید کا اثبات اور نفی دونوں صحیح ہوں گے۔ اثبات ایک خاص دید کے لحاظ سے ہے اور نفی دنیوی دید کے اعتبار سے۔ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ اثبات و نفی رویت میں منافی اور تضاد نہیں ہے بلکہ دونوں مراد کی ایک ایک طرف کو ظاہر کرتے ہیں۔"

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رویتِ باری کو اگر تمثیلاً بیان کیا جا سکتا ہے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی چشمِ اشتیاق و تمنا نے ذاتِ احدیت کے جمالِ بے مثال کا نظارہ اس طرح کیا کہ جس طرح ایک عاشق اپنے محبوب کا یا ایک باادب نوکر اپنے آقا کا کرتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں دیکھنے والا اپنی نگاہ کو روک بھی نہیں سکتا اور ساتھ ہی اس کی مجال یہ بھی نہیں ہوتی کہ وہ آنکھیں جما کر مشاہدہ کرے۔ قرآن مجید میں اس رویت کے سلسلہ میں جو "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی" فرمایا گیا ہے۔ تو اس میں رویت کی اس خاص کیفیت دلنوعیت کی ہی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ "مَا زَاغَ" کا مطلب یہ ہے کہ چشمِ محمدی نے جمالِ الٰہی کے دیکھنے میں تغافل و تسامح کو بالکل روا نہیں رکھا۔ پھر "مَا طَغٰی" سے مراد یہ ہے کہ باوجود کمالِ

Marfat.com

اشتیاق کے چشمِ محمدی کیلئے یہ ناممکن تھا کہ وہ دائرۂ ادب سے باہر قدم رکھے۔
یعنی اپنی نگاہیں جمالِ ربانی پر جما دے کسی عربی شاعر نے کہا ہے۔

اَشتَاقُہٗ فَاِذَا بَدَا ٭ اَطرَقتُ مِن اِجلَالِہٖ

ترجمہ:- میں اس کا مشتاق دید ہوں، لیکن جب وہ ظاہر ہوتا ہے تو میں اس کی جلالتِ شان کی وجہ سے سرنگون ہو جاتا ہوں

Marfat.com

قرآن اور وحی

چونکہ تمام اعتقادات اور ایمان و عمل کا دار و مدار اس یقین پر ہے کہ پیغمبر کی زبانِ حق ترجمان سے جو کچھ ادا ہو رہا ہے وہ منجانب اللہ ہے اور جن احکام کے اتباع کا حکم دیا جا رہا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے ہی ارشاد فرمائے ہوئے ہیں اس لئے ہر آسمانی مذہب کا فرض ہے کہ وہ اپنے احکام کی تعلیم و تلقین سے پہلے لوگوں کو اپنے آسمانی ہونے کا یقین دلائے اور اسلام چونکہ دنیا کا آخری اور سب سے زیادہ کامل و مکمل مذہب ہے اور اس کی دعوت کسی خاص ملک و قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے۔ اس بنا پر تمام سماوی ادیان و مذاہب میں یہ امتیازِ خصوصی صرف قرآن مجید کو حاصل ہے کہ جس تکرار و تاکید سے اس نے اپنا مُنزّل من اللہ ہونا بیان کیا ہے کسی اور کتاب نے اپنی نسبت اس شد و مد اور تاکید و تکرار سے نہیں بیان کیا

قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر تحدی جو لوگ اس کے مُنزّل من اللہ ہونے پر شک کرتے ہیں ان کو تحدیؔ کی گئی۔ ارشاد ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی	اور اگر تم کو کچھ شبہ ہو اس چیز کے متعلق جو ہم
عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ	نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس جیسی
وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ	کوئی سورۃ لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے
اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ	گواہوں کو بلا لو اگر تم سچے ہو۔

پھر اس پر ہی بس نہیں بلکہ سخت تہدید کے انداز میں فرمایا جاتا ہے۔

Marfat.com

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا
النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ
اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ
(بقرہ)

اور اگر تم ایسا نہ کرو (یعنی قرآن کی کسی سورت کا مثل نہ لاؤ) اور تم ایسا ہرگز نہیں کرسکتے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔

ایک مقام پر ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ
عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ
لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ
لِبَعْضٍ ظَھِیْرًا
(بنی اسرائیل)

(اے نبی) آپ کہہ دیجئے کہ اگر انسان اور جن اس قرآن کا مثل لانے پر متفق ہو جائیں تب بھی وہ اس کا مثل نہیں لاسکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں۔

ایک جگہ قرآن مجید کو منزل من اللہ نہ ماننے والوں کو جو اسے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام کہتے تھے اس طرح تحدی کی گئی ہے۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا
بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ وَادْعُوْا مَنِ
اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ
کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ
(یونس)

کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے (نبی نے) خود اسے گھڑ لیا ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اچھا اگر ایسا ہے تو تم اس جیسی ایک سورۃ تو لے آؤ اور اللہ کے سوا جن کو تم بلاسکتے ہو بلالو اگر تم سچے ہو۔

یہ لوگ جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے ان کی نسبت فرمایا گیا کہ یہ محض اپنی کوتاہ علمی اور ناواقفیت کے باعث ایسا کہتے ہیں اور اس امر کی نسبت جھوٹ بولتے ہیں جسے یہ خود نہیں جانتے۔ آیت بالا کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے۔

بَلْ کَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِہٖ وَلَمَّا

بلکہ انھوں نے ایسی چیز کی تکذیب کی ہے جس کے

يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ (یونس)

علم کا احاطہ انھوں نے نہیں کیا اور جس کی اصل حقیقت ان کے سامنے نہیں آئی اسی طرح ان لوگوں سے پہلے بھی لوگوں نے تکذیب کی ہے پس آپ دیکھئے کہ ظالموں کا انجام کیا ہوا۔

ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ فَإِن لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ (ھود)

کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے خود قرآن گھڑ لیا ہے آپ کہہ دیجئے کہ اچھا اس طرح کی دس گھڑی ہوئی سورتیں ہی لے آؤ اور اللہ کے سوا جن لوگوں کو تم بلا سکو بلا لو اگر تم سچے ہو اور اگر وہ کچھ جواب نہ دیں تو جان لو کہ وہ اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے اور یہ کہ سوائے خدا کے کوئی دوسرا معبود نہیں ہے تو کیا تم اطاعت قبول کرنے والے ہو۔

اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منکرین کی ہوا پرستی کا اس طرح یقین دلایا جاتا ہے۔

فَإِن لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (القصص)

(اے محمد) اگر وہ لوگ آپ کو جواب نہ دیں تو آپ جان لیں کہ یہ لوگ صرف اپنی خواہشوں کا اتباع کرتے ہیں اور ان لوگوں سے زیادہ گمراہ کون ہے جو اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہوں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

Marfat.com

بعض جزی واقعات سے قرآن مجید کے وحی ہونے پر استدلال

یہ آیات جو اوپر گزریں ان میں قرآنی اعجاز کو پیش کرکے سخت ترین تحدی کی گئی ہے اور منکرین کے عجز سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی وحی ہے۔ ان آیات کے علاوہ بکثرت دوسری آیتیں بھی ہیں جن میں قرآن مجید کے وحی ہونے پر بعض جزی واقعات اور قرآن مجید کے مضامین ومطالب سے استدلال کیا گیا ہے مثلاً

أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ بَل لَّا يُؤْمِنُونَ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ (الطور)

یا یہ کہتے ہیں کہ (پیغمبر) قرآن مجید خود بنالائے ہیں (کوئی نہیں) بلکہ یہ لوگ ایمان نہیں لائے ہیں۔ اب ان کو چاہیے کہ کوئی بات اسی طرح کی لے آئیں اگر وہ سچے ہیں۔

حضرت یوسف کا واقعہ بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ (یوسف)

یہ غیب کی خبریں جو ہم آپ پر وحی کرتے ہیں اور آپ (اے محمد) ان کے پاس نہیں تھے جب انھوں نے اپنی کوشش مرکوز کرلی اور وہ تدبیریں کرنے لگے۔

حضرت مریم کے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے۔

ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ (مریم)

یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کے پاس وحی کرتے ہیں اور آپ ان لوگوں کے پاس نہیں تھے جب وہ قرعہ اس غرض سے ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کریگا اور آپ ان کے پاس نہیں تھے جبکہ وہ جھگڑ رہے تھے

Marfat.com

اس آیت کو ذرا غور سے پڑھیے اور دیکھیے کہ اس میں دو مرتبہ "وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ" فرما کر اس بات پر زور ڈالا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود حضرت مریم کی کفالت پر بحث و تکرار کے وقت موجود نہیں تھے تو اب قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آپ کو اس واقعہ کا علم کس طرح ہوا؛ قرآن مجید اس کا جواب دیتا ہے کہ "نُوحِيهِ إِلَيْكَ" ہم آپ پر اس کی وحی بھیجتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ کسی گذشتہ واقعہ کو معلوم کرنے کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اُس کو کسی اخبار یا کتاب میں پڑھا ہو اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی سے سننے کا اتفاق ہوا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان دونوں میں سے کوئی ایک صورت بھی متحقق نہیں تھی، پہلی صورت کی تو آپ نے خود "لستُ بقارئٍ" میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" فرما کر نفی کر دی اور آپ کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس کی تردید نہیں کر سکا۔ اب رہی دوسری صورت، یعنی یہ کہ آپ کو کسی نے یہ واقعات غیب سنائے ہوں تو قرآن مجید اس کی تردید اس طرح کرتا ہے حضرت نوح کے قصہ کے بعد ارشاد ہے۔

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا	یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ
إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ	پر وحی کرتے ہیں اس لیے پہلے نہ آپ اس کو
وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا	جانتے تھے اور نہ آپکی قوم آپ صبر کیجئے کوئی
فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ (ہود)	شبہ نہیں کہ عاقبت پرہیزگاروں کیلئے ہی ہے

پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ان دونوں میں سے کوئی ایک ذریعۂ علم بھی نہیں ہے تو اب قرآن کا دعویٰ "نوحیہ الیک" کے تسلیم کرنے میں کیا تذبذب ہو سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا	اور اے نبی آپ طور کی جانب غربی میں نہیں
إِلَى مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ	تھے جب ہم نے موسیٰ کیطرف اپنا فیصلہ نازل

Marfat.com

الشّٰهِدِيْنَ ـ (القصص) کیا اور آپ اس وقت وہاں موجود نہ تھے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا۔

وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ (القصص)

لیکن ہم نے بہت سی جماعتیں پیدا کیں اور ان پر دراز مدتیں گذر گئیں اور آپ مدین والوں میں نہ رہتے تھے کہ ان کو ہماری آیات سناتے لیکن ہم رسول بھیجتے رہے ہیں

اس آیت کے بعد جو آیت ہے اس میں بھی اس مضمون کا اعادہ کیا گیا ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (القصص)

اور آپ طور کے کسی کنارہ پر نہیں تھے جب ہم نے ندا دی، لیکن آپ کو یہ واقعہ محض اپنے رب کی رحمت سے معلوم ہوا ہے تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جس کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں

عرب کی گذشتہ قوموں کے حالات سنانے کے بعد ارشادِ حق بنیاد ہے۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا

یہ آبادیاں وہ ہیں جن کے کچھ حالات ہم آپکو سُناتے ہیں۔

سورۂ عنکبوت کی آیت ذیل میں اسی مضمون کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس انسانی ذرائع علم میں سے کوئی ذریعہ نہیں تھا اور آپ کا ذریعہ علم صرف وحی الٰہی تھا اور زیادہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ

نزول قرآن سے پہلے نہ تو آپ کوئی کتاب

وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ
پڑھتے تھے اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو ان باطل پرستوں کے لیے شبہ کی گنجائش بھی نکلتی۔

اس آیت میں صراحۃً اس بات کا اعلان کر دیا گیا ہے کہ آپ نزولِ قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔

ایک مقام پر ارشاد ہے۔

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ (شعراء)
اور اس طرح ہم نے آپ کے پاس اپنے حکم سے روح بھیجی۔ آپ جانتے ہی نہیں تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔

اب ایک احتمال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ غیبی اطلاعات آپ نے کسی سے سُنی ہوں تو اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مکہ معظمہ میں دو قسم کے لوگ آباد تھے ایک مشرکین اور دوسرے اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ، مشرکین چونکہ کوئی کتاب نہیں رکھتے تھے اس لئے ان کو انبیاء متقدمین کا کوئی واقعہ بھی معلوم نہیں تھا، چنانچہ حضرت مریم کے قصہ میں "مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ" فرماکر اسی امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اب رہے مکہ کے اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ تو اس میں شبہ نہیں کہ ان لوگوں کی آسمانی کتابوں میں بعض انبیاء کے واقعات کا تذکرہ ضرور ہے لیکن سید کونین کے بڑے سے بڑے دشمن بھی جانتے تھے کہ آپ نبوت سے پہلے ان لوگوں سے الگ تھلگ رہتے تھے اور اس لئے کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں کر سکتا تھا کہ آپ کو ان غیبی قصص و واقعات کا علم یہود و نصاریٰ کے ذریعہ ہوا ہے۔ دشمنوں نے آپ کی تکذیب میں کیا کچھ کہا لیکن قرآن کے ادعاء "نَقُصُّ عَلَيْكَ" یا "نُوحِيهِ إِلَيْكَ"

Marfat.com

کے جواب میں یہ کہنے کی جسارت کسی ایک کو بھی نہیں ہوئی کہ آپ فلاں وقت یا فلاں مقام پر کسی عیسائی یا یہودی سے قصہ سن رہے تھے۔ لے دے کے عیسائیوں کے پاس بحیرا راہب کا ایک افسانہ ہے جو اول تو ثابت نہیں اور اگر ثابت مان بھی لیا جائے تو کیا دنیا کا کوئی معمولی عقل کا انسان بھی اسے باور کر سکتا ہے کہ راہب نے چند منٹوں میں ہی آپ کو جب کہ آپ کی عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اور آپ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ شام کے سفر پر جا رہے تھے وہ سب کچھ بتا دیا جو قرآن مجید کے دو دفتوں کے درمیان ہے اور پھر آپ نے اس کو بغیر لکھے ہی من وعن گوشۂ خاطر میں محفوظ کر لیا اور لطف یہ ہے کہ آپ شام سے واپس آتے ہیں اور اس کے بعد (نبوت سے قبل تک) ستائیس اٹھائیس سال مکہ میں رہتے ہیں اپنے قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں اور اس کے باوجود راہب کے سنائے ہوئے واقعات کو چہل سالگی کی عمر تک بالکل حرفِ راز کی طرح سینہ میں پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اشارۃً و کنایتہً بھی کسی سے کسی واقعہ کا ذکر نہیں آتا اور چالیس سال کی عمر کے بعد یکایک غیبی اطلاعات کا سمندر امنڈ پڑتا ہے۔ یا للعجب

بہر حال یہ احتمال چونکہ اس درجہ کمزور تھا کہ آپ کے دشمنوں کے حاشیۂ خیال میں بھی موجود نہیں تھا اس لئے قرآن مجید نے اس سے سکوت کیا۔

عدم اختلاف سے قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر استدلال

جزئی واقعات کے علاوہ قرآن مجید میں اختلاف کے نہ ہونے سے بھی اس کے منزل من اللہ ہونے پر استدلال کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (نساء)	کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں کثیر اختلاف پاتے۔

Marfat.com

اہل کتاب قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے باخبر ہیں

اہل کتاب اگرچہ زبان سے انکار کرتے تھے، لیکن دل میں وہ بھی جانتے تھے کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خود اہلِ کتاب تھے اور اس بنا پر کلام الٰہی اور وحی ربانی کے مفہوم سے یکسر بیگانہ نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کی تسکین کے لئے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (بقرہ)

اور وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوا ہے پس آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔

ایک دوسری آیت میں ہے۔

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ (سبا)

اور وہ لوگ جنھیں علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے وہی حق ہے۔

ایک اہلِ کتاب کی شہادت کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی۔

لیکن چونکہ اس زمانہ میں عرب کے جاہل مشرکین بنو اسرائیل کے علم و فضل سے مرعوب تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کی تردید و تکذیب کیلئے ان علماء کا سہارا ڈھونڈھتے تھے جس میں ان کو ہمیشہ ناکامی اس بنا پر ہوتی تھی کہ خدا نے خود ان علماء کی زبان سے آنحضرت کی رسالت اور قرآن کے وحی ہونے کی تصدیق کرادی تھی بلکہ ان میں بعض علماء تو ایسے تھے جنھوں نے سرکارِ دوعالم کا روئے انور دیکھتے ہی سر اطاعت

Marfat.com

وتسلیم خم کر دیا اور بے ساختہ بول اٹھے "اِنَّ هٰذَا الوجہ لیس بوجہ کاذب" بے شبہ یہ چہرہ کوئی کاذب چہرہ نہیں ہے" اس لئے ان منکرین وحی کو عار دلانے اور قرآن مجید کے وحی الٰہی ہونے کی حقیقت کو ان پر بطور الزام ثابت کرنے کے لئے ایک عالم بنی اسرائیل (عبداللہ بن سلام) کی شہادت کو بھی اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

قُلْ اَرَاَیْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (الاحقاف)	آپ فرمایئے بھلا دیکھو تو اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے آیا ہو اور تم نے اس کو نہیں مانا اور بنو اسرائیل کا ایک گواہ اس کی گواہی بھی دے چکا اور وہ ایمان لے آیا مگر، تم نے غرور کیا، بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

سورۂ بنی اسرائیل میں اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ وَّیَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا	آپ کہئے تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ جن لوگوں کو قرآن سے پہلے علم ملا ہے ان پر جب اس قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارا رب اس کا وعدہ ہو کر رہا۔[۱]

[۱] اس آیت کا مفاد بھی یہ جتانا ہے کہ قرآن کی حقانیت اور آنحضرت صلعم کی نبوت کی تصدیق وہ انصاف پسند ارباب علم کر رہے ہیں جنھیں پچھلی کتابوں کی بشارت سے واقفیت ہے "وعداللہ" سے اشارہ اس وعدہ ربانی کی طرف ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی زبانی توراۃ کتاب استثنا میں اسطرح کیا گیا تھا "بنی اسرائیل میں تمہارے بھائیوں (بنی اسمٰعیل) میں سے ایک نبی اٹھاؤں گا جسکے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا" علماء اہل کتاب قرآن مجید کو سن کر فوراً سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور وہ یقین کرتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہی رسول بلشر بہ ہیں اور قرآن وہی کلام خداوندی ہے جس کا ذکر توراۃ میں کیا گیا ہے۔

Marfat.com

ایک آیت میں مشرکین سے پوچھا گیا ہے کہ کیا علماء بنی اسرائیل کا قرآن کی حقیقت سے آگاہ ہونا تمہارے لئے خدا کی کوئی نشانی نہیں ہے؟

اَوَلَمْ یَکُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ	کیا ان کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس
عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (الشعراء)	کو علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں۔

مشرکین وحی سے بیگانہ تھے لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اہل کتاب وحی اور کلام الٰہی کی حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ خود ان کی آسمانی کتابوں کی پیش گوئیوں اور بشارتوں کے مطابق بنو اسمٰعیل میں ایک نبی پیدا ہوگا اور اپنے ساتھ اللہ کی ایک کتاب بھی لائے گا۔ پس اگر یہ لوگ بھی قرآن کو وحی ماننے سے انکار کریں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان نہ لائیں تو ظاہر ہے ان سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتا ہے، چونکہ اسلام قبول کرنے کی توقع مشرکین کی بہ نسبت ان لوگوں سے زیادہ تھی اس لئے خدا نے حکم دیا کہ مسلمانو کا معاملہ اہل کتاب کے ساتھ نرمی کا ہونا چاہیئے مسلمانو کو ان سے کہنا چاہیئے کہ تم کو قرآن کے وحی ماننے میں کیا تامل ہے آخر تم بھی تو ہماری طرح ایک کتاب الٰہی پر ایمان رکھتے اور اسے منزل من اللہ مانتے ہو۔ دیکھئے کس بلیغ پیرایہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْکِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ	اور تم اہل کتاب سے صرف بطریق احسن مجادلہ
هِیَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا	کرو ان میں سے ان لوگوں کے سوا جنھوں نے
مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ	(انکار حق کر کے) ظلم کیا ہے اور ان سے کہو کہ
اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْکُمْ وَاِلٰهُنَا وَ	ہم ایمان لے آئے ہیں اس کتاب پر جو تم پر
اِلٰهُکُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ	نازل کی گئی اور اس پر بھی جو ہم پر نازل کی
مُسْلِمُوْنَ وَکَذٰلِکَ اَنْزَلْنَآ	گئی ہے اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے

Marfat.com

اِلَیْکَ الْکِتٰبَ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ ھٰٓؤُلَآءِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَآ اِلَّا الْکٰفِرُوْنَ (عنکبوت)	اور ہم اس کے مطیع و فرماں بردار ہیں اور اسی طرح ہم نے (اے محمد) آپ پر کتاب نازل کی پس جن لوگوں کو ہم نے کتاب دے رکھی تھی اور اس پر ایمان لے آئے ہیں اور ان اہل مکہ میں سے بھی بعض وہ ہیں جو اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں ہماری آیات سے جحود و انکار تو کافر ہی کرتے ہیں

مشرکین کے اعتراضات کی تردید | پھر ان استدلات و ترغیبات پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ بعض دریدہ دہن مشرکین و کفار قرآن کی اس حیثیت پر جو اعتراضات کرتے تھے۔ ان سب کے بھی جوابات دئے گئے ہیں یہ لوگ کہتے تھے کہ اگر قرآن اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں نسخ نہ پایا جاتا۔ قرآن اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَةً مَّکَانَ اٰیَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (النحل)	اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جو کچھ نازل کرتا ہے وہ اسے خوب جانتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کلام گھڑنے والے ہیں (نہیں) بلکہ ان میں سے اکثر جانتے ہی نہیں ہیں

اور آنحضرت کو اس کے جواب میں یہ کہنے کا امر کیا جاتا ہے۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّکَ بِالْحَقِّ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ (النحل)	آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن کو میرے رب کی طرف سے روح القدس لیکر آئے ہیں تاکہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں انکو ثابت قدمی حاصل ہو اور مسلمانوں کیلئے ہدایت اور بشارت ہو۔

Marfat.com

بعض کہتے تھے کہ حضور کا کوئی معلم ہے جو آپ کو یہ تمام باتیں سکھاتا ہے۔ اس قول میں یہ بہتان طراز خود دو قسم کے لوگ تھے کوئی کسی نصرانی غلام کو معلم بتاتا تھا اور کوئی کسی یہودی غلام کا نام لیتا تھا لیکن تھے یہ دونوں غلام عجمی اگر مشرکین کا یہ "معلم" عربی ہوتا تو وہ متعین طور پر اس کا نام لے سکتے تھے۔ قرآن مجید میں کفار کی اس بہتان طرازی اور اس کی تردید کا بیان اس طرح ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا	اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مشرکین کہتے ہیں
يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیْ	آپکو ایک انسان قرآن سکھاتا ہے (حالانکہ) جس
يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا	شخص کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں وہ عجمی ہے
لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِيْنٌ (النحل)	اور قرآن کی زبان صاف اور واضح عربی ہے

اس کے بعد ان لوگوں کے جھوٹ پر مُہرِ توثیق اس طرح ثبت کی گئی ہے۔

اِنَّمَا يَفْتَرِی الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا	یہ جھوٹ کا افترا وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ کی
يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ	آیات پر ایمان نہیں لاتے اور یہی وہ لوگ
هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (النحل)	ہیں جو جھوٹے ہیں۔

بعض مشرکین کا خیال تھا کہ قرآن مجید کا القاء شیاطین کی طرف سے ہوتا ہے اور عموماً کاہن (Astrologer) غیب کی خبریں بیان کرتے ہی ہیں۔ آپ بھی کاہن ہیں اور اس لئے غیب کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس وسوسۂ شیطانی کی تردید بھی نہایت پرزور الفاظ میں کی ہے ارشاد ہے۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ وَمَا	اس قرآن کو شیاطین نے نہیں اتارا اور نہ یہ انکے
يَنْۢبَغِیْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (الشعراء)	لائق ہے اور نہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔
وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ	اور یہ قرآن مردود شیطان کا قول نہیں ہے

Marfat.com

فَاَیْنَ تَذْھَبُوْنَ (التکویر) پس تم لوگ کہاں جا رہے ہو۔

قرآن کو بعض لوگ شاعرانہ کلام کہتے تھے۔ اس کی بھی تردید کی گئی۔

وَمَا ھُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِیْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ وَلَا بِقَوْلِ کَاھِنٍ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ (الحاقہ)

اور وہ (قرآن) کسی شاعر کا قول نہیں ہے تم بہت ہی کم ایمان لاتے ہو اور نہ وہ کسی کاہن کا قول ہے۔ تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو

ان سب اعتراضات اور شیطانی وساوس کی تردید کے بعد اللہ تعالیٰ خود اپنی اور فرشتوں کی شہادت سے قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

لٰکِنِ اللّٰہُ یَشْھَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَیْکَ اَنْزَلَہٗ بِعِلْمِہٖ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یَشْھَدُوْنَ وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا (نساء)

لیکن اللہ کی شہادت دیتا ہے جو آپ پر نازل کیا گیا ہے اللہ نے اس کو اپنے علم سے اتارا ہے اور فرشتے بھی گواہ ہیں (اگرچہ) شہادت کے لئے تو اللہ ہی کافی ہے۔

مشرکین کا کوئی اور حیلہ کارگر نہیں ہوا تو انھوں نے یہی کہنا شروع کر دیا کہ بھلا یہ معجزہ ہی کیا ہوا نبی بھی عربی اور قرآن بھی عربی۔ اصل معجزہ تو جب ہوتا کہ عربی نبی پر عجمی قرآن نازل ہوتا۔ قرآن نے مشرکین کے اس قول کی رکاکت کا بھی اظہار کیا ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰہُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِیًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ ءَ اَعْجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ قُلْ ھُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھُدًی وَّشِفَآءٌ وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ فِیْٓ اٰذَانِھِمْ وَقْرٌ وَّھُوَ عَلَیْھِمْ عَمًی اُولٰٓئِکَ

اور اگر ہم قرآن کو عجمی قرآن بناتے تو یہ لوگ کہتے کہ اس کی آیات مفصل کیوں نہیں ہیں بھلا زبان عجمی اور لوگ عربی۔ آپ کہہ دیجیے کہ قرآن ایمان والوں کیلئے ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ہیں ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور

يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ — یہ قرآن انکے حق میں اندھاپن ہے یہی لوگ ہیں

(حمٓ السجدہ) — جنھیں دور کی جگہ سے ندا دی جاتی ہے۔

بعض کفار خود اپنا منہ چڑانے کے لئے کہتے تھے کہ قرآن (معاذ اللہ) من گھڑت ہے اور دوسرے لوگوں نے اس میں آپ کی مدد کی ہے۔ قرآن اسکی بھی تردید کرتا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ — کافر کہتے ہیں کہ یہ قرآن تو کچھ بھی نہیں نرا بہتان

اِفْكُ اِۨفْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ — ہے اور اس کے بنانے میں دوسرے لوگوں نے

قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا — مدد کی ہے کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں نے بالکل جھوٹ

وَّزُوْرًا (الفرقان) — اور ظلم کی بات کہی ہے۔

اوپر جو آیات گزریں دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کے وحی ربانی ہونے کے دلائل بیان کئے ہیں اور دوسری وہ آیات ہیں جن میں قرآن مجید سے متعلق کفار و مشرکین کے بیہودہ خیالات، باطل توہمات اور شیطانی وساوس کی پرزور تردید کی گئی ہے ان آیات کے علاوہ کثرت سے ایسی آیات بھی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بالکل صاف اور واضح الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ قرآن مجید کا نزول اللہ کی جانب سے ہوا ہے اس مضمون کے بار بار تکرار سے منشا یہی ہے کہ اسلامی عقائد و اعمال کا یہ اساسی عقیدہ اس طرح لوگوں کے دل و دماغ میں مرتسم ہو جائے کہ انھیں اس بارہ میں ذرا سا بھی تذبذب اور شک باقی نہ رہے آیات ذیل ملاحظہ کیجئے۔

(۱) اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (دخان) — ہم نے بے شبہ اس قرآن کو مبارک رات میں اتارا

(۲) اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (قدر) — بے شبہ ہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا

(۳) تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ — اس قرآن کا نزول اس ذات کی طرف سے ہے

وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى (طٰہٰ) — جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا

(۴) قُلْ اَنْزَلَہُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الفرقان)

آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن کو اس ذات نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھیدوں سے واقف ہے

(۵) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا

ہم نے ہی قرآن مجید آپ پر ٹھہر ٹھہر کر نازل کیا ہے

(۶) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

ہم نے ہی اس نصیحت (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں۔

پورے قرآن کو اول سے آخر تک پڑھیے تو اس مضمون کی آیات چند ایک نہیں بلکہ بہت زیادہ ملیں گی واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے وحی ہونے کے مضمون کو جس شد و مد اور تاکید و تکرار سے بیان کیا ہے دنیا کی کسی اور کتاب سماوی نے اپنے متعلق اس طرح بیان نہیں کیا اس سلسلہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تشنہ تکمیل رہ گیا ہو۔

حضرت جبرئیل کی توثیق یہ ظاہر ہے کہ وحی اللہ کی طرف سے انبیاء پر عموماً حضرت جبرئیل کے واسطہ سے نازل ہوتی رہی ہے اور خود قرآن بھی آنحضرت پر اسی طرح نازل ہوا۔ اس بنا پر قرآن میں حضرت جبرئیل کی وساطت کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور اُن کی توثیق کر کے اس شبہ کو دور کر دیا گیا ہے کہ ممکن ہے ان سے پیغام الٰہی کے پہونچانے میں کوئی تغیر و تبدل ہو گیا ہو۔ ارشاد ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ)

آپ کہہ دیجئے کہ جو لوگ جبرئیل کے دشمن ہیں (ہوا کریں) انھوں نے ہی تو اللہ کے حکم سے آپ پر قرآن اتارا ہے

سورہ نحل میں ہے۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ

آپ کہہ دیجئے کہ اس کو روح القدس نے میرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا ہے تاکہ وہ ایمان

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ — والوں کو ثابت قدم رکھے اور وہ مسلمانوں کیلئے ہدایت اور بشارت ہو

سورۂ شعراء میں انہیں روح الامین کہا گیا ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جبرئیل امین کامل ہیں ان سے کسی خیانت یا کوتاہی کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ فرمایا گیا ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (الشعراء) — اس قرآن کو روح الامین (جبرئیل) نے آپکے قلب پر اتارا ہے تاکہ آپ انذار کرنیوالوں میں سے ہو جائیں

سورۂ تکویر میں اس سے بھی زیادہ تاکید کے ساتھ حضرت جبرئیل کی توثیق کیگئی ہے۔ ارشاد ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ — بیشک وہ معزز قاصد کا کلام ہے جو قوت والا ہے خدائے عرش کے نزدیک مرتبہ والا ہے اس کی اطاعت کی جاتی ہے اور وہاں امین و معتبر ہے

سورۂ النجم میں ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى — آنحضرت کو سخت قوتوں والے اور زور آور نے سکھایا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق حضرت جبرئیل کے تعارف اور ان کی توثیق کے بعد ضرورت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی توثیق کی جاتی تاکہ کسی شخص کو یہ شبہ نہ ہو کہ ممکن ہے آپ سے وحی کے پہونچانے میں کوئی کوتاہی ہوگئی ہو ساتھ ہی ضروری تھا کہ اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حیثیت بھی بیان کر دی جاتی جس سے یہ معلوم ہو جاتا کہ حضور تو محض ایک پیغامبر ہیں۔ اللہ کی طرف سے آپ پر جو وحی نازل ہوتی ہے آپ اس کو بے کم و کاست خدا کے بندوں تک پہونچانے پر مامور ہیں۔ پھر چونکہ اس منصب جلیل و عظیم (رسالت) کے لئے خدا نے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ اس لئے آپ کے ذہنی اور دماغی قویٰ بھی عام انسانوں سے زیادہ بلند اور مضبوط ہیں جس کے باعث آپ وحی میں نہ کوئی تغیر و تبدل کر سکتے ہیں اور نہ اس کے کسی لفظ اور معنیٰ کا مفہوم سمجھنے میں آپ سے

Marfat.com

غلطی ہوسکتی ہے۔ رب الوحی نے یہ سب باتیں بھی قرآن میں بیان کی ہیں تاکہ لوگوں پر حجت تمام ہو جائے۔

قرآن کا افترا کیا ہی نہیں جاسکتا اس سلسلہ میں بعض آیات تو وہ ہیں جن میں عمومی طور پر فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآن سوائے اللہ کے کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس عموم کے ماتحت خود سرورِ کائنات کی ذاتِ ستودہ صفات بھی داخل ہے۔ مثلاً یہ آیت۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى	اور یہ قرآن وہ نہیں ہے کہ اس کو غیر خدا نے گھڑ لیا
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ	ہو لیکن اس کتاب کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے
الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ	نازل ہوئی اور اس کی ہی تفصیل ہے اس قرآن کے
لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ	رب العالمین کی طرف سے ہونے میں کوئی شبہ نہیں

آنحضرت صلعم کے متعلق قرآنی تصریحات ان کے علاوہ دوسری آیات وہ ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے متعلق چند تصریحات و توضیحات ہیں ہم ذیل میں انھیں نمبروار لکھتے ہیں۔

(۱) ایک آیت میں بتایا گیا ہے کہ آپ بھی اور انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں فرق صرف یہ ہے کہ آپ پر وحی اترتی ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ	آپ فرما دیجیے میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں البتہ مجھ پر وحی آتی ہے

اور آج یہ کوئی نئی بات نہیں ہے آپ سے پہلے بھی انبیاء آتے رہے اور ان پر وحی نازل ہوتی رہی ہے۔ بس آپ کا فرض منصبی یہی ہے کہ خدا کا پیام جوں کا توں لوگوں تک پہونچا دیں اس کے ماسوا آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ خود آپ کے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ" آپ خود وحی کا اتباع کرتے ہیں اور آپ تو صرف صاف صاف ڈرانے والے ہیں۔ اسی آیت کے آخر میں ہے۔

Marfat.com

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ

(۲) حضور کو لوگوں کے ثواب و عقاب میں بھی کوئی دخل نہیں ہے ارشادِ خداوندی ہے۔

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ	آپ کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ اللہ
یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ اَوْ یُعَذِّبَھُمْ	ان کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے یا ان کو عذاب
فَاِنَّھُمْ ظٰلِمُوْنَ (نساء)	دے وہ تو بہر حال ظالم ہیں۔

(۳) حضور کو اس کا بھی علم نہیں ہے کہ خدا نے لوگوں سے جس چیز کا وعدہ کیا ہے وہ قریب ہے یا بعید ہے۔ فرماتے ہیں۔

قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ	آپ کہہ دیجئے میں نہیں جانتا کہ تم سے جس چیز
اَمْ یَجْعَلُ لَہٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا	کا وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا نہیں یا میرا
(جن)	رب اس کے لئے کوئی مدت مقرر کرے گا

بعض مشرکین مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ آپ کی عام پند و نصائح تو بڑی عمدہ ہیں لیکن قرآن میں بت پرستی کی جو مذمت کی جاتی ہے اس سے تکلیف ہوتی ہے اس لئے آپ یا تو موجودہ قرآن کو چھوڑ کر کوئی دوسرا قرآن لے آیئے جس میں ایسی "دلخراش" باتیں نہ ہوں یا پھر کچھ اور نہیں تو اس قرآن میں ہی ترمیم اور تغیر و تبدل کر دیجئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی

قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ	جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی امید نہیں ہے یعنی
بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ ھٰذَآ اَوْ بَدِّلْہُ قُلْ	حشر کا عقیدہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ آپ
مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَہٗ مِنْ تِلْقَآئِ	اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آیئے یا
نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اِنِّیْٓ	اس کو بدل دیجئے آپ فرما دیجئے کہ میں قرآن کو
اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ	اپنی طرف سے بدل نہیں سکتا۔ میں تو

Marfat.com

يَوْمٍ عَظِيْمٍ — اسی چیز کی پیروی کرونگا جسکی وحی مجھ کو بھیجی گئی ہے

(یونس) — اگر میں نے نافرمانی خداوندی کی تو میں اپنے رب

کے سخت دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحی کو بعینہٖ پہونچا دیتے ہیں اور اس میں ہوا و ہوس کا بالکل دخل نہیں ہوتا۔ اعلان واجب الاذعان ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ — آپ اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے آپ کا نطق

اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم) — وحی ہے جس کی آپ پر وحی ہوئی ہے

(۵) اور آپ نطق عن الہوی کرہی نہیں سکتے۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ — اور اگر وہ (محمد) بعض باتیں بنا کر ہماری طرف

لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا — منسوب کر دیتے تو ہم ضرور ان کا داہنا ہاتھ پکڑ

مِنْهُ الْوَتِيْنَ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ — لیتے پھر ان کی رگ کاٹ ڈالتے اور تم میں سے

عَنْهُ حَاجِزِيْنَ (الحاقہ) — کوئی اس کا روکنے والا نہ ہوتا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا — کیا وہ کہتے ہیں کہ محمد نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے

فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ — اگر اللہ چاہتا تو وہ آپ کے دل پر مہر لگا دیتا

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ — اللہ باطل کو مٹاتا اور حق کو اپنے کلمات سے

بِكَلِمٰتِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (شوریٰ) — ثابت کرتا ہے بے شبہ وہ دلوں کے اسرار سے خوب واقف ہے

(۶) کوئی شبہ نہیں کہ آپ دیانت دار اور سچے قاصد ہیں اللہ کی وحی بعینہٖ لوگوں تک پہونچا دیتے ہیں۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ[1] (الحاقہ) — کوئی شبہ نہیں کہ قرآن رسول کریم کا قول ہے

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھانا اور اس کو آپ کے سینۂ اقدس واطہر میں محفوظ رکھنا یہ سب اللہ کے ذمہ ہے اس بنا پر آپ سے اس کے یاد کرنے اور سمجھنے میں نہ کوئی غلطی ہو سکتی ہے اور نہ آپ کو اس میں کوئی سہو پیش آسکتا ہی یہی وجہ ہے کہ سید کونین فداہ ابی و امی اس خیال سے کہ کہیں وحی الہٰی کا کوئی لفظ گوشۂ یاد سے اوجھل نہ ہو جائے نزول وحی کے وقت اپنی زبان حق ترجمان کو جلدی جلدی حرکت دیتے تھے تو خدا نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ارشاد ہے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ[2] — آپ جلدی جلدی پڑھنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجئے قرآن کا (آپ کے سینہ میں) جمع کرنا اور اس کا پڑھانا تو ہمارا ذمہ ہے جب ہم آپکو پڑھائیں تو آپ بھی اسکا اتباع کیجئے۔

---

[1] جیسا کہ اوپر گذر چکا ہی سورۂ تکویر میں "رسول کریم" سے مراد جبریل ہیں لیکن سورہ الحاقہ میں "رسول کریم" سے مراد آنحضرت ہیں دونوں سورتوں میں "رسول کریم" کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے آنحضرت اور جبریل دونوں کو رسول اس لئے کہا گیا ہے کہ جبریل اللہ اور آنحضرت صلعم کے اور سرور دو عالم اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان نامہ بری (رسالت) کا فرض انجام دیتے ہیں اور چونکہ دونوں اپنے اپنے فریضۂ منصبی کے ادا کرنے میں نہایت دیانت دار اور امین ہیں اس لئے دونوں "رسول کریم" ہیں۔ کسی شخص کو قول کے لفظ سے اشتباہ نہ ہونا چاہیئے کہ اس کی اضافت رسول کی طرف ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ قاصد کا قول اگرچہ اس کی زبان سے ادا ہوتا ہے اور اس لئے اس کا قول (مجازاً) کہلاتا ہے۔ لیکن در اصل وہ ہوتا ہے کلام اس شخص کا جس کا نامہ بر یہ قاصد ہوتا ہے۔

[2] کور چشمان باطن اگر آفتاب حقیقت کی ایک ہلکی سی کرن بھی دیکھ سکیں تو انھیں معلوم ہو گا کہ قرآن مجید کے وحی الٰہی ہونے کے تمام دلائل ایک طرف اور صرف "لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ" ایک طرف یہ مختصر سی آیت اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہی کہ قرآن حضور کا اپنا کلام نہیں کون نہیں جانتا کہ کوئی متکلم کلام کرتے وقت اپنی زبان کو اس لئے جلد جلد حرکت نہیں دیتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے یاد رہ جائے (بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ)

Marfat.com

ایک آیت میں ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى (الاعلیٰ)

ہم آپ کو پڑھائیں گے، پھر آپ نہ بھولیں گے، مگر وہ جسے اللہ ہی چاہے۔ وہ کھلی اور چھپی باتوں کو جانتا ہے اور ہم آہستہ آہستہ آپ کو آسانی تک پہونچائیں گے۔

(۸) صرف پڑھانا اور یاد کرانا ہی نہیں بلکہ اس کی تشریح و توضیح بھی اللہ ہی کے ذمہ ہے

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (القیمۃ)

پھر اس کو سمجھانا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بسلسلۂ وحی جتنے امور بحث طلب ہو سکتے تھے دیکھو قرآن نے کس طرح ان میں سے ایک ایک امر کے بارہ میں واضح تصریحات کی ہیں۔

قرآن آپ کے قلب پر نازل ہوا ساتھ ہی اس نے نزول قرآن کی کیفیت بھی بیان کی ہے کہ اس کا تعلق حواسِ ظاہری سے نہیں بلکہ دل سے ہے ارشاد ہے۔

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

جبریل نے قرآن کو اللہ کے حکم سے آپکے دل پر اتارا ہے

ایک اور مقام پر ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ

قرآن کو روح الامین آپ کے قلب پر لے کر نازل ہوئے ہیں تاکہ آپ ڈرانیوالوں میں سے ہوں

لوح محفوظ کا بیان ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مطہر پر نازل ہونے سے پہلے لوح محفوظ میں موجود تھا۔ ارشاد ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یقینی بات ہے کہ حضور پر مبدا فیاض کی جانب سے قرآن مجید کا فیضان ہو رہا تھا اور آپ بہ تقاضائے بشریت اسے یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو جلد جلد حرکت دے رہے تھے اس پر حضرتِ حق جل مجدہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (البروج) — بلکہ وہ قرآن مجید ہی جو لوح محفوظ میں ہے

اور صرف قرآن مجید ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام واقعات و اشیاء کا تذکرہ اس میں موجود اور ثبت ہے فرمایا گیا ہے۔

كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (یٰس) — ہم نے تمام باتوں کو ایک واضح کتاب میں جمع کر دیا ہے۔

ایک آیت میں لوح محفوظ کو "کتاب مبین" کہا گیا ہے اور اس میں بھی اس کی اسی صفت کا بیان ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (انعام)

اور اللہ کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو صرف اللہ ہی جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان چیزوں کو جو خشکی میں اور سمندر میں ہیں اور جو پتہ گرتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ گرتا ہے اللہ تعالیٰ ہی اس کو جانتا ہے اور کوئی تر اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں ہے جو کھلی ہوئی اور واضح کتاب میں نہ ہو۔

سورۂ حدید میں ارشاد ہوتا ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ

ملک میں یا خود تمہارے اندر جو مصائب نازل ہوئے ہیں ان میں کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو اس کو پیدا کرنے سے پہلے لوح محفوظ میں محفوظ نہ ہو۔ یہ بے شبہ اللہ کے لئے آسان ہے

Marfat.com

سورۂ القمر میں اس کا بیان اس طرح ہے۔

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ وَ كُلُّ صَغِيْرٍ وَكَبِيْرٍ مُسْتَطَرٌ

اور ہر وہ چیز جو انھوں نے کی لکھی ہوئی ہے ورقوں میں اور ہر چھوٹی بڑی چیز لکھی جا چکی

ان آیات کی روشنی میں قرآن مجید سے لوح محفوظ کی نسبت صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز ہے جس میں بدوِ آفرنیش سے انتہا تک کے تمام حالات وواقعات اوامر ونواہی اور رموز واسرار لکھے ہوئے ہیں اوران کے ساتھ قرآن بھی اس میں لکھا ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں اتنی بات کا اور اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن میں آلات کتابت وتحریر میں سے قلم کا بھی ذکر ہے ارشاد ہے

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ

ن، قسم ہے قلم کی اوراس کی جس سے لکھتے ہیں

لیکن اس لوح کی شکل وصورت کیسی ہے اوراس کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن نے حسب دستور عرش وکرسی کی طرح اس کی بھی کوئی حقیقت بیان نہیں کی۔ البتہ بعض کتب احادیث میں اس کے متعلق حضرت ابن عباس کا ایک اثر ملتا ہے لیکن اس سے بھی کوئی حقیقت متعین نہیں ہوتی بعض لوگوں نے کہا ہے کہ لوح محفوظ ایک جوہر مجرد ہے کسی چیز میں نہیں اور وہ صور علمیہ کے لئے بمنزلہ آئینہ کے ہے لیکن کتاب وسنت کے ظواہر الفاظ سے اس کی بیّن تائید نہیں ہوتی "بطور تمثیل یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح حافظ قرآن کے دماغ میں قرآن مجید کے کلمات ثبت ہوتے ہیں لیکن وہ اس میں منقوش ومکتوب نہیں ہوتے اسی طرح لوح محفوظ میں تمام عالم کے مقادیر ثبت ہیں لیکن عالم الواح دنیا پر قیاس کرکے ان کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس میں مقادیر منقوش ہیں۔ واللہ اعلم

قرآن کو کلام اللہ بھی کہا گیا ہے

پھر قرآن مجید کو صرف وحی کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اسے صاف لفظوں میں کلام اللہ بھی کہا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ

اور اگر کوئی مشرک آپ سے امن طلب کرے تو

Marfat.com

فَأَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ — آپ اسکو امن دیدیجئے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے

قولِ بشر کہنے پر عذاب دوزخ کی وعید

اب چونکہ حضرت جبریلؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق کر کے قرآن کے وحی اور منزل من اللہ ہونے کے ثبوت میں اللہ کی طرف سے حجّت تمام ہو چکی ہے اس لئے اب کسی منکر کا عذر لائق پذیرائی نہیں ہو سکتا اور جو شخص اب بھی قرآنِ کریم کو کلام بشر یا جادو کہتا ہے وہ بے شبہ دوزخ کے عذاب کا سزاوار ہے ایک مرتبہ ولید بن مغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے قرآن پڑھ کر سنایا وہ کسی قدر اس سے متاثر ہوا۔ مگر ابوجہل اور دوسرے سردارانِ قریش نے اس کو ورغلایا اور پوچھا قرآن کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟" کہنے لگا" ذرا سوچ لوں" آخر تیوری بدل کر اور منہ بنا کر بولا" یہ تو بابل کا جادو ہے جو نقل ہوتا چلا آتا ہے" اور" یہ تو انسان کا قول ہے" اس پر قرآن مجید میں آیت ذیل اتری جس میں عذاب دوزخ کی وعید کی گئی ہے۔

إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ نَظَرَ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ فَقَالَ إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ إِنْ هٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ	اس نے سوچا اور دل میں ایک بات ٹھہرائی وہ مارا ہی جائے اس نے دل میں کیا بات ٹھہرائی تھی پھر وہ مارا ہی جائے اس نے کیا ٹھہرایا تھا پھر اس نے دیکھا تیوری چڑھائی اور منہ بنالیا پھر پشت پھیری اور غرور کیا اور کہنے لگا یہ تو جادو ہے جو منقول ہو کر آتا ہے یہ تو قولِ بشر ہی ہے۔

یہاں تک تو ولید بن مغیرہ کا مقولہ اور اس کے احوال و کوائف کا بیان تھا اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

سَأُصْلِيهِ سَقَرَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا	اب اس کو میں دوزخ میں ڈالوں گا اور آپ کیا

Marfat.com

سَقَرُ لَا تُبْقِی وَلَا تَذَرُ لَوَّاحَۃٌ لِّلْبَشَرِ (المدثر)

سمجھے کہ کیسی ہے وہ دوزخ، وہ نہ کچھ باقی رکھتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے وہ آدمیوں کو جھلسا دینے والی

قرآن مع عربی الفاظ کے وحی الٰہی ہے

اب صرف ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن جس کو اللہ کا کلام کہا گیا ہے وہ صرف معانی و مطالب کے لحاظ سے ہے یا عربی الفاظ اور ان کی مخصوص نشست و ترکیب کے لحاظ سے بھی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ لفظ و معنیٰ کی تفریق خاص عہد نبوت میں اُن لوگوں نے بھی نہیں کی جو رسول صادق و امین کی تکذیب کے لیے ایک ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈھتے تھے وہ خود ارباب لسان تھے۔ زبان کی فصاحت و بلاغت اور اسالیب بیان کی مہارت میں یگانۂ روزگار تھے اس کے باوجود قرآنی الفاظ کے اعجاز نے انھیں اس درجہ متاثر کر دیا تھا کہ وہ پورے قرآن کو تو مع اس کے الفاظ و معانی کے "ساحرانہ" "کاہنانہ" یا شاعرانہ کلام کہتے تھے لیکن یہ کہنے کی ہمت انھیں بھی نہیں ہوئی کہ "محمد (صلعم) کے الفاظ میں ایسی کونسی الوہی خصوصیت ہے کہ وہ انھیں بھی اللہ کا نازل کیا ہوا کہتے ہیں ایسے جملے اور ایسی عبارتیں تو ہم بھی بول اور لکھ سکتے ہیں۔

لیکن خدائے علام الغیوب کو علم تھا کہ اب نہیں تو بعد میں تفلسف اور عقلیت پرستی کے دور میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو ایک طرف اپنے مسلمان ہونے کا ادعا کریں گے اور دوسری طرف اپنے تفلسف کا بھرم قائم رکھنے کے لئے قرآن کو معانی و مطالب کے لحاظ سے تو وحی خداوندی تسلیم کریں گے لیکن اس کے الفاظ کی نسبت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں متامل نہیں ہوں گے اس بنا پر قرآن مجید نے اس مسئلہ کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا اور اسکی بھی تصریح کر دی کہ قرآن مع الفاظ عربی کے اللہ کا کلام ہے اور اللہ کی طرف سے وحی کا نزول انھیں عربی الفاظ میں ہوا ہے

ارشاد ہے۔

قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ — قرآن عربی بغیر کسی کجی کے

علاوہ ازیں آیات ذیل غور سے پڑھیے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا — ہم نے قرآن عربی نازل کیا ہے

اِنَّا جَعَلْنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ — بے شبہ ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا ہے تاکہ تم سمجھو۔

وَکَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا — اور اسی طرح ہم نے اس کو قرآن عربی بنا کر اتارا ہے

وَکَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰہُ حُکْمًا عَرَبِیًّا — اور اسیطرح ہم نے اسکو عربی قرآن بنا کر اتارا ہے

دیکھئے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مطلق قرآن کے نزول کی نسبت اپنی طرف نہیں کی بلکہ اس قرآن کی نسبت اپنی طرف کی ہے جو عربی زبان میں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہونا بھی یہی چاہیے تھا کیونکہ محض معانی و مطالب کے القاء و ایجاد کے کوئی معنی ہی نہیں ظاہر ہے کہ جس طرح معانی کا زبان سے اظہار بغیر الفاظ کے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح معانی کا دل میں خطور اور انکا تعین بھی الفاظ کے بغیر ناممکن ہے۔

تنقیحات و نتائج اب ان سب آیات کو سامنے رکھ کر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح قرآن مجید کی نسبت ایک ایک بات کو کھول کر بیان کیا ہے اور جیساکہ پہلے کہا جا چکا ہے اس میں رمز یہی ہے کہ لوگوں کو قرآن مجید کے وحی الٰہی ہونے میں کوئی شک اور تردد نہ رہے یہی مسئلہ دین کی اساس اور بنیاد ہے اس لئے ضرورت تھی کہ اس پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا۔ ان تمام آیات سے حسب ذیل نتائج ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور مع الفاظ و معانی کے۔

(۲) حضرت جبریلؑ اسے لیکر نازل ہوئے ہیں۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ نازل ہوا ہے۔

(۴) جبریلؑ اور آنحضرت دونوں بے انتہا امین اور دیانت دار ہیں۔

(۵) آنحضرت نے یا کسی اور شخص نے اس کو بنایا نہیں ہے۔

(۶) شیاطین نے اس کا القا نہیں کیا۔

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسول کریم تھے۔ قرآن آپ پر جیسا نازل ہوتا تھا ویسا ہی لوگوں تک پہونچا دیتے تھے۔ آپ کو اس میں نہ نسیان ہو سکتا تھا اور نہ کوئی مغالطہ۔

(۸) آپ شاعر کاہن، یا ساحر ان میں سے کچھ نہ تھے۔

(۹) قرآن کے منزل من اللہ ہونے کے دلائل قاطع کا بیان۔

(۱۰) اس پر کفار و مشرکین کے اعتراضات و وساوس کا حتمی رد۔

(۱۱) عام انسانوں تک اللہ کے اس کلام کے پہونچنے کا ذریعہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور آپ چونکہ ہر طرح اللہ کے معتمد اور اس کے سچے رسول ہیں اس لیے جو کلام آپ کی وساطت سے پہونچا ہے اور خود آنحضرت نے بھی اسے خدا کا کلام کہا ہے ہر انسان کا فرض ہے کہ بے چون و چرا اسے قبول کرے اور اس کے کلام اللہ ہونے پر ایمان لے آئے۔

مندرجہ بالا نتائج قرآن مجید کے اشارۃ النص یا دلالۃ النص سے نہیں، بلکہ ظواہر نصوص سے واضح طور پر برآمد ہوتے ہیں اور اس بنا پر جس طرح کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول نہ مانے اسی طرح ایسے شخص کا ادعاء اسلام صحیح نہیں ہے جو مندرجۂ بالا تنقیحات پر ایمان و اعتقاد نہ رکھے۔ جمہور امت کا ہر قرن اور ہر زمانہ میں اس پر اتفاق رہا ہے اور جس کسی نے اس کا خلاف کیا اسے مرتد قرار دیکر گردن زدنی قرار دیا گیا ہے

Marfat.com

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں" سلف ان لوگوں کو جہمی کہتے تھے جو صفات کی نفی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ قرآن مخلوق ہے اور یہ کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت نہیں ہوگی، کیونکہ جہم سب سے پہلا شخص ہے جس نے نفی اسماء و صفات کی بدعت جاری کی اور اس میں انتہائی غلو اور انہماک سے کام لے کر بار بار اس کی دعوت دی جعد بن درہم نے بھی مسلمانوں کو اس فتنۂ عظیم میں مبتلا کرنا چاہا تو خالد بن عبداللہ القسری نے جو عراق کا گورنر تھا عین بقرعید کے دن جعد کو ذبح کر دیا اور ذبح کرتے وقت یہ الفاظ کہے" لوگو تم اپنی اپنی قربانیاں کرو، اللہ تمہاری قربانیاں قبول فرمائے، میں جعد بن درہم کو قربان کرتا ہوں یہ شخص اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا اور اس نے حضرت موسیٰ سے کلام بھی نہیں کیا تھا اللہ ان تمام چیزوں سے بلند و بالا ہے[۱]۔

پس جہاں تک اسلامی عقائد کا تعلق ہے ہر اس شخص کے لیے جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے ناگزیر ہے کہ وہ قرآن مجید کو معہ الفاظ و معانی کے اللہ کلام مانے اور دل سے اس کا اعتقاد جازم رکھے۔ دنیا بھر کے تمام جزئی اختلافات کے باوجود۔ یہی اعتقاد ایک ایسا رشتۂ اتحاد ہے جو دنیا کے تمام مسلمانوں کے درمیان ہر قرن اور ہر زمانہ میں قائم رہا ہے اگر کوئی مدعی اسلام آج اس اعتقاد پر قائم نہیں ہے تو جس طرح زمانۂ سلف میں ایسے گمراہ لوگوں کو مسلمانوں کی برادری سے خارج کر دیا گیا تھا۔ یہ شخص بھی ہمارے اسی سلوک کا مستحق ہونا چاہیئے"۔

---

[۱] رسالہ صفتہ الکلام مطبع منیری مصر ص ۳۲

Marfat.com

خدا کی صفاتِ ذاتیہ پر ایک عام بحث

موجودات کی تین قسمیں ہیں (۱) وہ ذوات جن کا وجود خارج میں متحقق ہو (۲) افعال جو ذوات سے صادر ہوتے اور معقولات میں پائے جاتے ہیں (۳) صفات جو ذوات کے حالات ہوتی ہیں۔ وجود کے اعتبار سے ان تینوں میں فرق یہ ہو کہ ذوات کا وجود خود ان کے ساتھ قائم ہوتا ہے یعنی اُن کا وجود اضافی نہیں بلکہ حقیقی ہوتا ہے اس کے برعکس افعال کا وجود فاعل کے وجود پر موقوف ہوتا ہے۔ ورنہ فی حد ذاتہ ان کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اب رہی صفات تو ان کی حقیقت یہ ہو کہ یہ ان حالتوں یا کیفیتوں کا نام ہو جو ذوات میں پائی جاتی ہیں اور صفات کا وجود ذوات میں ان کے ساتھ ساتھ اور ان کی وجہ سے ہی ہوتا ہو۔ افعال میں اور صفات میں فرق یہی ہو کہ صفات کا قیام ذات کے ساتھ ہوتا ہو اور افعال کا صدور اگرچہ فاعل سے ہوتا ہے لیکن ان کا قیام و بقا فاعل کی ذات کے ساتھ نہیں ہوتا۔ پہلی قسم کی مثال انسان ہو۔ دوسری قسم کی مثال حرکت اور تیسری نوع کی مثال حیا، سخاوت اور شجاعت وغیرہ ہے۔

یہ مسلم ہے کہ کوئی موجود بھی، خواہ وہ ذات ہو یا صفت ہو یا فعل ہو اس کا وجود بہر حال از خود نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مصدر و منبع ذاتِ واجب الوجود ہو پھر یہ بھی مسلم ہے کہ موجوداتِ ثلاثہ میں اولاً وجود ذوات کا ہوتا ہو پھر صفات کا اور ان کے بعد افعال وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اب اس پر اس ایک مقدمہ کا اور اضافہ کیجئے کہ صفات و حالات دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو اشیاء کے لئے بذاتہا پائے جاتے ہیں یعنی کسی شئے کا وہ شئے ہونا ہی ان صفات کے وجود کی سبب

Marfat.com

بڑی دلیل ہوتا ہے اور اس کے لئے کسی اور علت موجبہ کی احتیاج نہیں ہوتی اس کے علاوہ دوسری قسم کی صفات وہ ہیں جن کے وجود کے لئے محض کسی شے کا شے ہونا کافی نہیں ہوتا، بلکہ ان کا وجود کسی علت وسبب موجب کا محتاج ہوتا ہے پہلی قسم کی مثال یہ ہے کہ جیسے گرمی آگ کے لئے اور ٹھنڈک برف کے لئے ظاہر ہے کہ محض آگ کا آگ ہونا اور برف کا برف ہونا وجود حرارت وبرودت کے لئے کافی ہے اس کے لئے کسی علت خارجی کی ضرورت نہیں یا مثلاً یہ کہ ہر مثلث کے تین زاویے اس کے دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں یہ بالکل صاف ظاہر ہے کہ محض مثلث کا مثلث ہونا یعنی اس کی ہویت ہی اس کی اس صفت کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس کے تینوں زوایا دونوں قائموں کے برابر ہیں۔

دوسری قسم کی صفات کی مثال یہ ہے کہ جیسے آگ کے قریب ہونے کی وجہ سے پانی میں حرارت کا یا برف ڈلنے سے اس میں برودت کا پیدا ہو جانا جو صفات کسی شے کے لئے لذاتہ ہوتی ہیں ان کو طبیعت اور خاصیت کہا جاتا ہے ان صفات کے حصول فی الذات کے لئے نفس ذات کے سوا نہ کوئی سبب خارجی ہوتا ہے اور نہ کوئی اور صفت ہی اس کے لئے سبب بنتی ہے، افعال کا ذوات سے جو صدور ہوتا ہے وہ انھیں طبائع اور خواص کے مطابق ہوتا ہے جو ذات کے لئے صفات اولیہ و ذاتیہ کہلاتے ہیں۔

اس تمہید سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ کسی شے کے لئے جو صفات ذاتیہ ہوں گی وہ اس ذات کے ساتھ ساتھ پائی جائیں گی خواہ ان صفات کا اس ذات سے صدور ہوا ہو یا نہ ہو۔ مثلاً جو شخص سخی ہے جب تک وہ موجود ہے سخی کہلائے گا یا جو شخص بہادر ہے بہرحال وہ بہادر ہی خواہ اس سے اب تک شجاعت اور سخاوت کا عملاً صدور نہ ہوا ہو۔ کیونکہ سخی اور شجاع ہونے کے معنی یہ ہیں کہ سخاوت اور شجاعت کے موقع پر یہ شخص سخاوت اور شجاعت کے جوہر دکھائیگا تو ہمارا یہ کہنا خود اس بات کی

Marfat.com

دلیل ہے کہ ہم نے صدورِ فعل سے پہلے ہی اس کو وصفِ شجاعت و سخاوت کے ساتھ متصف مان لیا ہو زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک کسی شخص سے ملکۂ سخاوت و شجاعت کا عملی ظہار و صدور نہ ہوگا۔ ہم اس کو کس طرح سخی یا شجاع کہہ سکتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی شے کے متعلق ہمارا عدم علم اس شے کے عدم کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ نے کسی فصیح و بلیغ مقرر و خطیب کی تقریر دلپذیر اب تک نہیں سُنی ہو۔ تو یہ کس طرح اس بات کی دلیل بن سکتا ہو کہ وہ مقرر و خطیب سرے سے فصیح و بلیغ ہی نہیں ہو۔ اس سے یہ نتیجہ صاف طور پر نکل آتا ہو کہ خدا میں جو صفات پائی جاتی ہیں اسکے وجود کیلئے تخلیق عالم کی ضرورت نہیں ہو۔ اسمیں صفتِ خلق و رزق کا پایا جانا اسکا علیم ہونا متکلم ہونا اور اسکا صفت سمع و بصر سے متصف ہونا اس پر موقوف نہیں ہو کہ اس کے بالمقابل کوئی شے مرزوق اور مخلوق وغیرہ بھی پائی جائے بلکہ وہ اپنی تمام صفات کمالیہ سے علیٰ وجہ التمام والکمال اسوقت بھی متصف تھا جبکہ صرف وہ ہی وہ تھا اور اسکے علاوہ تمام چیزیں "لم یك شیئاً مذكوراً" کے حجاب غلیظ میں مستور تھیں۔

اب رہی یہ بات کہ خدا میں کون کون سی صفات پائی جاتی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جس ذاتِ گرامی کو خدا کہتے ہیں وہ تمام صفات کمالیہ کی مستجمع ہے اور اس کی واضح ترین دلیل یہ ہو کہ جس طرح ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے متنبی کا مشہور مصرعہ ہے۔

وبضدها تتبين الاشياء

اسی طرح کسی چیز کا ناقص ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے بالمقابل کوئی اور کامل چیز پائی جا رہی ہو پھر یہ ظاہر ہو کہ کمال اور نقص دو قسم کے ہوتے ہیں ایک حقیقی اور دوسرا اضافی۔ کمال حقیقی سے مراد یہ ہے کہ وہ سرتاپا کمال ہی کمال ہو اور اس میں ادنیٰ سا شائبہ نقص بھی نہ پایا جائے اسی طرح نقص حقیقی کے معنی یہ ہیں کہ وہ سرسبر ناقص و غیر مکمل ہو اور اس میں کمال کی ہلکی سی آمیزش بھی نہ ہو ان دونوں کے درمیان نقص و کمال اضافی کا وجود ہوتا ہے جس کے مراتب بے شمار

نکلتے ہیں۔ پس جس طرح ہمارا وجود ناقص ایک کامل اور ابدی و ازلی وجود کا پتہ دے رہا ہے اسی طرح ہماری صفاتِ کمال کا نامکمل و ناقص ہونا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ بالیقین کوئی ذاتِ گرامی ایسی موجود ہے جس میں یہ تمام صفات کمال کے مرتبۂ قصویٰ کے ساتھ پائی جائیں اور اس میں کیا شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ ذات بجز اس کے کوئی اور نہیں ہے جو سرچشمۂ وجود اور مبداءِ فیاض عالم ہے

خدا کے لئے اثبات صفات کمالیہ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ انسان میں جو صفات کمالیہ پائی جاتی ہیں وہ ظاہر ہے کہ انسان کے لئے اصلی اور ذاتی نہیں ہیں اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جو شے اصلی اور ذاتی نہیں ہوتی وہ کسی غیر کی معلول ہوتی ہے اس بنا پر لامحالہ ہماری تمام صفاتِ کمال کسی غیر کا معلول ہوں گی اور آخر کار یہ سلسلہ کسی ایسی ذات پر منتہی ہوگا جو تمام اشیاء کی علت تامہ و مطلقہ ہے اور خود وہ کسی کا معلول نہیں ورنہ پھر دور یا تسلسل لازم آئے گا اور چونکہ یہ ذاتِ گرامی صفتِ وجود میں اکمل ہے۔ اس لئے اس کی ہر ہر صفتِ کمال بھی ایسی ہی اکمل ہوگی۔

اب مذکورۂ بالا تقریر کو اوّل سے آخر تک پھر ایک مرتبہ غور و خوض سے پڑھئے تو یہ نتیجہ بالکل بدیہی طور پر نکل آتا ہے کہ

(۱) خدا کی ذات مستجمع ہے تمام صفاتِ کمالیہ کو

(۲) یہ تمام صفات اس کی ذات کے ساتھ قائم اور ازلی و ابدی ہیں۔

صفات کی حقیقت ہم خدا کی صفات کی نسبت صرف اتنا ہی جان سکتے ہیں اور جاننا چاہئے اس سے متجاوز ہو کر اگر آپ یہ پوچھیں کہ ان صفات کی حقیقت کیا ہے اور ان کا قیام ذات باری کے ساتھ کس نوعیت کا ہے؟ تو ہم اس کے جواب میں صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم صفاتِ باری کو اپنی صفات پر قیاس نہیں کرسکتے یعنی ہم جس طرح یہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے بھی وجود ہے اور خدا کے لئے بھی، لیکن بایں ہمہ ہم پورے وثوق اور یقین سے جانتے ہیں کہ خدا کا وجود ہمارے

Marfat.com

وجود کی طرح نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم کو یقین رکھنا چاہیئے کہ خدا پر اور ہم پر صفاتِ کمال کے لفظی اطلاق کے باوجود ہماری ان صفات کو خدا کی صفات پر کسی طرح قیاس نہیں کیا جا سکتا مثلاً یوں سمجھئے کہ خدا کو رحمان اور قہار کہا جا سکتا ہے اور وہ بے شبہ ان صفات کے ساتھ بدرجۂ اتم موصوف ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اس کا رحم اور قہر ہمارے رحم اور قہر کے مانند نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ رحم اور قہر کے مفہوم میں تاثر و انفعال داخل ہیں یعنی ہم کسی پر رحم کرتے ہیں تو یہ نتیجہ ہوتا ہے ہمارے نفس کی رقت کا جو کسی قابل رحم چیز کو دیکھ کر ہمارے او پر طاری ہو جاتی ہے اسی طرح قہر ہمارے نفس کے ہیجان و ثوران کا ثمرہ ہوتا ہے جو کسی ناگوار طبع چیز کے دیکھنے سے ہمارے احساس و شعور پر مستولی ہو کر قوت غضبی کو برانگیختہ کر دیتا ہے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ رحم اور قہر دونوں کی تعریف میں مبدا اور غایت کے لحاظ سے دو چیزیں شامل ہیں مبدا کے مرتبہ میں انفعال و تاثر ہے اور غایت کے درجہ میں فعل و تاثیر اور چونکہ خدا کی ذات انفعال و تاثر سے منزہ ہے اس لئے اس کا رحمٰن و قہار ہونا صرف غایت کے لحاظ سے ہے مبداء کے اعتبار سے نہیں یہ ایک ایسی واضح بات ہے کہ کسی سلیم الطبع انسان کو نہ اس سے انکار ہو سکتا ہے اور نہ کوئی شک و شبہ اسی پر خدا کی دوسری صفات مثلاً علم، ارادہ مشیت قدرت اور کلام کو قیاس کر لیجئے۔ ان کمالات کا اطلاق جن معانی سے ممکنات پر ہوتا ہے خدا پر نہیں ہو سکتا۔

اب اس امر کو تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم خدا کی صفات کی نسبت صرف اتنا ہی جان سکتے ہیں کہ خدا میں یہ صفات پائی جاتی ہیں۔

دور بینانِ بارگاہ الست   غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

باقی رہا یہ سوال کہ کیونکر اور کس طرح؟ تو ہم اس کی نسبت کچھ نہیں بتا سکتے کیونکہ کوئی چیز

Marfat.com

ایسی موجود نہیں ہے جس پر ہم خدا کی ذات وصفات کو قیاس کر سکیں اس کے لئے نہ کوئی ند (مثل) ہے اور نہ ضد۔ اس نے خود فرمایا ہے "لیس کمثلہ شیئ" اکبر الہ آبادی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا — بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے،

پھر ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ خدا کی ذات وصفات کا کیا ذکر، خود ہمارے اندر کتنی باطنی قوتیں اور ملکات ہیں جن کو ہم ان کے آثار سے پہچانتے ہی نہیں بلکہ ان کے وجود کا یقین رکھتے ہیں، اور اس کے باوجود ہم ان کی حقیقت و ماہیت سے بے خبر ہیں خود علم کو لیجئے بچہ بچہ اور جاہل سے جاہل انسان بھی علم کی فضیلت اور برتری کا معترف ہے لیکن علم انسانی کی حقیقت کیا ہے وہ صورت حاصلہ فی العقل ہے یا حصول صورت کا نام علم ہے یا خود قوت مدرکہ کو علم کہتے ہیں یا عالم اور معلوم کے درمیان جو نسبت رابطہ ہے وہ علم ہے علم کے سلسلہ میں یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جن کا قطعی اور حتمی جواب آج تک نہیں دیا جا سکا، نفس ناطقہ انسانی کو سب یہ کہتے ہیں کہ وہ مبداء ادراک ہے کلیات وجزئیات کے لئے عقل کو دنیا جانتی ہے کہ وہ انسان کے لئے سب سے بڑا طغراء شرف و امتیاز ہے روح کے متعلق کس کو خبر نہیں کہ زندگی کا دارومدار اس کے اتصال با لجسم پر موقوف ہے لیکن جب سوال کیا جاتا ہے کہ نفس ناطقہ کیا ہے عقل کی حقیقت و ماہیت کیا ہے روح کی حد تام کیا ہے تو ان سوالات کے جواب میں فلاسفہ کے نظریات اس درجہ مختلف نظر آتے ہیں کہ ان کی روشنی میں کسی ایک قطعی نتیجہ تک پہونچنا دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے پس جب ان چیزوں کی نسبت ہمارا علم اس قدر محدود ہے تو پھر ظاہر ہے کہ خدا کی ذات وصفات کے بارہ میں ہماری رسائی کہاں تک ہو سکتی ہے کسی نے سچ کہا ہے۔

تو بر اوج فلک چہ دانی چیست — چوں ندانی کہ در سرائے تو کیست

صفت ذات اور صفت فعل آپ پڑھ آئے ہیں کہ صفات دو قسم کی ہوتی ہیں ایک صفات ذاتیہ

Marfat.com

جو ذات کے ساتھ قائم ہوتی ہیں اور دوسری وہ جو ذات کے ساتھ قائم نہیں ہوتیں خدا کی صفات بھی دو قسم کی ہیں علامہ ابن تیمیہ ان کو صفتہ ذات اور صفتِ فعل سے تعبیر کرتے ہیں خدا کی صفاتِ ذاتیہ کا تعلق اس کی ذات کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے پھول کے ساتھ رنگ و بو آفتاب کے ساتھ حرارت اور روشنی پانی کے ساتھ برودت اور آگ کے ساتھ گرمی کا تعلق و قیام ہے رہی صفتِ فعل تو یہ وہ صفت ہے جو کسی معلول یا مفعول کے ساتھ تعلق کی وجہ سے خدا کے لئے حاصل ہوتی ہے مثلاً آگ کی ایک تو صفتِ حرارت ہے جو اس کے لئے ذاتی ہے۔ جب آگ کا وجود ہوگا حرارت ضرور پائی جائے گی اور ایک صفت ہے جلانا تو ظاہر ہے کہ یہ صفت اس رابطہ پر دلالت کرتی ہے جو آگ کے اور کسی اور چیز کے درمیان پایا جاتا ہے اس پر ہی خدا کی صفتِ فعل کو قیاس کر لیجئے یعنی یہ صفت کسی خاص فعل کے اعتبار سے اس تعلق کو ظاہر کرتی ہے جو خدا اور اس کے بندہ کے درمیان ہوتا ہے اس صفت کی نسبت دو باتیں بالکل واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ صفت ذات کی طرح اس صفت کا موصوف بھی ذات ہی ہوگی کیونکہ جس طرح صفتِ ذات کا قیام و تعلق ذات کے ساتھ ہے اسی طرح اس صفت کا مبدا صدور بھی ذات ہی ہے دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ صفتِ فعل، صفت ذات کا ہی پر تو ہوتی ہے، لیکن چونکہ یہ صفت اس تعلق کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جو کسی دوسری شے کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے اس صفت کو ذاتِ موصوف کے ساتھ وہ تعلق نہیں ہوتا جو صفتِ ذات کو ہوتا ہے اس بنا پر اس صفت کا ظہور جو مختلف اشکال و صور میں ہوتا ہے اس کا اثر ذات پر کچھ نہیں ہوتا یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صفت کی وجہ سے ذاتِ موصوف میں کوئی تغیر پیدا ہو گیا ہے۔

تعدد صفات اور وحدانیتِ ذات اس تقریر سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ خدا کے لئے متعدد صفات کا پایا جانا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ خود اس کی ذات میں بھی تعدد یا ترکب پایا جائے۔ کیونکہ

ہم مخلوقات میں دیکھتے ہیں کہ کثافت کے باوجود متعدد اشیاء کے اعتبار سے ایک شے کیلئے ہزاروں صفات والقاب ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کسی کا باپ کسی کا بھائی، کسی کا خاوند کسی کا چچا اور کسی کا بھتیجہ کہلاتا ہے۔ ان تمام مختلف القاب کے باوجود یہ شخص واحد ہی رہتا ہے اور اس کے ایک ہونے میں فرق نہیں پڑتا پس جب کثیف چیزوں کا یہ حال ہے تو ظاہر ہے خدا کی صفات کے تعدد سے اس کی ذات میں کس طرح تعدد پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ تو تمام موجودات سے زیادہ لطیف بلکہ سرچشمۂ لطافت ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہ نسبت کثیف کے لطیف میں تعدد و تکثر بہت کم ہوتا ہے اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ وہی ایک ذاتِ خداوندی ہے جو کسی جہت سے خالق کسی وجہ سے رازق اور کسی لحاظ سے متکلم اور کسی اعتبار سے رحمٰن اور قہار و جبار ہے۔

اسی حقیقت کو ایک اور واضح تر مثال سے سمجھیے آفتاب کو طلوع کے وقت دیکھئے کتنا بڑا اور انگاروں کی طرح سرخ اور بے شعاع نظر آتا ہے پھر بلند ہو کر سفید دکھائی دیتا ہے اور مقدار میں چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب غروب ہونے لگتا ہے تو زرد بن جاتا ہے، ان سب صورتوں میں یونہی کہتے ہیں کہ آفتاب کو دیکھا اب غور کیجیے کیا یہ تمام تغیرات ذاتِ آفتاب میں ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہ زردی سرخی مقدار کا بڑا ہونا اور چھوٹا ہونا یہ سب ہماری نظر کے تاثرات وانفعالات ہیں جو آفتاب کے ایک خاص جہت میں نظر آنے اور اس کی شعاعوں کے زمین پر عمودی شکل میں یا ترچھے پڑنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ورنہ آفتاب ان تمام حالات میں یکساں رہتا ہے اور اس کی مقدار میں نہ زیادتی ہوتی ہے اور نہ کمی پس جس طرح آفتاب ایک متعین رنگ رکھنے کے باوصف، مختلف الوان وصورتیں جلوہ نما ہوتا ہے اور طرح طرح سے تجلی کرتا ہے۔ ایسے ہی حضرت باری عزاسمہٗ ذاتِ واحد ہے اس میں کسی قسم کا تعدد نہیں، لیکن باایں ہمہ تجلیاتِ متعددہ رکھتا ہے اور ان تجلیات سے کام صفات

کا نکلتا ہے۔

صفات کا ظہور حوادث میں | اس تقریر سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ خدا کی صفات کا ظہور حوادث کی شکل و صورت میں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم ان حوادث پر قیاس کر کے صفات کو حادث نہیں کہہ سکتے وہ بدستور قائم ہی رہیں گی اور اگرچہ تجلی کی صورت میں صفات کے لئے بظاہر تغیر و تبدل پایا جائے گا لیکن یہ محض نظر کا دھوکا ہوگا ورنہ دراصل وہ غیر متغیر و غیر متبدل ہیں مثال کے لئے ایک ایسی لالٹین کا تصور کیجئے جو ہشت پہلو ہو اس کے چاروں طرف آٹھ مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہوئے ہیں اور ان سب کے اندر ایک چراغ رکھا ہوا ہے اب دیکھئے چراغ کے لئے ایک روشنی تو وہ ہے جو چراغ کی ذات کے ساتھ قائم ہے یہ روشنی مطلق ہے کسی رنگ یا کسی مقدار کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک روشنی وہ ہے جو رنگین شیشوں کے عکس سے چھن چھن کر مختلف رنگوں کے ساتھ نظر آرہی ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں روشنیاں چراغ کی ہیں کیونکہ سبز یا سرخ روشنی کو کوئی نہیں کہتا کہ یہ سبز یا سرخ شیشہ کی روشنی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ پہلی قسم کی روشنی (مطلق روشنی) ذاتِ چراغ کے ساتھ قائم ہے۔ کوئی شیشہ نہیں ہوگا۔ تب بھی یہ روشنی پائی جائے گی لیکن دوسری روشنی کے ظہور و قیام کا تعلق شیشہ کے ساتھ ہے۔ چنانچہ اگر آپ ان آٹھوں شیشیوں میں سے کوئی شیشہ لالٹین سے نکال لیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس شیشہ کے رنگ کی روشنی بھی یک بیک غائب ہو جاتی ہے اس مثال میں تین باتیں خاص طور پر لائق توجہ ہیں۔

(۱) جتنے مختلف رنگوں کی روشنیاں نظر آرہی ہیں وہ سب شمع کی ہیں۔

(۲) شمع کی روشنی بذاتِ خود ان رنگوں میں سے کسی خاص رنگ کے ساتھ مقید نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ شمع کی روشنی کا مختلف رنگوں میں نظر آنا شیشوں کی وجہ سے ہی ہے۔

(۳) رنگ اور روشنی دونوں الگ دو چیزیں ہیں لیکن دونوں میں تعلق یہ ہے کہ روشنی ظاہر

Marfat.com

ہے اور رنگ منظہر یا دوسرے لفظوں میں یہ کہئے کہ روشنی متجلی ہے اور رنگ متجلی فیہ اور اس تعلق کے باعث دونوں میں ارتباط اس درجہ شدید ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اس میں خاص طور پر لحاظ کے قابل چیز یہ ہے کہ روشنی کا سرخ یا سبز ہونا شیشہ پر روشنی کا پرتو پڑنے کی وجہ سے ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ روشنی کے لئے بذاتہ کوئی رنگ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود سرخی یا سبزی کی صفت ثابت ہوتی ہے روشنی کے لئے ہی نہ کہ شیشہ کیلئے کیونکہ یہاں روشنی اور رنگ میں ذاتاً الگ الگ ہونے کے باوجود اس قدر زبردست اختلاط و ارتباط ہے کہ گویا دونوں ایک ہی ہیں اور ان میں سے ایک کا قیام دوسرے کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ صفت ذاتی کا قیام و تعلق موصوف کے ساتھ جن سطور پر خط کھینچا ہوا ہے ان کو بار بار پڑھیے اور غور کیجئے تو آپ کو صفاتِ خداوندی کی تجلی اور حوادث کی شکل میں ان کے ظہور پر بڑی بصیرت حاصل ہوگی اور بڑے بڑے خدشات و وساوس کا حل معلوم ہو جائے گا۔

مزید توضیح کی غرض سے ایک اور مثال نقل کرتا ہوں جس سے اصل مسئلہ پر زیادہ روشنی پڑتی ہے آپ روزانہ دیکھتے ہیں کہ کسی ریڈیو اسٹیشن سے ایک تقریر نشر کی جاتی ہے اور آپ اسے اپنے ریڈیو سٹ میں سنتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ریڈیو سٹ میں ایک پیچ لگا ہوا ہوتا ہے جس کو انگریزی میں وولیوم کنٹرول (Volue me Gontroll) کہتے ہیں اور جس سے آواز کو کم یا زیادہ کرنے کا کام لیا جاتا ہے اب اس پر غور کیجئے کہ جہاں تک آواز کا تعلق ہے وہ بالکل یکساں ہی یعنی مقرر ایک ہی آواز سے اول سے آخر تک اپنی تقریر کو پڑھتا چلا جاتا ہے اس میں نہ تیزی پیدا ہوتی ہے اور نہ ہلکا پن لیکن ادھر حال یہ ہے کہ آپ اس پیچ کو دو ایک چکر دیتے ہیں تو آواز ہلکی اور مدھم نکلتی ہے اور اگر اس کو زیادہ گھماتے ہیں تو آواز بلند ہو جاتی ہے اب یہ ظاہر ہے کہ آواز کا ہلکا ہونا یا تیز ہونا آواز کی ذاتیات میں داخل نہیں ہے اور آپ کے پیچ گھمانے سے مقرر کی اصل

Marfat.com

آوازمیں کوئی تغیر بھی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ہلکا پن یا تیزی صفت کس کی ہے؟ آواز کی ہی یا کسی اور چیز کی؟ ظاہر ہے کہ آواز ہی کی صفت ہے اور دلیل یہ ہے کہ آپ آواز کے گھٹنے بڑھنے پر بے تکلف بول اٹھتے ہیں کہ آواز کم ہوگئی یا زیادہ ہوگئی۔

چونکہ صفاتِ ایزدی کی تجلی کا مسئلہ نہایت دقیق ہے اور اس کی تشریح و توضیح فلسفیانہ اصطلاحات کی روشنی میں بہت ہی مشکل ہے۔ چنانچہ عرفی نے کہا ہے۔

نورِ حیرت در شبِ اندیشۂ اوصاف تو — بس ہمایوں مرغِ عقل از آشیاں انداختہ

اور ہونا بھی یہی چاہیئے بھلا ایک قطرۂ بے مقدر کس طرح بحرِ ناپیدا کنار کو اپنی آغوش میں لے سکتا ہے اس بنا پر اس حقیقت کے افہام و تفہیم کے لئے بہترین طریقہ مثالوں کا ہی ہوسکتا ہے ہم ذیل میں ایک اور مثال کے ذریعہ اس کی تشریح کرتے ہیں آفتاب کی روشنی کو دیکھئے اس کے لئے کوئی خاص مقدار یا شکل نہیں پائی جاتی لیکن اس کا گذر ایسے روشن دان سے ہو جو مثلث یا مربع شکل کا ہے تو خود آفتاب کی روشنی بھی اسی شکل سے متشکل ہوجاتی ہے اب غور کیجئے روشنی اور یہ شکل دو مختلف چیزیں ہیں لیکن صورت یہ ہے کہ روشنی کا گذر روشن دان میں سے ہو رہا ہے اور روشن دان ایک خاص شکل رکھتا ہے۔ روشن دان میں سے گذرنے کی وجہ سے یا بالفاظ صحیح تر روشن دان کو اپنا جلوہ گاہ بنانے کے باعث روشن دان کی شکل خاص خود روشنی کے لئے حاصل ہوگئی اور آپ اس شکل کا حمل و اتصاف روشنی کے لئے ایسا ہی کرتے ہیں کہ گویا وہ روشنی کے لئے کوئی صفتِ ذاتی ہے

صفات لاعین ولا غیر ہیں مذکورہ بالا مثالوں پر غور کرنے سے علم کلام کے ایک مشہور و معروف مسئلہ کا بھی حل نکل آتا ہے یعنی یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ صفات باری تعالیٰ کو ذاتِ باری سے ایسی نسبت ہے کہ نہ ان کو عین ذات کہہ سکتے ہیں اور نہ غیر ذات کیونکہ سرخی یا سبزی روشنی سے مثلث یا مربع شکل آفتاب کی دھوپ سے کمی یا زیادتی آواز سے غیر بھی ہیں اور عین بھی۔ غیر اس اعتبار سے کہ یہ چیزیں

موصوف کی ذات کا عین نہیں ہیں۔ شمع کی روشنی پائی جاتی ہے اور سرخی یا سبزی کا وجود نہیں ہوتا۔ دھوپ کا وجود پایا جاتا ہے اور شکل مثلث یا مربع کا کہیں پتہ نہیں ہوتا اور عین اس بنا پر ہیں کہ شمع کی روشنی جب تک رنگین شیشوں کے درمیان محصور ہے اور آفتاب کی دھوپ جب تک مثلث یا مربع شکل کے روشن دان میں سے گذرتی رہے گی بہرحال شمع کی روشنی کے لئے رنگین اور دھوپ کے لئے مثلث یا مربع ہونا ضروری ہے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کا انفکاک دوسرے سے نہیں ہو سکتا۔

حوادث کا قیام ذاتِ باری سے

اس تقریر سے ایک اہم مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ متکلمین عام طور سے کہتے ہیں کہ حوادث کا قیام ذاتِ باری کے ساتھ نہیں ہو سکتا یہ کہنے کی بنا پر خدا کی صفات فاعلی کے متعلق طرح طرح کے اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک کلام کے مسئلہ کو ہی لے لیجئے اگر یہ مطلقاً درست مان لیا جائے کہ ذاتِ باری کے ساتھ حوادث کا تعلق اور قیام ناجائز ہے تو اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر قرآنِ مجید کے الفاظ و حروف اور ان کی ترکیب و ترتیب جو یقیناً حادث ہیں ان کو خداوند تعالیٰ کی طرف کس طرح منسوب کر سکتے ہیں حالانکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن مع اپنے الفاظ کے خدا کا کلام ہے۔ جیسا کہ وانزلناہ قرآناً عربیاً اور اسی طرح کی متعدد تصریحات سے خود قرآن مجید سے ثابت ہے اس اعتراض سے بچنے کے لئے ہی متکلمین نے کلام نفسی اور کلام لفظی کا فرق کیا ہے اور انھوں نے کہا ہے کہ "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" جو کہا جاتا ہے تو وہ کلام نفسی کے اعتبار سے کہا جاتا ہے نہ کہ کلامِ لفظی کے لحاظ سے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی تفریق خود قرآن مجید کی نصوص کے خلاف ہے اور اس تفریق سے معتزلہ اور اشاعرہ کا اختلاف بھی محض ایک لفظی اختلاف ہو کر رہ جاتا ہے۔[۱]

---

[۱] بزرگوں سے سنا ہے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر واقعی قرآن مجید (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

Marfat.com

غالباً اس عقدہ کی گرہ کشائی سب سے پہلے حافظ ابن تیمیہ نے کی ہے انھوں نے متعدد مواقع پر لکھا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ حوادث کا قیام ہو سکتا ہے اس مدعا کو ثابت کرنے کے لئے امام عالی مقام کے نزدیک ترتیب مقدمات یہ ہے۔

(۱) قرآن مجید سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا۔

(۲) یہ کلام اور مخاطبت ازل میں نہیں تھی بلکہ حادث تھی۔

(۳) کلام کے لئے ضروری ہے کہ متکلم کے ساتھ قائم ہو۔

ان مقدمات کی ترتیب سے یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ ذاتِ باری کے ساتھ حوادث کا قیام ہو سکتا ہے حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں" ہمارا یہ قول ایک ایسا قول ہے جس کی صحت پر شرع اور عقل دونوں دلالت کرتے ہیں اور جو شخص یہ نہیں کہتا کہ خدا کلام کرتا ہے ارادہ کرتا ہے محبوب اور مبغوض رکھتا ہے راضی ہوتا ہے لاتا ہے اور آتا ہے تو وہ اللہ کی کتاب سے مناقضہ کرتا ہے اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو ندا ازل میں دی تھی اور وہ برابر ندا دیتا رہا تو وہ عقل کی بات سے سرکشی کرنے کے ساتھ ساتھ کلام اللہ کی بھی مخالفت کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَهَا نُوْدِيَ	پس جب موسیٰ وہاں آئے تو انکو ندا دی گئی

(دیکھئے اس میں ندا حضرت موسیٰ کی آمد سے موقت ہے) اور ارشاد ہے۔

اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ	اللہ کا حکم یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں کلام نفسی اور کلام لفظی کی تفریق ہوتی تو پھر امام احمد بن حنبلؒ کو کیا ضرورت تھی کہ وہ کوڑے کھاتے اور مصیبتیں اٹھاتے وہ کہہ سکتے تھے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ کلام نفسی کے اعتبار سے ہے ورنہ کلام لفظی تو حادث ہے ہی جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں۔

Marfat.com

اس آیت میں "اذا" حرف شرط ہے جو استقبال پر دلالت کرتا ہے۔ ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ امور متجددہ بھی اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔

ایک تنبیہ لیکن اس تقریر سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ حافظ ابن تیمیہ قرآن مجید کے حروف کو مخلوق مانتے ہیں بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیزیں جن کو ہم حوادث سمجھتے ہیں وہ اگرچہ ہمارے اعتبار سے حوادث ہی ہیں لیکن جب ان کے ساتھ خدا کی کسی صفت کا تعلق ہو تو پھر ہمیں یقین کرنا چاہیئے کہ وہ حوادث محض ہمارے اعتبار سے حوادث ہیں جن میں خدا کی کوئی صفت تجلی کر رہی ہے ورنہ درحقیقت وہ حوادث نہیں ہیں اب ذرا شمع کی مذکورہ بالا مثال کو سامنے رکھ کر غور کرو اور دیکھو کہ جب شمع کی روشنی کا عکس کسی رنگین شیشہ پر پڑتا ہی تو شیشہ کی رنگینی کی وجہ سے خود شمع کی روشنی بھی رنگین ہو جاتی ہے تو اگرچہ روشنی کا یہ رنگ شیشہ کے انعکاس کی وجہ سے ہی ہے لیکن ہے دراصل شمع کی ہی روشنی اس لئے جو شمع کا حکم ہوگا وہی اس روشنی کا بھی ہوگا بس اسی طرح کلام کی بحث کو سامنے رکھ کر سمجھیے کہ قرآن کے وہ عربی الفاظ و حروف جن سے انسانی کلام مرکب ہوتا ہے بے شک و شبہ حادث ہیں لیکن جب یہی الفاظ و حروف خدا کی صفت کا مظہر اور تجلی گاہ بن جاتے ہیں تو اب ہم ان کو اپنے کلام کے الفاظ و حروف پر قیاس کر کے مخلوق نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ نے اسی مضمون میں ایک جگہ پر اس کی تصریح کر دی ہے فرماتے ہیں۔

"لیکن سلف کا قول یہ ہے کہ اللہ ہمیشہ سے متکلم ہے اور وہ جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے اور کلام ایک صفت کمال ہے۔ کیونکہ جو شخص کلام کرتا ہے وہ نسبتاً اس سے اکمل ہوتا ہے جو کلام نہیں کرتا اور یہ ظاہر ہے کہ کمال ان صفات کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے جو موصوف کے ساتھ قائم ہوں، امور مبائنہ عن الموصوف سے کمال کا تحقق نہیں ہوتا۔۔۔۔۔

---

[۱] کتاب مذہب السلف القویم فی تحقیق مسئلۃ الکلام اللہ الکریم مطبوعہ المنار مصر ص ۱۱۸ و ۱۱۹

Marfat.com

پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے صفاتِ کمال کے ساتھ موصوف رہا ہے اور چونکہ اہم صفاتِ کمال میں سے کلام ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کو ماننا پڑے گا کہ وہ متکلم ازلاً وابداً ہے اور جب چاہتا ہے عربی میں کلام کرتا ہے جیسا کہ اس نے قرآن عربی کے ذریعہ کلام کیا پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ جن الفاظ و حروف کے ساتھ کلام کرے گا وہ اس کے ساتھ قائم ہوں گے نہ یہ کہ مخلوق و منفصل ہوں اس بنا پر وہ حروف جو اللہ کے اسماء حسنیٰ کے اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کے مبانی ہونگے وہ مخلوق نہیں ہو سکتے، کیونکہ اللہ نے ان سے تکلّم کیا ہے[1]"

کون نہیں جانتا کہ پانی اسی وقت پانی ہے جب تک کہ وہ دودھ کے ساتھ نہ ملا ہو لیکن دودھ میں مل جانے کے بعد کوئی اسے پانی نہیں کہتا بلکہ دودھ کہتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ ایک اور موقع پر لکھتے ہیں۔

"اگر مستلزم اللحوادث ممکن بنفسہ ہو یعنی وہ مفعول، معلول اور مربوب کہلائے تو ضروری ہے کہ وہ حادث ہو۔ لیکن اگر وہ واجب بنفسہ ہو تو ضروری نہیں کہ (استلزام للحوادث کی وجہ سے) وہ خود ممکن ہو جائے۔ یہی قول ائمہ اہل الملل و اساطین الفلاسفہ کا ہے اور یہی قول جمہور اہلِ حدیث کا ہے[2]"

عقیدۃ الطحاوی کے فاضل شارح[3] نے بھی اس مسئلہ پر کافی بحث کی ہے اور قریب قریب

---

[1] کتاب مذہب السلف القویم ص ۴۴، ۴۵ [2] رسالہ صفۃ الکلام ص ۵۳

[3] شرح عقیدہ طحاوی کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے مطبع سلفیہ مصر کا مطبوعہ ہے اس شرح کے فاضل مصنف نے اپنا نام نہیں بتایا لیکن غالب قیاس یہ ہے کہ اس کے مصنف صدر الدین علی بن محمد بن العز الاذرعی الدمشقی الحنفی المتوفی ۷۴۶ھ ہیں جو علامہ ابن کثیر کے شاگرد ہیں اور صاحبِ کشف الظنون کے بیان کے مطابق افاضل علماء احناف سے ہیں

وہی لکھا ہے جو حافظ ابن تیمیہ فرما چکے ہیں۔ ذیل میں ہم اس کا اقتباس درج کرتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ صفاتِ کمال، صفاتِ ذات اور صفاتِ فعل دونوں کے ساتھ ہمیشہ سے متصف ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا، کیونکہ خدا کی تمام صفات، صفاتِ کمال ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا نہ ہونا صفتِ نقص ہے اور یہ بھی جائز نہیں ہے کہ اس کے لئے کوئی صفتِ کمال حاصل ہو، درآں حالیکہ وہ پہلے اس کی ضد کے ساتھ متصف رہ چکا ہو۔

اس پر صفاتِ فعل اور صفاتِ اختیاریہ مثلاً خلق زندہ کرنا۔ مارنا قبض اور بسط غضب اور رضا کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اگرچہ ہم کو اس کی کنہ اور حقیقت معلوم نہیں ہے لیکن اصل معلوم ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ امام مالک سے ثم استوی علی العرش کی تفسیر پوچھی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ استواء معلوم ہے لیکن کیف مجہول ہے ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ احوال ایک وقت میں نہیں ہوتے اور کسی دوسرے وقت میں حادث ہو جاتے ہیں لیکن احوال وافعال کا یہ حدوث ذاتِ خداوندی کے اعتبار سے ممتنع نہیں ہے اور اس پر اس بات کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عدم کے بعد حادث ہو گئے ہیں تم جانتے ہو کہ جو شخص کلام کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور وہ آج تمہارے سامنے کلام کرے تو تم یہ نہیں کہتے کہ حدث لہ الکلام کلام اس کے لئے حادث ہو گیا ہے البتہ ہاں اگر کوئی شخص گونگا ہو، کلام کی بالکل قدرت نہ رکھتا ہو اور وہ کسی دن کلام کرنے لگے تو اسکی نسبت یہ کہا جائے گا کہ حدث لہ الکلام، جو شخص بغیر کسی آفتِ سماوی کے خاموش ہو وہ خموشی کے وقت بھی متکلم بالقوہ ہے اور اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ جب چاہے کلام کر سکتا ہے پھر جب کلام کرتا ہے تو متکلم بالفعل ہو جاتا ہے۔ پس جس طرح متکلم بالقوہ بالفعل

کلام نہ کرنے سے یا کوئی کاتب بالقوۃ بالفعل کتابت نہ کرنے سے کسی صفت تکلم اور کتابت کی ضد سے متصف نہیں ہوتا۔ اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ افعالِ اختیاریہ کا اصطلاحی حدوث باری تعالیٰ کے لئے موجب نقص نہیں ہے۔

اس کے بعد عقیدۂ طحاوی کے فاضل شارح لکھتے ہیں:۔

اور علم کلام میں یہ جو کہا جاتا ہے کہ خدا میں حوادث کا حلول نہیں ہو سکتا تو یہ ایک قول مجمل ہے اس کا ذکر نہ کہیں قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر نفی سے مراد یہ ہے کہ خدا کی مقدس ذات میں اس کی محدث مخلوقات میں سے کسی محدث کا نزول اور اس کے لیے کسی وصف متجدد کا حدوث نہیں ہو سکتا تو بے شبہ اس اعتبار سے یہ کہنا۔۔۔۔ کہ خدا میں حلولِ حوادث ممتنع ہے صحیح ہی لیکن اگر اس قول سے مراد یہ ہے کہ خدا سے صفاتِ اختیاریہ کی نفی کر دی جائے اور یہ کہا جائے کہ خدا اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق فعل نہیں کر سکتا اور نہ وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے کلام کر سکتا ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ اس اعتبار سے یہ کہنا کہ خدا میں حلولِ حوادث نہیں ہو سکتا بالکل غلط اور باطل ہے۔

بڑی مشکل یہ ہے کہ اہل کلام نفی حلولِ حوادث کے الفاظ بہت ہی مبہم طریقہ پر بولتے ہیں راسخ العقیدہ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کہہ کر خداوند تعالیٰ سے ان چیزوں کی نفی کی جا رہی ہے جو اس کی ذات مستجمع الصفات کے شایاں نہیں ہیں۔ جب راسخ العقیدہ مسلمان اس کو تسلیم کر لیتا ہے تو پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ نفی حلول حوادث سے مراد تو یہ تھی کہ خدا سے صفاتِ اختیاریہ اور صفاتِ فعل دونوں کی نفی کر دی جائے۔"

(شرح عقیدۃ الطحاوی ص ۵۷، ۵۶)

کلام الٰہی | یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے، خدا کی عام صفات کے متعلق تھا ضمناً کلام الٰہی کا بھی تذکرہ آ گیا ہے اب اس پوری تقریر کو سامنے رکھ کر غور کیجیے، تو چند نتائج بیّن طور پر پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) خدا تمام صفاتِ کمال کے ساتھ متصف ہے جن میں سے ایک صفتِ کلام بھی ہے۔

(۲) خدا کی صفات دو قسم کی ہیں ایک صفاتِ ذات اور دوسری صفات فعلی یا فاعلی۔

(۳) صفات فعلی کا ظہور حوادث کی شکل میں ہوتا ہے یعنی حوادث ان کا مظہر بنتے ہیں

(۴) لیکن ان حوادث کو ہم اپنے حوادث پر قیاس نہیں کر سکتے بلکہ صفات فعلی کے ساتھ گہرے ربط کی وجہ سے ان کا حال بھی وہی ہوتا ہے جو صفاتِ فعلی کا ہوتا ہے۔

اب ان صفات پر کلام کی صفتِ ربانی کو بھی قیاس کیجیے تو اس بات کے ثابت ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کہ خدا کی صفتِ کلام بھی دو طرح کی ہے ایک صفت ذات جو ذات خداوندی کے ساتھ قائم ہے۔ اور جس کے اعتبار سے وہ اس وقت بھی متکلم تھا جب کہ اس کے سوا کسی اور چیز کا کہیں وجود نہیں تھا دوسری صفت۔ صفت فعل ہے یہ وہ صفت ہے جس کی وجہ سے خدا کا کلام مختلف زبانوں میں مختلف انبیاء پر نازل ہوتا رہا اور آخر میں عربی زبان میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

قرآن مع الفاظ کے کلام الٰہی ہے | فرقِ باطلہ کو چھوڑ کر بعض علماءِ حق تک نے کہا ہے کہ خدا کی صفت کلام معنیً واحد ہے اور اس میں تعدّد تکثر، تجزی اور تبعض، مدلول (یعنی معنی و مفہوم) کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ دلالت کے اعتبار سے ہے اور یہ عبارتیں مخلوق ہیں لیکن ان کو جو کلام اللہ کہا جاتا ہے وہ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ یہ عبارتیں مدلول پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر اس مفہوم کو عربی زبان میں ادا کیا جائے تو وہ قرآن ہے اور اگر عبرانی زبان میں ادا کیا جائے تو وہ توراۃ ہے پس عبارتیں مختلف ہیں لیکن کلام مختلف نہیں ہے ابن کلاب اور ابوالحسن اشعری وغیرہ کا یہی قول ہے۔ لیکن

Marfat.com

ائمۂ سلف صالحین کا فیصلہ اس کے خلاف ہے وہ قرآن مجید کو مع الفاظ و معانی کے غیر مخلوق مانتے ہیں اور اوپر جو تقریر گذر چکی ہے اس کی روشنی میں اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ سلفِ صالحین کے فیصلہ کو صحیح تسلیم کرنے میں کوئی عقلی استحالہ یا استبعاد بالکل نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کلام خدا کی صفتِ ازلی و ابدی ہے اور اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے لیکن یہ بھی بے شبہ درست ہے کہ اس صفت کا ظہور۔ بروز مختلف شکلوں اور صورتوں میں ہوتا رہا ہے اور یہ اشکال وصور کا اختلاف اصل صفت کلام میں نہیں ہوتا بلکہ ان انبیاء کی وجہ سے ہوتا ہے جو مختلف زبانیں رکھتے تھے اور جن پر کلامِ الٰہی کا نزول ہوتا تھا پس اگرچہ یہ اختلافِ اشکال وصور اصل کلام میں نہیں ہے تاہم مخاطبین کے مختلف احوال ومزایا کے باعث اصل صفت جن مختلف مظاہر میں نظر آرہی ہے وہ سب مظاہر بھی خدا کی ہی طرف منسوب ہوں گے۔ اور شدتِ ارتباط کے باعث ان کا حکم بھی وہی ہوگا جو تجلی کا ہے ایک مرتبہ پھر اسی شمع والی مثال کو سامنے رکھکر غور کرو کہ چراغ کی اصل روشنی کی طرح خدا کی صفت کلام بھی مقید اور مطلق ہے لیکن جسطرح اس روشنی کا عکس کسی رنگین شیشہ پر پڑتا ہے تو خود چراغ کی روشنی کا بھی اسی رنگ میں نظر آنا شیشہ کے انعکاس کے باعث ہی ہوتا ہے لیکن پھر بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ شیشہ کی روشنی رنگین ہے بلکہ وہ رنگین روشنی بھی شمع کی ہی کہلاتی ہے ٹھیک اسی طرح یقین کرو کہ کلام الٰہی کی شمع جانفروز بغیر کسی رنگِ تقید و تعین کے اپنی شان اطلاق کے ساتھ ازلاً و ابداً روشن وتابناک ہے لیکن حضرت موسیٰ کے قلب مطہر کا شیشہ اس نور لم یزل سے منعکس ہوا تو اسی شمع کلام الٰہی کا جلوہ عبرانی شکل میں نظر آیا حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ کے پاک وصاف دلوں کے آئینے اس روشنی سے عکس پذیر ہوئے۔ تو لوگوں کو اس شمع کی روشنی زبور اور انجیل کی صورت میں نظر آئی پھر سب سے آخر میں اس شمع کا نور عرب کے ایک قلبِ آئینہ تمثال پر اس کی بساط

و مقدرت کے مطابق پر تو فگن ہوا تو اس نور کا ظہور عربی زبان میں ہوا اور قرآن مجید کہلایا پھر جس طرح مطلق روشنی اور رنگین روشنی دونوں شمع کی ہیں اور آپ رنگ کو روشنی سے جدا نہیں کر سکتے اسی طرح مطلق کلام اور کلام بزبانِ عربی (قرآن)، دونوں خدا کے ہیں اور آپ قرآن کے عربی الفاظ و حروف کو کلام الٰہی سے خارج قرار نہیں دے سکتے۔ فافهم وتدبّر

عجب بات ہے کہ خود قرآنِ مجید نے نورِ الٰہی کو اسی تمثیل سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ	اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور
نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ	کی مثال اس طاق کی سی ہے جس میں چراغ ہو اور
فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ	چراغ ایک شیشہ میں ہو شیشہ ایسا چمکتا ہو کہ گویا
دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ	وہ روشن ستارہ ہے یہ چراغ ایک مبارک درخت
زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ	زیتون کے تیل سے روشن کیا گیا ہو اس درخت
يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ	کی نسبت نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب
نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ	کی طرف، تیل ایسا صاف و شفاف ہو کہ وہ
مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ	آگ کو چھوئے بغیر روشن ہو جائے اللہ نور
لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ	علیٰ نور ہے وہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی
(النور)	ہدایت کرتا ہے اللہ یہ مثال لوگوں کے لئے
	بیان کرتا ہے اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے معانی اور الفاظ کو لباس اور ملبوس سے تشبیہ دی ہے اور دونوں کو خدا کی طرف منسوب کیا ہے فرماتے ہیں۔

"قرآن کلامِ خدا است جل سلطانہ کہ بہ لباسِ حرف و صوت درآوردہ بر پیغمبر ما علیہ وعلیٰ

آلہ الصلوٰۃ والسلام منزل ساختہ وعباد را بہ آں امر ونہی فرمودہ چنانچہ ما کلام نفسی خود را بہ توسط کام وزبان در لباس حرف وصوت در آوردہ ظاہر می سازیم ومقاصد خفیہ خود را در عرصۂ ظہور می آریم ہم چنیں حضرت حق سبحانہٗ کلام نفسی خود را بے توسط کام وزبان بہ قدرتِ کاملہ خود لباسِ حرف وصوت عطا فرمودہ بر عباد فرستادہ است واوامر ونواہی خفیۂ خود را در ضمن حرف وصوت آوردہ بر منصۂ جلوہ دادہ است۔"

جو لوگ قرآن مجید کو صرف معانی کے اعتبار سے وحی مانتے ہیں اور الفاظ کی نسبت خدا کی طرف نہیں کرتے ان کو غور کرنا چاہیئے کہ قرآن مجید کی تصریحات سے قطع نظر یہ ایک بالکل واضح امر ہے کہ قلب میں محض معانی کے اتقار کے کوئی معنی ہی نہیں جس طرح معانی کا اظہار بغیر الفاظ کے نہیں ہوتا۔ اسی طرح قلب میں ان کا ظہور اور پھر ان کا تشخص وتعین بھی الفاظ کے بغیر ناممکن ہے چنانچہ ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنی تصنیف "اسلام میں مذہبی خیال کی تعمیر نو" (Reconstruction of Religious thought in Islam) میں لکھتے ہیں

"جدید علم النفس نے حال ہی میں متصوفانہ شعور وکیفیت کی حقیقت کی طرف توجہ کی ہے اس بلا واسطہ شعور وآگہی کے ذریعہ سالک خدا کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح ہم عام چیزوں کو دیکھ کر، یہ شعور واحساس ناقابل تجزیہ ہے اور کسی خارجی وجود کے عکس پر تو کا نتیجہ ہے اس شعور و احساس کی کیفیت کسی دوسرے کے لئے بیان کرنی بھی مشکل ہے۔

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

پیغمبر کا یہ احساس، فہم وادراک کا عنصر بھی رکھتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کا یہ احساس خیال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے احساس کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ الفاظ کا جامہ پہن کر زبانِ نبوت پر جاری ہوتا ہے احساس در اصل ایک خارجی چیز

(outward pushing) کا قلب پر وارد ہونا اور خیال اس کے اظہار (outward Rohorting) کا ذریعہ ہے غیر لفظی اور گونگا احساس اپنے منشاء کو خیال کی صورت میں ادا کرتا ہے اور خیال الفاظ کا جامہ پہن کر ظاہر ہوتا ہے گویا یہ کہنا محض استعارہ نہیں ہے کہ خیال اور لفظ دونوں بیک وقت رحم احساس سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خیال الفاظ سے معرا نہیں ہوتا۔ اپنی ابتدا اور آفرینش کے لحاظ سے دونوں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ گویا لفظ بھی ملہم ہے۔ مختصر یہ ہے کہ قرآن لفظًا و معنًا کلام الٰہی ہے۔

روزمرّہ کی زندگی میں دیکھئے آپ کسی اچھے اور بیساختہ شعر کو سن کر کہتے ہیں یہ تو الہامی شعر ہے اب بتائیے کہ کیا اس جملہ سے آپ کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس شعر کے صرف معانی الہامی ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ معانی کتنے ہی عمدہ اور بلند ہوں اگر الفاظ کا جامہ ان پر چست نہیں ہے تو آپ کبھی اس شعر کو الہامی کہہ ہی نہیں سکتے۔

کیا کلام کیلئے نطق ضروری ہے

بعض نادان پوچھتے ہیں کہ اچھا خدا کلام کرتا ہے تو اس کے لئے نطق بھی ہوگا حالانکہ نطق اعصاب و عضلات کی مخصوص حرکت کا نام ہے اور یہ حرکت ذاتِ بسیط و مجرد کے لئے نہیں ہو سکتی" جواب یہ ہے کہ اول تو اس شبہ کا جواب پہلے ہی گذر چکا ہے یعنی یہ کہ ہم خدا کی کسی صفت کو اپنی صفت پر قیاس نہیں کر سکتے جس طرح ہمارا ایمان ہے کہ خدا دیکھتا ہے اور سنتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس کے دیکھنے اور سننے کی صورت اور حقیقت کیا ہے؟

اسی طرح ہم کو بہ طریقِ اذعان و یقین معلوم ہے کہ خدا کلام کرتا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ اس کلام کی نوعیت کیا ہے؟

علاوہ ازیں اس کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ کلام کے لئے نطق کی ایسی کوئی

Marfat.com

ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ کسی کا کلام وہ ہے جس سے اس کے مافی الضمیر کا اظہار ہو اور یہ اظہار جس طرح زبان کے ذریعہ ہوتا ہے ہاتھ کے یا کسی اور عضو کے اشارہ سے اور اس کے علاوہ مختلف طریقوں سے بھی ہوتا ہے فرض کیجئے ایک شاعر اپنی زبان سے ایک حرف نہ کہے اور وہ پوری ایک غزل صفحہ قرطاس پر لکھ کر ہمیں دیدے تو کیا ہم اس غزل کو اس بنا پر شاعر کا کلام نہیں کہیں گے کہ اس نے اس غزل کے الفاظ و حروف کا نطق کیا ہی نہیں ہے۔

کون نہیں جانتا کہ فوجوں میں جھنڈیوں شیشوں اور اشاروں سے گفتگو کی جاتی ہے اور انھیں ذرائع سے خبریں پہونچائی جاتی ہیں۔ اسٹیشنوں پر بازاروں میں اور ٹریفک کے موقعوں پر سبز اور سرخ روشنیوں سے الفاظ و حروف کا کام لیا جاتا ہے انسان جب تک الفاظ و حروف سے آشنا نہیں ہوا تھا وہ گفتگو کے وقت ہاتھ اور آنکھ کے اشاروں سے مافی الضمیر کا اظہار کرتا تھا۔ ظاہر ہے یہ تمام علامات و اشارات معانی پر دلالت کرنے کے باوصف غیر ملفوظ و غیر منطوق ہیں لیکن اگر ان معانی کو کسی دوسرے تک منتقل کیا جائے تو پھر یہ معانی الفاظ و حروف کا جامہ پہن لیں گے تاہم ان کی نسبت اس شخص کی ہی طرف ہوگی جس نے بولے بغیر کسی علامت کے ذریعہ آپ کو وہ معانی بتلائے ہیں

اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور واضح مثال یہ ہے کہ تار گھر میں آپ نے دیکھا ہوگا تار بابو ایک آلہ جس کو انگریزی میں ڈمی (Dummy) کہتے ہیں اس کے پاس بیٹھ کر انگلیوں کی حرکت سے اس آلہ کو جنبش دیتا ہے اس کی اس جنبش سے کسی دوسرے شہر میں تار وصول کرنے والا بابو محض گر گٹ گر گٹ کی آواز سنتا ہے اور تار کا تمام مضمون معلوم کر لیتا ہے پھر جب وہ اس مضمون کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا ہے تو مسلسل ایک بامعنیٰ عبارت یا جملہ بن جاتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھئے کہ گر گٹ گر گٹ کی آواز کے ذریعہ تار کا مضمون

صحیح صحیح معلوم کر لینا تار وصول کرانے والے (Reciever) بابو کی لیاقت و قابلیت پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر یہ قابل ہے تو وہ مضمون کا ایک ایک حرف ہی وصول نہیں کرتا بلکہ عبارت کا کاما اور ڈیش تک صحیح صحیح وصول کر لیتا ہے پس یہی حال انبیا اور رسل کا ہے ذات حق میں اور ان میں ایک خاص قسم کا معنوی تعلق ہونے کے باعث ان میں اس بات کی صلاحیت بدرجۂ اتم ہوتی ہے کہ مبدا رفیاض کی جانب سے جن معانی و مطالب کا فیضان ایک خاص طریقہ پر ان کے نفوسِ طاہرہ پر ہو وہ انھیں پورے طور پر سمجھ لیں اور چونکہ کسی معنی کا دل میں خطور بغیر الفاظ کے نہیں ہوتا اس لئے انبیاء کرام جب ان معانی کو سمجھتے ہیں تو اس حالت میں سمجھتے ہیں کہ وہ معانی والفاظ کے ساتھ متکیف اور ان کے جامہ میں ملبوس ہوتے ہیں۔ معانی اور الفاظ میں ایسا گہرا تعلق ہے کہ ان میں زمانہ کے اعتبار سے کوئی تقدم و تاخر نہیں ہوتا بلکہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس آن معانی کا القاء ہو رہا ہے ٹھیک اسی آن میں الفاظ بھی منجانب اللہ نازل ہو رہے ہیں اور ان الفاظ کا ملہم بھی وہی ہے جس نے معانی کا القاء قلب میں کیا ہے اب دیکھئے یہاں الفاظ اور معانی دونوں کلام الٰہی کی صورت میں نبی کے قلب پر نازل ہو رہے ہیں اور پھر پائے نطق درمیان میں نہیں ہے ولا غرابة فيه

زبان حال کی وسعت گویائی

استدلال کے لئے نہیں بلکہ تماماً للبحث جو متفلسف کلام کا بغیر نطق کے تصور بھی نہیں کر سکتے اس موقع پر ان سے یہ دریافت کرنا غالباً بے محل نہیں ہوگا کہ کیا آپ نے کبھی یہ نہیں سنا کہ بعض مرتبہ زبانِ حال سے دل کی بات ایسے بلیغ پیرایہ میں بیان ہو جاتی ہے کہ زبانِ قال سے نہیں ہوتی عربی کا ایک شاعر کہتا ہے ٥

وللقلب علی القلب دلیلٌ حین یلقاہ
وفی الناس من الناس مقاییسٌ واشباہ
وفی العین غنی للمرء ان تنطق افواہ

٥ ترجمہ:- اور دل جب دل سے ملتا ہے تو اس کے لئے ایک دوسرے پر دلالت کرنے والا ہوتا ہے لوگ آپس میں ایک دوسرے کے مماثل اور مشابہ ہوتے ہیں اور آنکھ اس طرح کلام کرتی ہے کہ منہ کو بولنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

Marfat.com

ایک اور شاعر نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں کہا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس نے زبان چشم کی گویائی کو وحی سے تعبیر کیا ہے۔

تری عینہا عینی فتعرف وحیہا ۔ وتعرف عینی مابہا لوحی یرجع[1]

ایک شاعر آنکھ کے ذریعہ کسی مافی الضمیر کو اپنے مخاطب پر ظاہر کر دینے کو آنکھ کا نطق بتاتا ہے سنئے۔

العین تبدی الذی فی نفس صاحبہا ۔ مِنَ المحبۃ او بغضٍ اذا کانا

والعین تنطق والافواہ صامتۃ ۔ حتیٰ تریٰ من ضمیر القلب تبیانا

ترجمہ:- آنکھ خواہ محبت ہو یا بغض بہرحال اس چیز کو ظاہر کر دیتی ہے جو کسی شخص کے دل میں ہوتی ہے اور آنکھ گویا ہوتی ہے درآں حالیکہ منہ خاموش ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ آنکھ دل کی چھپی ہوئی بات کو صاف صاف دیکھ لیتی ہے۔

کتب عقائد کا ایک مشہور عربی شعر ہے جو کلام نفسی کی بحث میں نقل کرتے ہیں

اِنَّ الکلامَ لفی الفواد وِانّمَا ۔ جُعِلَ اللسانُ علی الفوادِ دلیلاً

ترجمہ:- کلام تو دراصل دل میں ہوتا ہے زبان تو صرف ظاہر کر دینے والی ہے۔

قرآن مجید میں خدا کی صفت کلام کا ذکر یہاں تک جو بحث تھی محض عقلی تھی ضمناً کہیں کہیں مدعا کی تائید و تقویت کے لئے آیتوں کے حوالے آگئے ہیں۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں خدا کی صفت کلام کی نسبت کیا کچھ تصریحات ہیں

---

[1] ترجمہ:- اس محبوبہ کی آنکھ میری آنکھ کو دیکھتی ہے اور اس کی وحی پہچان جاتی ہے پھر محبوبہ کی آنکھ اس وحی کا جواب دیتی ہے تو میری آنکھ اسے پہچان جاتی ہے۔

تاکہ آپ انھیں تنقیحاتِ عقلی پر منطبق کر سکیں۔

کلام صفتِ کمال ہے | حضرت موسیٰ کے واقعہ میں سامری کے بچھڑے کا جو نقص بتایا گیا ہے اس میں اس کا بھی ذکر ہے کہ وہ کلام نہیں کر سکتا تھا۔ ارشاد ہے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِن بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ ۚ أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا

موسیٰ کے بعد ان کی قوم نے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کا دھڑ بنایا جو گائے کی سی آواز نکالتا تھا کیا ان لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ بچھڑا نہ ان سے کلام کر سکتا ہے اور نہ کسی راستہ کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔

پھر اسی بچھڑے کی نسبت اسی سورۃ میں ارشاد ہے۔

أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا (طٰہٰ)

کیا وہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ بچھڑا نہ ان کی کسی بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ وہ ان کے ضرر و نفع کا مالک ہے۔

سامری بچھڑے کو خدا بتاتا تھا۔ قرآن اس کی تردید کرتا ہے اور بچھڑے کی عدم الوہیت کی دلیل یہ بیان کرتا ہے کہ وہ تو کلام بھی نہیں کر سکتا تھا اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے لئے متکلم ہونا ضروری ہے۔

خدا کلام کرتا ہے | چنانچہ خدا نے متعدد مواقع پر قرآن میں اپنے کلام کرنے کا ذکر کیا ہے حضرت موسیٰ کے واقعہ میں ذکر ہے۔

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ (اعراف)

اور جب موسیٰ ہمارے مقررہ وقت پر حاضری دینے کیلئے آیا اور اس کے رب نے ان سے کلام کیا

پھر حضرت موسیٰ کو جو شرفِ ہم کلامی عطا فرمایا گیا تھا اس کا ذکر اس طرح ہے۔

یٰمُوْسٰٓی اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَبِكَلَامِیْ	اے موسیٰ میں نے تجھ کو اپنی پیغمبری اور ہمکلامی سے لوگوں پر برگزیدگی بخشی۔

کسی کو خیال ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے اللہ نے سچ مچ کلام نہ کیا ہو اور کلّم کی اسناد اللہ کی طرف مجازاً ہو۔ اس شبہ کا ازالہ بھی کر دیا گیا۔ فرماتے ہیں۔

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَكْلِیْمًا	اور اللہ نے موسیٰ سے یقیناً کلام کیا ہے۔

زبانِ عربی کے رمز شناس جانتے ہیں کہ مصدر سے فعل کی تاکید بیان کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ فاعل سے فعل کا صدور ضرور ہوا ہے۔

ان آیتوں کے علاوہ کئی آیتوں میں اہلِ جنت سے کلام کرنے کا اور بے ایمان لوگوں سے کلام نہ کرنے کا بھی تذکرہ ہے مثلاً اہلِ جنت کے باب میں ہے۔

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ	سلامتی ہو یہ رب رحیم کیطرف سے کہا گیا ہے

بے ایمانوں کے بارہ میں کہا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ	جن لوگوں نے اللہ کے وعدہ اور اپنی قسموں کو تھوڑی سی قیمت میں بیچ دیا ہے ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور اللہ نہ ان سے کلام کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا۔

خدا اپنی شان کے مطابق کلام کرتا ہے

صفتِ کلام کے اثبات کے ساتھ ساتھ قرآن کے انداز بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے کلام کی حقیقت وہ نہیں ہے جو ہمارے کلام کی ہے بلکہ اُسکا کلام اس کی شانِ الوہیت کے مطابق ہوگا اگرچہ قرآن نے اس مضمون کی تصریح نہیں کی لیکن اس نے

مختلف چیزوں کیلئے جو کلام کا لفظ بولا ہے اس سے اس مدعا پر روشنی پڑتی ہے قیامت کے دن انسان کے دست و پا اس کے اعمال و افعال پر جو شہادت دیں گے ان کے ذکر میں ہے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰىٓ اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ (یٰس)	آج کے دن ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دینگے اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پیر شہادت دینگے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ کلام کریں گے اور پیر شہادت دیں گے لیکن کس طرح اس کی حقیقت نامعلوم ہے اسی طرح کھالوں کے متعلق ارشاد ہے۔

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْآ اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ	اور یہ لوگ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف شہادت کس طرح دی تو وہ کھالیں جواب دینگی کہ ہم کو اس خدا نے گویا کردیا ہے جس نے ہر چیز کو گویا کیا ہے۔

اب دیکھئے اس آیت میں جلود کے لئے نطق ثابت کیا گیا ہے لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ نطق کس طرح کا ہے؟ تو اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کی حقیقت کا علم صرف خدا کو ہی ہے وہ سرگشتۂ ظلمتِ حدوث و امکان انسان جس کا علم وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا کے دائرہ میں محدود ہے علم کی ان پہنائیوں تک رسائی کا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے بس اس سے سمجھ لو کہ خدا کا کلام اس کی شان کے مطابق ہوگا ہم اس کی حقیقت کس طرح متعین کر سکتے ہیں۔

خدا ندا کرتا ہے — البتہ قرآن سے اتنی بات اور ثابت ہے کہ خدا کے لئے ندا بھی پائی جاتی ہے حضرت موسیٰؑ کے واقعہ میں ہے۔

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی اِنِّیْ اَنَا رَبُّكَ (طٰہٰ)

جب موسیٰ درخت کے پاس آئے تو ان کو ندا دی گئی کہ اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں۔

اس سے بھی واضح تر یہ ہے۔

وَنَادَیْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَیْمَنِ (مریم)

اور ہم نے موسیٰ کو طور کی داہنی جانب سے ندا دی۔

حضرت آدم کے واقعہ میں ہے۔

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ

جب آدم اور حوا نے درخت کو چکھا تو ان کا ستر ظاہر ہو گیا اور یہ جنت کے پتوں سے اپنا تن ڈھانکنے لگے اور ان کے رب نے ان کو ندا دی کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور نہیں کہا تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا ہوا دشمن ہے۔

(اعراف)

ایک جگہ ہے۔

وَیَوْمَ یُنَادِیْهِمْ اَیْنَ شُرَكَآءِیَ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ

اور جس دن خدا ان کو ندا دے گا کہ وہ کہاں ہیں جن کو تم میرا شریک سمجھتے تھے۔

یہ اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد آیات ہیں جن میں خدا کے ندا دینے کا ذکر بصراحت مذکور ہے اور چونکہ ندا کا تحقق بغیر صوتِ مسموع کے نہیں ہوتا۔ اس لئے ان آیات سے ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے لئے صوت ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کی احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے

قرآن اور نطق ربانی

لیکن یہ امر قابلِ غور ہے کہ جہاں تک قرآن مجید یا کسی اور آسمانی کتاب کے نزول کا

تعلق ہے اس سلسلہ میں خدا کی ندا یا صوت کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں ہے بلکہ حضرت جبریل کو قلم کے ساتھ تشبیہ دے کر غالباً اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح قلم کے ذریعہ کاتب کا پیغام مکتوب الیہ تک پہونچ جاتا ہے اور آواز نہیں ہوتی اسی طرح خدا کا پیغام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک بغیر کسی نطق اور صوت کے پہونچا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ [۱]

آپ پڑھیے اور آپ کے رب اکرم نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی ہے اس نے انسان کو وہ چیزیں بتائیں جنھیں وہ نہیں جانتا تھا۔

انسانوں سے کلام الٰہی کی صورتیں

اس کے علاوہ کلام الٰہی کے سلسلہ میں قرآن نے بتایا ہے کہ خدا انسانوں سے کتنے مختلف طریقوں سے کلام کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌ [۲]

اور کسی بشر کی یہ مجال نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کے آڑ سے یا یہ کہ وہ کسی قاصد کو بھیجے جو اللہ کے حکم سے جو کچھ وہ چاہے پہنچائے بے شبہ اللہ تعالیٰ بلند اور حکیم ہے

---

[۱] عام مفسرین جبریل کے لئے قلم کا استعارہ کرنے میں یہ حکمت بیان کرتے ہیں کہ اللہ اور آنحضرت کے درمیان جبریل کا واسطہ محض قلم کا سا تھا جس طرح کتابت قلم سے ہوتی ہے لیکن اس کو کاتب نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ وحی پہونچتی تھی جبریل سے پہونچتی تھی لیکن ان کی حیثیت قلم سے زیادہ نہیں تھی اور موحی صرف ذاتِ خداوندی تھی اس توجیہ کے خوب ہونے میں کلام نہیں لیکن ممکن ہے اس میں یہ حکمت بھی ہو کہ قلم کے ذریعہ سے جو پیغام پہونچتا ہے وہ بہ نسبت پیغام زبانی کے عالمگیر اور ہر زمان و مکان میں یکساں کارگر ہوتا ہے۔

[۲] یہ آیت مشکلات قرآن میں سے ہے اشکال یہ ہے کہ اس آیت میں کلام الٰہی کو (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اس آیت میں کلام الٰہی کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ وحی کے ذریعہ سے کلام، پس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مقسم قرار دے کر اس کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں اور اقسام شے چونکہ آپس میں قسیم ہوتے ہیں اس لئے وہ ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے اس بنا پر خدا کا جو کلام بذریعہ ارسال رسل ہوگا اس کو وحی نہیں کہہ سکتے حالانکہ قرآن مجید سب کا سب بواسطۂ رسول (قاصد) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور وہ وحی ہے دوسرا اشکال یہ ہے کہ "اَو یُرسِلَ رسولاً فیوحی باذنہٖ مایشاء" میں فیوحی کو ارسالِ رسل پر متفرع کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی خود ارسال رسل کی ایک قسم ہے حالانکہ آیت کے پہلے حصہ میں کلام الٰہی کو تین قسموں پر منقسم کرکے وحی کو ارسال رسل کا قسیم بتایا گیا ہے تو اب قسیم شے کا قسم بننا لازم آگیا۔ وہو محال۔ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے مشکلات القرآن پر اپنی یادداشتوں میں اس آیت کا بھی ذکر کیا ہے اور اس آیت کی تقریر اس طرح کی ہے کہ اشکال خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں "اِلَّا وحیًا" اس سے مراد یہ طریق وحی یعنی مصدر بیانِ نوع کے لئے ہے اور چونکہ خدا نے اس وحی کی اسناد اپنی طرف کی ہے اور مابعد کی دو قسموں کو اس کا مقابل ٹھہرایا ہے اس لئے اس وحی سے مراد القاء فی القلب ہے اور نفث فی الروع (دل میں پھونکنا یا ڈالنا) خواہ یہ بحالت بیداری ہو یا بحالتِ خواب۔ اس مخصوص مراد کی وجہ سے وحی کی یہ قسم اپنے دونوں قسموں سے ممتاز ہو گئی "او من وراءِ حجاب" اس سے مراد ہے پس حجاب اس طرح کلام کرنا کہ متکلم نظر نہ آئے اور ایک غیبی آواز سنائی دے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ نے سنا یا شب معراج میں آنحضرت کو پیش آیا "اَو یُرسِلَ رسولاً فیوحی" اس میں ایحاء (وحی کرنے) کی اسناد خدا کی طرف نہیں بلکہ رسول کی طرف ہے۔ اس لئے مراد یہ ہوئی کہ اس صورت میں فرشتہ پیغمبر سے بالمشافہ گفتگو کرتا ہے اس تنقیح سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ ایحاء اول الذکر وحی سے متغائر ہے یعنی ایک وحی بلاواسطہ ہے اور دوسری بواسطہ اور مقابلۃ الشیء لنفسہٖ کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

(مشکلات القرآن ص ۲۳۲، ۲۳۳)

Marfat.com

پردہ کلام اور کلام بذریعہ قاصد ان تینوں قسموں میں سے کسی نہ کسی طریقۂ کلام سے ہر پیغمبر کو شرف خطاب عطا فرمایا گیا ہے حضرت موسیٰ کو کلام پس پردہ کے شرف سے نوازا گیا کہ وادی سینا کے ایک درخت سے انھوں نے صوت ربانی سنی۔ باقی رہیں دو صورتیں تو وہ تمام پیغمبروں کے لئے پائی گئی ہیں اور قرآن میں جگہ جگہ ان کا ذکر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تینوں طریق ہائے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا جس کی تفصیل آگے اپنے موقع پر آئے گی۔

Marfat.com

ملکۂ نبوت اور وحی

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ خدا اپنے خاص خاص بندوں سے مختلف طریقوں سے خطاب و کلام کرتا ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیا بھی تو آخر ہمارے جیسے انسان ہی ہوتے ہیں پھر ان میں ایسی کون سی خصوصیت ہے کہ خدا ان سے کلام کرتا ہے اور وہ خدا کے کلام کو سمجھتے بھی ہیں لیکن ان کے علاوہ کوئی اور شخص شرفِ خطاب ایزدی سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ آپ نبوت کی حقیقت کو تفصیلاً نہیں تو اجمالاً ہی سمجھ لیں امام رازی نے مطالب العالیہ میں امام غزالی نے معارج القدس میں حافظ ابن تیمیہ نے کتاب النبوات اور دوسری تصنیفات میں شاہ ولی اللہ الدہلوی نے حجۃ البالغہ میں اور مولانا محمد قاسم النانوتوی نے تقریر دلپذیر میں اس عنوان کے ماتحت مستقلاً نہایت جامع اور سیر حاصل بحثیں کیں ہیں۔ ان سب کا اگر خلاصہ بھی نقل کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے۔ ہم ذیل میں اب ان سب تقریروں کو سامنے رکھ کر نبوت کی حقیقت پر ایک اجمالی بحث کرتے ہیں۔ پہلے بطور مقدمہ چند باتوں کا جان لینا ضروری ہے۔

حکمت | (۱) تمام فلاسفہ اس پر متفق ہیں کہ انسان کے انسان کامل ہونے کا دارومدار اس کے حکمت مآب ہونے پر ہے۔ یہی وہ طغرائے امتیاز ہے جس کے باعث انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے اور یہی وہ شرف و عزت ہے جس کو قرآن مجید میں۔

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا — اور جس کو حکمت دی گئی اسے بہت بڑی خیر دی گئی

Marfat.com

فرما کر بیان کیا گیا ہے حکمت کسے کہتے ہیں اصولی اعتبار سے اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہر سب جانتے اور مانتے ہیں کہ انسان میں اصلی قوتیں دو ہیں ایک قوتِ نظری جس سے انسان اشیا، کے حقوق اور ان کے حسن و قبح کو معلوم کرتا ہے اور دوسری قوتِ عملی جس کے ذریعہ انسان کوئی عمل کرتا ہے ان دونوں قوتوں میں حاکم کون ہے اور محکوم کون یا افضل و مفضول کس کو کہنا چاہیے اس کو رہنے دیجئے کہ ہمارے موضوع بحث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بہرحال یہ مسلم ہے کہ حکمت جس کو کہتے ہیں وہ انھیں دو قوتوں کے کمال کا نام ہے کمال سے مراد یہ ہے کہ دونوں قوتیں نہایت صحیح اور تندرست ہوں یعنی اشیاء کے حقائق اور ان کے حسن و قبح کے متعلق قوت نظری کا فیصلہ بالکل واقعہ کے مطابق ہو اس میں کسی فریب یا کج نظری کو کوئی دخل نہ ہو اسی طرح قوت عملی کے کمال کے معنیٰ یہ ہیں کہ کسی فعل و عمل کے اخذ و ترک پر قوتِ عملی کی تحریک اس فعل کے حسن و قبح پر مبنی ہو وہ ہم کو صرف اسی فعل کے کرنے پر برانگیختہ کرے جو حسن ہونے کے باعث حقیقتاً قابل اخذ ہو۔ اسی طرح وہ ان افعال سے بہ شدت روکے جو قبیح ہونیکی وجہ سے لائقِ ترک ہوں۔

مراتب کمال ونقص کا تفاوت

(۲) یہ ظاہر ہے کہ تمام انسانوں میں یہ دونوں قوتیں یکساں نہیں ہوتیں بلکہ ضعف اور قوت زیادتی اور نقص کے اعتبار سے ان میں بے شمار مراتب مختلفہ پائے جاتے ہیں انھیں مراتب کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح شکل و صورت اور رنگ و روپ میں کوئی ایک شخص پورے طور پر کسی دوسرے شخص کے برابر یا مثل نہیں ہوتا۔ اسی طرح فضائل اخلاق اور ملکاتِ نفسی میں بھی دو انسان ایک دوسرے کے مماثل و مساوی نہیں ہوتے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مرتبہ کمال و نقص میں ایک ایک درجہ ایسا ضرور نکلے گا کہ پھر اس کے اوپر (مرتبہ کمال میں) یا اس کے نیچے (مرتبہ نقص میں) کوئی اور درجہ نہیں ہوگا۔

استکمال و تکمیل

(۳) کسی انسان کی یہ دونوں قوتیں جب مکمل ہوتی ہیں تو ان کے کمال کا ایک مرتبہ

Marfat.com

یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ انسان خود ہی کامل نہیں ہوتا بلکہ اس کی قوتیں اپنے کمال میں کچھ ایسی مقناطیسی جاذبیت اور کشش بھی رکھتی ہیں کہ دوسروں کو متاثر کرتی ہیں اور دوسروں کی قوت نظری اور قوت عملی کو بھی کمال کی طرف مائل و راغب کر دیتی ہیں۔

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد سمجھئے کہ جس کو نبی کہتے ہیں وہ ہی ہوتا ہے جس کی دونوں قوتیں، نظری اور عملی، انتہا درجہ کی کامل ہوتی ہیں اور وہ دوسروں کی ان قوتوں کو بھی کامل کر سکتا ہے۔

فکر و حدس یہاں تک جو گفتگو تھی وہ نبوت کی عام حقیقت سے متعلق تھی لیکن چونکہ یہاں ہمارا مطمح نظر نبی کی استعداد وحی سے بحث کرنا ہے جس کا تعلق قوت نظری سے ہی ہے اس لئے ہم یہاں قوت عملیہ کو نظر انداز کر کے قوت نظری کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں اس کے بعد یہ امر خود بخود واضح ہو جائے گا کہ صرف پیغمبر ہی کیوں کلام الٰہی سے شرف اندوز ہو سکتا ہے۔

تقریر بالا سے یہ معلوم تو ہو ہی چکا ہے کہ نبی کی قوت نظری تمام انسانوں سے زیادہ کامل اور افضل ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ فکر و ادراک کے اعتبار سے ایک انسان دوسرے انسان سے مختلف و متفاوت ہوتا ہے کوئی غبی ہوتا ہے اور کوئی ذہین پھر غباوت اور ذہانت کے مراتب و مدارج بھی بیشمار ہیں۔ لیکن جانب نقصان و کمال میں دونوں مرتبے ایسے نکلتے ہیں کہ پھر ان کے اوپر یا نیچے کوئی اور مرتبۂ نقصان و کمال نہیں پایا جاتا۔ ابن سینا نے اشارات میں لکھا ہے کہ ہم مرتبۂ نقصان میں دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ غباوت و بلادت طبع کے ایسے اسفل السافلین درجہ میں ہوتے ہیں کہ معمولی سے معمولی بات بھی آپ ان کو لاکھ مرتبہ سمجھائیں ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جانب نقصان کے انتہائی مرتبہ میں ایک ایسے شخص کا موجود ہونا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اس کے بالمقابل مرتبہ

Marfat.com

کمال میں بھی ایک ایسا شخص ہوگا جو بغیر کسی تعلیم و تعلّم کے اپنے نفس کے ادنیٰ التفات سے ان مشکل سے مشکل مسائل حیات کو بآسانی سلجھا سکے گا جو دوسروں کے لیے عقدۂ لاینحل ہوں گے فلاسفہ ایسے شخص کو صاحب قوۃ قدسیہ یا صاحب حدس تام کہتے ہیں۔

علماء شریعت کی اصطلاح میں جس کو نبی کہتے ہیں اس کی قوت فکر و حدس کا اندازہ فلاسفہ کے مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں ہوسکتا ہے۔ چنانچہ امام غزالی احیاء العلوم میں عقل کے مراتب متفاوتہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ومن انكر تفاوت الناس في
هذه الغريزة فكانه منخلع عن
ربقة العقل وكيف ينكر تفاوت
الغريزة ولولاه لما اختلفت الناس
في فهم العلوم ولما انقسموا
الى بليد لا يفهم بالتفهيم
الا بعد تعب طويل من المعلم
والى ذكي يفهم بادنى رمز و
اشارة والى كامل تنبعث من
نفسه حقايق الامور بدون
التعليم كما قال تعالى يكاد زيتها
يضيء ولو لم تمسسه نار نور على
نور فذالك مثل الانبياء اذ يتضح

اور جو لوگ اس غریزہ (عقل) میں لوگوں کے
متفاوت ہونے کا انکار کرتے ہیں انھوں نے
گویا عقل کی رسّی اپنی گردن سے نکال پھینکی ہے
اور بھلا اس تفاوت فی الغریزۃ کا انکار کس طرح
کیا جاسکتا ہے اگر یہ تفاوت نہ ہوتا تو لوگ
علوم کے فہم میں مختلف نہ ہوتے اور نہ ان کا انقسام
ہوتا ایسے بلید و غبی کی طرف جو تفہیم کے بعد بھی
نہیں سمجھتا مگر اس وقت جب کہ معلم کو طویل تعب
برداشت کرنا پڑتا ہے اور ایسے ذکی کی طرف
جو ادنیٰ رمز اور اشارہ سے بات کو سمجھ جاتے ہیں
اور ایسے کامل کی طرف جس کے اپنے نفس سے
بغیر تعلّم کے حقایق امور پیدا ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ
تعالیٰ فرماتا ہے قریب ہے کہ زیتون کا

لهم في بواطنهم امور غامضة من غير تعلم وسماع ويعبر عن ذالك بالالهام (ج ۱ ص ۷۸)

تیل آگ چھوئے بغیر ہی روشن ہو جائے یہ نور علیٰ نور ہے اور ان کاملوں کی مثال انبیاء کی سی ہے کیونکہ ان کے دلوں میں بغیر تعلم و سماع کے ہی باریک باریک امور واضح ہو جاتے ہیں اور اس کمال کو الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پھر آگے چل کر اس تفاوت فی العقل کو مثال سے اس طرح سمجھاتے ہیں۔

وانقسام الناس الى من تنتبه من نفسه ويفهم والى من لا يفهم الا بتنبيه وتعليم والى من لا ينفعه التعليم ايضا ولا التنبيه كانقسام الارض الى ما يجتمع فيه الماء فيقوى فيتفجر بنفسه عيونا والى ما يحتاج الى الحفر ليخرج الى القنوات والى ما لا ينفع فيه الحفر وهو اليابس وذالك لاختلاف جواهر الارض في صفاتها فكذالك اختلاف النفوس في غريزة العقل

(ج ۱ ص ۷۸)

اور لوگوں کا منقسم ہونا ایسے لوگوں کی طرف جو خود بخود متنبہ ہو جاتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں اور ان لوگوں کی طرف جو تنبیہ اور تعلیم سے ہی سمجھ سکتے ہیں اور ایسے لوگوں کی طرف جن کو تعلیم نفع بخشتی ہے اور نہ تنبیہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ زمین کئی قسم کی ہوتی ہے بعض زمینیں تو وہ ہوتی ہیں جن میں پانی جمع ہوتا رہتا ہے اور جب زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ خود چشموں کی شکل میں بہہ پڑتا ہے اور بعض زمینیں وہ ہوتی ہیں جنھیں کھودنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ پانی کو نہروں وغیرہ کی طرف منتقل کیا جائے اور بعض زمینیں جو خشک ہوتی ہیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں کھودنا بھی فائدہ نہیں دیتا اور لوگوں کی عقلوں کا مختلف ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ زمین کے جواہر اپنی صفات میں مختلف ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ امام غزالی نے کتاب المنقذ من الضلال، اور احیاء العلوم میں یہ بھی لکھا ہے کہ نبوت ماوراء عقل ایک مقامِ ادراک و احساس ہے جو انسان کے حواس ظاہرہ اور قوائے باطنہ کے تدریجی ارتقاء کے بعد حاصل ہوتا ہے لیکن جس طرح تمیز وعقل کے مدرکات کے لئے حواس بیکار ہیں اسی طرح اس درجہ کے مدرکات کے لئے عقل بے کار ہے اگر کوئی شخص اس درجہ کا منکر ہے تو اس کا یہ انکار ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی بے عقل کا عقلی امور سے انکار کرنا۔ المنقذ من الضلال میں فرماتے ہیں۔

بل الایمان بالنبوة ان یقر	بلکہ نبوت پر ایمان لانے کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ اقرار
باثبات طور وراء العقل تنفتح	کیا جائے کہ عقل سے بالاتر ایک مقام ہے جس
فیہ عین یدرک بہا مدرکات	میں آنکھ کھل جاتی ہے اور اس کے ذریعہ سے خاص
خاصة والعقل معزول عنہا	خاص مدرکات کا ادراک کیا جاتا ہے اور عقل ان مدرکات
کعزل السمع عن ادراک	کے ادراک سے ایسی ہی عاجز ہے جیسے کان رنگوں
الالوان الخ	کے ادراک سے۔

اس بنا پر نبوت کا اصل اذعان و یقین امام صاحب کے نزدیک صرف اس شخص کو ہی ہو سکتا ہے جس کو خود نبوت کا مقام حاصل ہو یا جو نفس قدسی رکھنے کے باعث مابعد الطبیعی حقائق کو معلوم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ چنانچہ اپنی حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وبالجملة من لم یرزق منہ شیئاً	اور خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس کا ذوق نہیں
بالذوق فلیس یدرک من حقیقة	دیا گیا ہے وہ نبوت کی حقیقت کے سلسلہ میں بجز
النبوة الا الاسم	نام کے اور کسی چیز کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

لے ص ۳۱

فلاسفہ کی تعبیر کے مطابق ان ارباب نفوس قدسیہ کا دل آئینہ کی طرح مجلیٰ اور منزکیٰ ہوتا ہے جس میں عقلِ فعال کی طرف سے جو تمام معقولات اور صور معنویہ کا خزانہ ہے۔ حقایق کا انعکاس ہوتا رہتا ہے اور اس فیضان وتاثر کی وجہ سے وہ بڑی سے بڑی نظری چیزوں کا علم حاصل کر لیتے ہیں جو دوسروں کو بڑی مشق ومہارت کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا اور یہ علم شائبہ تردد وشک سے آلودہ نہ ہونے کے باعث قطعی اور حتمی ہوتا ہے۔

ملکۂ نبوت وہبی ہے کسبی نہیں | آئینہ کی مثال سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ملکۂ نبوت ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ خاص موہبتِ خداوندی ہے جو کسی کسی کو عطا فرمائی جاتی ہے قرآن مجید میں ہے۔

اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہٗ — اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنا پیغمبر کس کو بنائے

آپ دیکھتے ہیں آفتاب جہاں تاب طلوع ہو کر کائناتِ عالم کے ذرہ ذرہ پر جلوہ پاش ہوتا ہے اور اس کی شعاعیں در ودیوار مٹی پتھر گھاس اور کوڑا کرکٹ ہر چیز پر پڑتی ہیں لیکن جب یہی شعاعیں کسی آتشی شیشہ پر پڑتی ہیں تو وہ اس کو جگمگا دیتی ہیں یہاں تک کہ خود اس میں سے شعاعیں چھن چھن کر دوسری چیزوں پر جو اس کے بالمقابل ہوتی ہیں عکس ریز ہونے لگتی ہیں اسی طرح یقین کرو کہ وجودِ ابدی وسرمدی کا خورشیدِ حقیقت اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ روشن ہے اور بلا امتیاز ما وشما ہر چیز کو اپنی شعاعوں سے مستفیض کر رہا ہے لیکن یہ اپنی اپنی فطری وجبلی استعداد کا فرق ہے کہ ہر چیز اس سے اپنی فطری صلاحیت کے مطابق ہی کسب فیض کر سکتی ہے انبیاء کے نفوسِ قدسیہ اگر اس آفتاب حقیقت کی نورانی شعاعوں کو جذب کر کے خود منور ہوتے ہیں اور دوسروں کو منور کر دیتے ہیں تو اس لئے کہ وہ آتشی شیشہ کی طرح اس کی فطری استعداد رکھتے ہیں اور اگر ہم ان انوار وتجلیات سے براہ راست اکتسابِ نور نہیں کر سکتے تو اس کی وجہ یہ ہے

کہ ہمارے دل اور قوا، مدرکہ اس لوہے کی طرح ہیں جس کو جلا نہ پانے کی وجہ سے آئینہ کا ہمسر ہونے کا حوصلہ نہیں ہو سکتا۔ الغرض

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز بے اندام ماست | ورنہ تشریف تو بر بالائے کس دشوار نیست

شہیدی نے بھی اردو میں اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

عام ہیں ان کے تو الطاف شہیدی سب پر | تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

یہی وہ عام فطرتِ انسانی سے مافوق باطنی استعداد ہوتی ہے جس کی وجہ سے انبیاء کے حواس عام انسانی حواس سے بہت زیادہ تیز اور ان کا شعور و ادراک دوسرے لوگوں کے شعور و ادراک سے کہیں زیادہ بلند اور اعلیٰ ہوتا ہے اب وہ خدا سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اسطوانۂ حنانہ کے گریہ کی آواز سن سکتا ہے کنکریوں کی تسبیح سے اس کے کان آشنا ہوتے ہیں اور وہ مسافت اور مکان و زمان کی حدود و قیود سے گذر کر اپنی آنکھ اور کان سے وہ سب کچھ دیکھ اور سن سکتا ہے جو دوسرے لوگ تو یہ تو حجاباتِ نظر و سمع کی وجہ سے دیکھ اور سن نہیں سکتے۔ حریم اسرارِ ازل کے محرمِ راز حضرت مولانا رومی فرماتے ہیں۔

فلسفی منکر شود در فکر و ظن | گو برو سر را بران دیوار زن!

نطقِ آب و نطقِ باد و نطقِ گل | ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل

فلسفی کو منکرِ حنانہ است | از حواسِ انبیا بیگانہ است

ایک اور نظریہ — شیخ الاشراق اور بعض دوسرے صوفیا و فلاسفۂ اسلام کا ایک نظریہ یہ ہے کہ کائنات ہستی تین عالموں کے مجموعہ کا نام ہے جن کو موالیدِ ثلاثہ کہا جاتا ہے یعنی جمادات، نباتات اور حیوانات ان ہی سے ہر عالم کی انتہا ایک ایسی نوع پر ہوتی ہے جس میں اپنے جنسی و نوعی خصائص کے ساتھ دوسرے عالم کے بعض خصائص بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً جمادات میں مونگا ایک ایسی چیز ہے

جس میں نباتات کی ایک خاصیت نشو ونما پائی جاتی ہے. اب ہم نباتات کو دیکھتے ہیں تو اس میں بھی ایک ترقی یافتہ نوع کھجور کی نظر آتی ہے جس میں حیوانات کی طرح تذکیر و تانیث کا فرق و امتیاز ہوتا ہے اور ان کے مذکر و مؤنث کے پیوند سے جس کو عربی میں تابیر کہتے ہیں کھجوریں پیدا ہوتی ہیں ہندوستان میں ارنڈ خربوزہ یا پپیتا اور آم کی بعض قسموں کے متعلق بھی یہی بیان کیا جاتا ہے پھر حیوانات کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ حیوان کی انتہا ایک ایسی قسم مثلاً بن مانس پر ہوتی ہے جس میں بعض انسانی خصایص پائے جاتے ہیں پس جس طرح خاص خاص جمادات میں نباتات کے اور خاص خاص نباتات میں حیوانات کے خصائص پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح نوع انسان میں بعض انسان ایسے پائے جاتے ہیں جن میں ملکوتی خصائص ہوتے ہیں پھر ان ملکوتی خصائص رکھنے میں بھی فرقِ مراتب ہوتا ہے. اب ہم کہتے ہیں کہ وہ انسان جس میں تمام ملکوتی الصفات انسانوں سے بڑھ کر ملکوتی خصایص و صفات پائے جائیں شریعت و مذہب کی اصطلاح میں وہی نبی کہلاتا ہے اس اہم خصوصیت کی وجہ سے نبی کے حواس باطنہ و ظاہرہ اس حواس میں ہی محدود نہیں ہوتے بلکہ ان کے علاوہ اس کو بعض ایسے حواس بھی عطا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اسے عالمِ مجردات کے ساتھ قریبی اتصال ہوتا ہے اس اتصال کے باعث وہ خدا کا کلام سن سکتا اور سمجھ سکتا ہے اور اس کی آنکھیں ایسے جلووں سے روشن ہوتی ہیں جن کی دید کی تابِ چشم ظاہر لا نہیں سکتی عارف باللہ مولانا رومی نے بھی مثنوی میں متعدد مواقع پر اس مضمون کو بیان کیا ہے. مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں۔

پنج حسے ہست جز ایں پنج حس	آں چو زرِّ سرخ و ایں حسہا چو مس
حسِ ابداں قوتِ ظلمت خورد	حسِ جاں از آفتابے می چرد
ہر کہ از حسِ خدا دید آیتے	در برِ حق داشت بہتر طاعتے

گر بدیدے حسّ حیوان شاہ را | پس بدیدے گاؤ و خر اللہ را
گر نبودے حسّ دیگر مرترا | جز حسّ حیواں ز بیرون ہوا
پس بنی آدم مکرم کے بُدے | کے بحسّ مشترک محرم شدے

جو لوگ مادیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور جن کی قوتِ فکر و نظر اس درجہ محدود ہے کہ وہ جسم اور مادہ کی حد بندیوں سے گذر کر روح اور عالمِ مجردات کی باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے ان کو تعجب ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا کسی اور نبی کو بشر ہونے کے باوصف ایسا کونسا مقام پیش ہی جس میں آپ حواس ظاہری سے بے تعلق ہو کر عالم الیقین و مشاہدہ کی حقیقتوں کو علیٰ وجہ البصیرت دریافت کر سکیں اور پھر انھیں محفوظ بھی کر لیں لیکن یہ لوگ اگر ذرا وسعتِ نظر سے کام لے کر اپنے احوالِ گرد و پیش کا جائزہ لیں اور زندگی کے بعض نادر اور اہم واقعات کا عمیق نظر سے مشاہدہ کریں تو انھیں اس دنیا میں ہی بعض مثالیں مل جائیں گی جن سے وحی والہام اور عالم مجردات سے تعلق کی نسبت ان کا استبعاد دور ہو سکتا ہے اور وہ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے حواس ظاہرہ و باطنہ کے علاوہ بھی خاص خاص لوگوں میں بعض ایسی خاص قوتیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ وہ بالکل حواس کی طرح اشیاء کو محسوس و معلوم کر سکتے ہیں۔

کم و بیش تین برس پہلے کی بات ہے، پنجاب کا ایک شخص خدا بخش نامی دہلی آیا تھا اور اس نے اپنے ایک عجیب و غریب باطنی کمال کا مظاہرہ نئی دہلی کے ایک مشہور و متمول سکھ کی کوٹھی پر کیا تھا اس مظاہرہ میں دہلی کے چند عمائد کے ساتھ اخبار اسٹیٹسمین کا نمایندہ بھی موجود تھا نمایندہ نے اپنے چشم دید واقعہ کے متعلق جو رپورٹ اخبار میں درج کرائی تھی۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

خدا بخش کی دونوں آنکھوں پر کپڑے کی ایک بہت موٹی پٹی باندھ دی گئی جس کے بعد کسی چیز کو دیکھنے کا امکان ہی نہ تھا اس کے بعد اس سے ایک ایسے کمرہ سے گذرنے کے لئے کہا گیا

Marfat.com

جس میں جابجا منتشر کرسیاں اور میزیں بغیر کسی ترتیب کے ڈالدی گئی تھیں۔ خدا بخش اسی حالت میں ایک بالکل تندرست بینا انسان کی طرح کرسیوں سے بچتا بچاتا کمرہ سے باہر نکل گیا اس کے بعد خدا بخش کے کہنے پر اس کو اردو اور انگریزی کے بعض اخبارات جن میں اخبار اسٹیٹسمن بھی تھا، پڑھنے کے لئے دیئے گئے اور مختلف جگہوں سے پڑھنے کے لئے کہا گیا شخص موصوف نے انھیں بھی صاف صاف بغیر کسی وقت و دشواری کے اس طرح پڑھ دیا کہ گویا اس کی آنکھوں اور اخبارات کے درمیان کوئی چیز حائل ہی نہیں ہے۔ کمال کا مظاہرہ کرنے کے بعد خدا بخش نے ایک تقریر کی جس میں اس نے بتایا کہ در اصل انسان کے دماغ میں آگے کی جانب بعض ایسے بہت ہی چھوٹے چھوٹے غدود ہیں جن سے اگر مشق و مہارت بہم پہونچائی جائے آنکھوں کا کام لیا جاسکتا ہے یہاں تک کہ اگر آنکھیں بالکل ضائع ہو جائیں اور قوت بینائی باقی نہ رہے تو انسان ان غدودوں کے ذریعہ چیزوں کو دیکھ سکتا اور کتاب وغیرہ پڑھ سکتا ہے۔ تقریر کے آخر میں خدا بخش نے کہا کہ میں نے سالہائے دراز کی مشق کے بعد یہ کمال حاصل کیا ہے لیکن میں اب بھی اس پر قانع نہیں ہوں میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھ کو اس قوت میں ابھی اور اضافہ کرنا ہے "

بعض واقعات ایسے بھی نظر سے گذرتے ہیں کہ انتہائی حیرت انگیز ہوتے ہیں آدمی ان کا مشاہدہ کرتا ہے، لیکن کوئی عقلی یا منطقی تعلیل و توجیہ نہیں کرسکتا۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین سانپ کے کاٹے کا ایک کامیاب عمل جانتے ہیں جس کا خود میں نے اپنے اکابر و احباب کے ساتھ متعدد بار عینی مشاہدہ کیا ہے۔ اس عمل کیلئے خود مار گزیدہ کا مولانا موصوف کے سامنے موجود ہونا شرط نہیں ہے وہ خواہ کتنے ہی فاصلہ پر ہو کوئی مضائقہ نہیں۔ مولانا کو جو شخص اس واقعہ کی اطلاع دے گا وہ اسے فوراً تھوڑا پانی کچھ

پڑھ کے اور دم کرکے پلائیں گے خدا کی شان ادھر پانی کا گھونٹ اس مخبر کے حلق سے نیچے اتریگا اور ادھر مارگزیدہ سے زہر کا اثر کم ہونے لگے گا یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے بعد بالکل جاتا رہیگا۔

اب ان واقعات پر غور کرو اور بتاؤ کہ وہ لوگ جنھوں نے اپنی آنکھ سے ان کا مشاہدہ کیا ہی کیا وہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو درست ماننے میں تامل کرینگے ہرگز نہیں تو پھر وہ کوئی ان واقعات وحقائق کی منطقی وعقلی توجیہ وتاویل بھی کرسکتے ہیں؟ بالکل نہیں بلکہ دیکھنے والوں کو اس بات کا یقین ہو جاتا ہی کہ بعض بعض انسانوں میں غیر معمولی ذہانت وذکاوت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان سے ایسے عجیب وغریب اور محیر العقول کارنامے سرزد ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر ہم فرط حیرت واستعجاب سے انگشت بدنداں تو ہوسکتے ہیں مگر اس کو سمجھ نہیں سکتے اسی طرح مارگزیدہ کے عمل کو دیکھ کر اس بات کا تو یقین ہو جاتا ہے کہ دواؤں اور جڑی بوٹیوں کی طرح بعض الفاظ و کلمات میں بھی ایسا اثر ہوتا ہی کہ وہ زہر کا اثر اتار دیتے ہیں لیکن یہ کیونکر؟ اور کس طرح؟ اور انھیں الفاظ کی یہ خصوصیت کیوں ہی؟ دوسرے لفظوں میں یہ اثر کیوں نہیں پایا جاتا؟ اور اچھا لفظوں میں تریاقی اثر ہی تو ہوا کرے آخر یہ کیا معاملہ ہے کہ ان الفاظ کا دم کیا ہوا پانی پیتا ہے ایک بالکل غیر متعلق شخص جس نے آکر خبر دی ہے اور اچھا ہو جاتا ہے مارگزیدہ یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا اور انسان کے لیے بجز اس کے کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ اپنی عقل وفہم کی نارسائی کا اقرار کرے اور جو کچھ دیکھ رہا ہے یا جس کو معتبر اور سچے راویوں سے سنا ہے اس کے ہونے کا یقین کرے کتنی ہی عجیب وغریب خبریں ہیں جن کو آپ روزنامہ اخباروں اور رسالوں میں پڑھتے ہیں اور ان کو محض اس بنا پہ سچ مان لیتے ہیں کہ کسی معتمد اخبار کے نامہ نگار نے ان کو بیان کیا ہی یا چند امریکہ اور یورپ کے ڈاکٹروں نے ان کا ذاتی طور پہ تجربہ کیا ہے۔

نظر کو ذرا وسیع کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ صفات وخصائص کا یہ فرق وامتیاز انسانوں

تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اتحادِ جنسی و نوعی کے باوجود ایک نوع کے مختلف افراد میں ہی بعض انفرادی خصوصیات کے باعث اتنا عظیم الشان فرق پایا جاتا ہے کہ ان پر مختلف الانواع سے تعلق رکھنے کا شبہ ہوتا ہے مٹی اور پتھر اور لعل و یاقوت سب جمادات ہیں مگر ایک تاج سلطانی اور قبائے شاہی کی زینت بنتا ہے اور دوسرا کم ارز ہونے کی وجہ سے انسانوں اور چوپایوں کے قدموں سے ٹھکرایا جاتا ہے پھر لعل اور یاقوت بھی سب ایک طرح کے نہیں ہوتے بعض لعل ایسے ہوتے ہیں کہ بیش بہا بلکہ بے بہا ہونے کے باعث بڑی سے بڑی سلطنت کے خزانہ کے لئے سرمایۂ فخر و ناز ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے لعل گنتی میں دو تین سے زیادہ نہیں ہوتے اور ان کے بالمقابل دوسرے لعل ایسے ہوتے ہیں جن کو صورت و شکل اور رنگ میں یکساں ہونے کے باوجود ہر متمول اور صاحب ثروت انسان کی جیب خرید سکتی ہے۔ خوب اچھی طرح غور کرو، لعل و عقیق اور زمرد و گوہر کیا ہیں؟ پتھر ہی تو ہیں مگر پھر یہ کیا ہے کہ ایک پتھر پتھر ہی رہا دوسرے پتھر کو آفتاب کی شعاعوں نے اپنے مسلسل عملِ تربیت سے لعلِ درخشاں اور یاقوتِ تاباں بنا دیا حالانکہ آفتاب کی شعاعیں دونوں پر یکساں ہی پڑتی ہیں جس کو تم آئینہ کہتے ہو کیا اس کی حقیقت لوہے سے کچھ مختلف ہے؟ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ صناع کے دستِ مہارت نے لوہے کے ایک ٹکڑے کو صاف و شفاف روشن آئینہ بنا دیا جو سورج کی شعاعوں کو اپنے سینہ میں جذب کر کے اپنے مقابل کی چیز پر عکس فگن ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس دوسرا لوہا وہی لوہا ہا جو دستِ آہنگر سے آگ کی بھٹی میں جلتا ہے اور پھر سوہان پر ہتھوڑے کی ضرب کھاتا ہے۔ پھول پھول سب برابر ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ ایک پھول اپنی جاں نواز خوشبو سے قلب و دماغ میں عطر کی لہریں دوڑا دیتا ہے اور اس بنا پر کسی کے کاکلِ عنبر آگیں کی زینت یا کسی کی دستارِ عزت و افتخار کی رونق بنتا ہے اور دوسرے پھول اس سے کم یا بالکل خوشبو نہ رکھنے کے باعث جس ٹہنی پر اپنی آنکھ کھولتے ہیں بالآخر اسی پر بادِ

Marfat.com

خزاں کے جھونکے کی تاب نہ لاکر فنا ہو جاتے ہیں یہ سب چیزیں تو خیر پھر بھی جواہر یعنی قائم بالذات ہیں الفاظ تو اعراض ہی ہیں آپ نے سانپ کے عمل کا حال پڑھ کر اندازہ کر لیا ہوگا کہ خود ان میں بھی حیثیت ملفوظیت میں برابر ہونے کے باوجود کتنا عظیم الشان فرق و امتیاز ہوتا ہے۔

پس جب آپ عالم ہست و بود کی متحد النوع اشیا میں صفات و خصائص انفرادی کے باعث اتنا اختلاف پاتے ہیں تو پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ انسانوں میں ایک انسان اپنے غیر معمولی قوئ باطنیہ یا کسی ایک خاص قوت کی زیادتی کی وجہ سے عام انسانوں کے برخلاف خدا سے شرفِ ہم کلامی حاصل کرے جس طرح سالہائے دراز کے بعد آفتاب کا فیضِ اثر ایک معمولی سے پتھر کو لعل و عقیق کی شکل میں تبدیل کر کے اسے کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے اسی طرح یقین کرو خورشیدِ حقیقت کے انوار و تجلیات جب اپنے مخصوص فیضان واثر کے لئے کسی خوش نصیب انسان کو چن لیتے ہیں تو پھر وہ دنیا میں نبی بن کر ظاہر ہوتا ہے اور اس سے ایسے معجزے صادر ہوتے ہیں جن کو دوسرے لوگ نہیں کر سکتے اور جس طرح لعل و عقیق روز روز نہیں پیدا ہوتے اسی طرح انبیاء کرام بھی کبھی کبھی مبعوث ہوتے رہے ہیں۔

سالہا باید کہ تا یک سنگِ اصلی ز آفتاب   لعل باشد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

اور اب چونکہ ہمارے اعتقاد میں معدنِ ہستی کا وہ "کوہ نور" ہیرا جو یوم الست سے ذات احدیت کے آفتاب عالم تاب کی آغوش مشیت میں تربیت پا رہا تھا اور جس کی آمدِ موعود کے انتظار میں کائنات عالم کا ذرہ ذرہ شب و روز کی ایک ایک ساعت بڑی بے چینی اور اضطراب سے گن رہا تھا اس جہانِ آب و گِل میں جلوہ فروز ہو کر دنیائے اخلاق و انسانیت کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ کو منور کر چکا اس لئے اب آیندہ اس نوع کا کوئی گوہر گراں مایہ (نبی) دنیا میں نہیں آئے گا۔ البتہ ہاں اس سے کم درجہ کے جواہر ہر زمانہ میں موجود رہیں گے اور اس ہیرے کی قائم مقامی کا فرض انجام دیتے رہیں گے

Marfat.com

نبی کی بشریت | یہاں تک نبی کی اس قوت کا ذکر تھا جس کے ذریعہ وہ خدا کا کلام سن سکتا اور سمجھ سکتا ہے اب ہم نبی کی پیغمبرانہ حیثیت پر ایک دوسرے پہلو سے بحث کرتے ہیں۔

چونکہ نبی اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان خدمتِ سفارت و رسالت انجام دینے کے لئے آتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس میں ملکۂ نبوت اور استعدادِ وحی کے ساتھ بشریت بھی پائی جائے تاکہ وہ ملکۂ نبوت کے ذریعہ خدا کا کلام سنے اور بشر ہونے کی وجہ سے عام انسانوں تک اس پیغام و کلام کو پہونچا سکے اور اپنے عمل و قول سے اس کی تشریح و تفہیم بھی کر سکے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرآن میں ارشاد ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا (انعام)	اور اگر ہم فرشتہ کو پیغمبر بناتے تو اسے بھی آدمی کی ہی شکل میں بھیجتے۔

قاضی بیضاوی نے اس مسئلہ کی توضیح ایک نہایت عمدہ مثال سے کی ہے۔ آیت وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں

الا ترى ان الانبياء لما فاقت	کیا تم نہیں دیکھتے کہ چونکہ انبیاء کی قوت فائق
قوتهم واشتعلت قريحتهم	اور ان کی طبیعت اس درجہ روشن ہوتی ہے کہ
بحيث يكاد زيتها يضيء ولو لم	گویا زیتون کا تیل آگ چھوئے بغیر خود بخود روشن
تمسسه نار ارسل اليهم	ہے اس لئے خدا ان کے پاس فرشتے بھیجتا ہے
الملائكة ومن منهم على	اور جو زیادہ اونچے مرتبے والے ہوتے ہیں ان
رتبة كلمه بلا واسطة كما	سے بیواسطہ کلام کرتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ
كلم موسى عليه السلام فى الميقات	سے میقات میں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے
ومحمدا صلى الله عليه وسلم	شب معراج میں کیا، طبیعات میں اس کی نظیر

ليلة المعراج ونظير ذالك في	یہ ہے کہ چونکہ تباعد کی وجہ سے ہڈی گوشت
الطبيعة ان العظم لما عجز عن	سے غذا قبول نہیں کر سکتی اس لئے اللہ نے
قبول الغذاء من اللحم لما بينهما	اپنی حکمت سے ان دونوں (گوشت اور ہڈی)
من التباعد جعل الباري	کے درمیان چپنی ہڈی پیدا کر دی
تعالى بحكمته بينهما الغضروف	جو دونوں سے مناسبت رکھتی ہے تاکہ وہ غذا
المناسب لهما لياخذ من هذا	اس سے لے اور اس کو دے
ويعطي ذالك	

غرض یہ ہے کہ انبیاء کرام میں جسمانیت اور روحانیت کا ایسا پاکیزہ امتزاج ہوتا ہے کہ ایک طرف وہ بشر ہوتے ہیں اور دوسری جانب ان کی رسائی حظیرۃ القدس کے اس مقام جلیل و عظیم تک ہوتی ہے جہاں جانے کا حوصلہ جبریل امین کو بھی نہیں ہوتا

اگر یک سر موئے برتر پرم! فروغ تجلی بسوزد پرم!

اس بنا پر صرف انبیاء ہی اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان سفارت و رسالت کی خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ عام انسانوں کی طرح فرشتے بھی اس خدمت کو ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

Marfat.com

وحی اور محققین یورپ

اہلِ مغرب تمام مذہبی قوموں کی طرح سولہویں صدی تک وحی کے قائل رہے کیونکہ ان کی کتابیں انبیاء کے حالات وواقعات سے پُر تھیں جب سائنس کا دور شروع ہوا اور روحانیت سے ہٹ کر لوگوں کی توجہ مادیات کی طرف زیادہ ہوگئی تو پھر فلسفۂ مغرب نے اعلان کیا کہ وحی کا مسئلہ بھی ان پرانے خرافات میں سے ہے جو جہالت ونادانی اور وہم پرستی کے باعث انسانوں کے قلب ودماغ پر اب تک مسلط رہے ہیں اس فلسفہ نے مابعد الطبیعی حقائق کے انکار میں اس درجہ غلو کیا کہ سرے سے خدا اور روح کا ہی انکار کر دیا اس سلسلہ میں وحی کی نسبت کہا گیا کہ یہ یا تو نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کی اختراع ہے جو انھوں نے لوگوں کی توجہات کو اپنی طرف مائل وراغب کرنے کے لئے اختیار کر لی ہے اور یا کسی قسم کا ہذیان ہے جو بعض اعصاب کے مریضوں کو لاحق ہو جاتا ہے اس بنا پر ان کو بعض چیزوں کی صورتیں متمثل نظر آتی ہیں حالانکہ حقیقت میں ان کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی۔

فلسفۂ یورپ نے وحی اور دوسری مابعد الطبیعی چیزوں کی نسبت اپنے اس نظریہ کا اس زور وشور سے پروپیگنڈا کیا کہ یہ نظریہ فلسفہ کا ایک مستقل عقیدہ بن گیا اور ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو عالم یا تعلیم یافتہ کہلانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نظریہ کا قائل ہونا ضروری ہو گیا۔

لیکن ۱۸۴۶ء میں امریکہ میں وجودِ روح کے آثار وعلامات نظر آئے جنھوں نے امریکہ سے گذر کر تمام یورپ کے خیالات میں تموّج پیدا کر دیا اور لوگوں کو ایسے عالم روحانی کے وجود کا اقرار

کرنا پڑا جس میں بڑی بڑی عقلیں اور روشن افکار آبادہیں تو اب مسائل روحانیہ میں بحث وفکر کا نقطۂ نظر بھی بدل گیا اور وحی کا مسئلہ ازسرِ نو زندہ ہو گیا علماء نے اس مسئلہ پر پھر بحث شروع کر دی لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان کی یہ بحث کسی مذہبی جذبہ پر نہیں بلکہ علم تجربی کے قواعد پر قائم تھی اس بنا پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے اگر وہ وحی کے باب میں ان نتائج و افکار تک نہیں پہونچ سکے جو علماء اسلام کے نزدیک مسلم ہیں تاہم علماء مغرب کی تحقیق و تفتیش اور اس کے نتائج و استنباطات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ وحی کو ہذیان محض یا وہم وگمان سمجھتے تھے آخر کار ان کو بھی اسکی واقعیت وصداقت کا اقرار کرنا پڑا ہم صرف یہی فرق دکھانے کے لئے ذیل میں علماء مغرب کے افکار و نظریات مختصراً قلمبند کرتے ہیں ممکن ہے اس سے منکرینِ وحی کو کچھ تنبہ ہو اور وہ اپنے اصرار پر نظر ثانی کرنے کی زحمت گوارا کریں۔

مجالس تحقیق یورپ میں روح اور اس کے اثرات کی تحقیق کی طرف بعض علماء کو توجہ ہوئی اور انھوں نے اپنے نتائج فکر شائع کئے تو تمام فضا میں ایک آگ سی لگ گئی بمقام لندن سنہ ۱۸۸۲ء میں ایک کمیٹی بنی جس کا مقصد نفس اور اس کے متعلقات پر بحث کرنا اور ان کی تحقیق و جستجو کرنا تھا اس کمیٹی میں جو علماء و اساتذہ شریک تھے ان میں قابلِ ذکر اور نمایاں تر یہ حضرات تھے۔

(۱) پروفیسر جیک کیمبرج یونیورسٹی	صدر کمیٹی انگلستان کا مشہور عالم طبعیات
(۲) پروفیسر سر اولیفر لودگ	علم طبعیات کا ماہر خصوصی
(۳) سر ولیم کروکس	انگلستان کا مشہور عالم کیمسٹری
(۴) پروفیسر فریڈرک مائرس	کیمبرج یونیورسٹی
(۵) پروفیسر ہڈسن	〃
(۶) پروفیسر ولیم جمیس ہرفورڈ یونیورسٹی امریکہ	

Marfat.com

(۷) پروفیسر بلیز لوب — کولمبیا یونیورسٹی

(۸) کامیل فلامریون — فرانس کا ماہر مشہور فلکیات وریاضیات

ان کے علاوہ یورپ کے مشہور علمار گارنے باریٹ اور بوڈمور بھی اس کمیٹی میں شریک تھے یہ کمیٹی تقریباً بتیس سال تک قائم رہی اس مدت میں اس نے ہزاروں روحانی واقعات وحوادث کی تحقیق کی اور نفسِ انسانی اس کے قویٰ اور قوت ادراک سی متعلق بار بار تجربے کئے جو چالیس ضخیم جلدوں میں مدون ومحفوظ ہیں۔ اس کمیٹی نے اپنے نتائجِ فکر کی اشاعت کی تو انھوں سنے ثابت کیا کہ انسان کے لئے ایک اور شخصیت بھی ہی یعنی ہم اپنی موجودہ زندگی میں زندہ ہیں اور ادراک کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ ادراک ان تمام روحانی قوتوں کی وجہ سے نہیں ہوتا جو ہمارے اندر موجود ہیں بلکہ ان روحانی قوتوں کے کسی ایک جزء سے ہوتا ہی جس کا اثر حواسِ خمسہ کے افعال کے ذریعہ ظاہر ہوتا رہتا ہے لیکن جو زندگی کہ ہم کو یہ حواس بخشتے ہیں اس سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کر ایک اور زندگی ہے جس کی عظمت وجلالت کی کوئی نشانی اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی جب تک کہ ہماری یہ ظاہری شخصیت نیند یا کسی اور ذریعہ سے معطل نہ ہو جائے چنانچہ ہم نے ان لوگوں پر جن کو مقناطیسی نیند کے ذریعہ سلادیا گیا تھا۔ تجربہ کر کے دیکھا کہ سونے والے کو روحانی زندگی کی دولتِ فراواں حاصل ہوتی ہے اور وہ اس عالم میں اپنے حواسِ ظاہری کے علاوہ کسی اور حاسہ کے ذریعہ دیکھتا اور سنتا ہی۔ بعید چیزوں کی خبریں دیتا ہے اور اس وقت اس کی قوتِ تعقل وادراک پورے طور پر بیدار ہو کر اپنا کام کرتی رہتی ہی۔

کمیٹی کے نزدیک یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی کہ انسان کی ظاہری شخصیت کے علاوہ ایک اور شخصیت ہی جو پہلی شخصیت سی کہیں زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہی۔ ان علماء نے یہ بھی معلوم کیا کہ یہی وہ اعلی شخصیت ہی جس کے ذریعہ رحم میں جسم کا تکوّن ہوتا ہی اور جگر قلب اور معدہ وغیرہ

عضا جن پر انسان کے ارادہ کو کوئی دسترس حاصل نہیں ہے ان کی حرکت بھی اسی اعلیٰ شخصیت
ں وجہ سے ہوتی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ انسان کا انسان ہونا اسی شخصیتِ ظاہرہ پر نہیں جس کا قیام
واس خمسہ ظاہرہ کے ساتھ ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جو جسم کے کثیف پردوں کے درمیان
سے عمدہ عمدہ خیالات پیدا کرتی ہے الہامات طیبہ کا تعلق بھی اسی سے ہے اور یہی وہ قوت ہے
انبیاء کے قلب میں ان چیزوں کا القاء کرتی ہے جن کو اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی کہتے
یں پھر کبھی یہی وحی متجسم ہو کر نظر آتی ہے تو اس کو اللہ کے فرشتے کہتے ہیں جو آسمان سے نازل ہوتے ہیں

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ علماء مغرب وحی کی جو حقیقت بیان کرتے ہیں وہ بعینہ وہ نہیں ہے
علماء اسلام نے بیان کی ہے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ روح اور وحی والہام کے تصور کو کھلی ہوئی گمراہی اور ان کے
تقاد کو وہم پرستی کہنے والے یورپ کے علماء محققین بھی عرصہ دراز کے غور و خوض کے بعد کس طرح ان چیزوں کی
قعیت کے قائل ہو گئے اور اگرچہ انھوں نے ان چیزوں کی اصلی حقیقت کے بیان کرنے میں اسلامی نقطۂ نظر
سے چند در چند غلطیاں کی ہیں لیکن پھر بھی حیرت کی بات ہے کہ ان علماء نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ بعض
ماء اسلام کے بیانات سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے اوپر جو تقریر نقل کی گئی ہے ایک طرف تم اسے پڑھو اور دوسری
انب امام غزالی کی تقریر ذیل پر غور کرو جو انھوں نے وجود کی تین قسمیں وجود حسی۔ وجود عقلی اور وجود خیالی
یان کرنے کے بعد آخری قسم وجود خیالی کی تشریح میں کی اور پھر دیکھو کہ امام صاحب کی یہ تقریر اور محققین یورپ
ے نتائجِ فکر کس قدر ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں امام صاحب فرماتے ہیں۔

"وجود خیالی یہ ہے کہ زبانِ حال تمثیلی رنگ میں محسوس اور مشاہد بن کر سامنے آئے اور یہ خاص انبیاءؑ
ر پیغمبروں کی شان ہے اس کی مثال خواب کی ہے جس طرح خواب میں زبانِ حال پیغمبروں کے علاوہ عام آدمیوں
بھی تمثیلی رنگ میں نظر آتی ہے اور وہ آوازیں سنتے ہیں مثلاً کوئی خواب دیکھتا ہے کہ اونٹ اس سے باتیں
ر رہا ہے یا گھوڑا اس کو خطاب کر رہا ہے یا کوئی مردہ اس کو کچھ دے رہا ہے (بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۲ پر)

ان علما محققین کی رائے ہے کہ یہ شخصیت باطنہ حس کے ذریعہ مدرک ہوتی ہے کیونکہ
ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ مقناطیسی نیند سوتے ہیں ان میں پسندیدہ عقل روشن فکر نظر دور
رس نفوس کے پوشیدہ اسرار میں اثر و نفوذ مخفی باتوں کو معلوم کر لینے کی صلاحیت و
قابلیت اور اپنی حالتِ ظاہرہ کے اعتبار سے جاہل غبی ہونے کے باعث دنیا کے وسیع اقطار
واکناف میں سفر یہ تمام چیزیں اس بات کی سب سے قوی دلیل ہیں کہ انسان کے لئے ایک ایسی
(باطنی) شخصیت پائی جاتی ہے جو جسمانی حیات کے پردوں میں مستور رہتی ہے اور وہ اسی وقت
ظاہر ہوتی ہے جب کہ اس کا جسم طبیعی یا صناعی نیند میں مصروف ہو۔

پھر رویاء صحیحہ بھی جو صبحِ روشن کی طرح وقوع پذیر ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ انسان غیبی
امور کو دریافت کر لیتا ہے یا جس میں وہ بعض اوقات ایسے ایسے مشکل مسائل حل کر لیتا ہے جنھیں
وہ بیداری کی حالت میں حل نہیں کر سکتا تھا یا جس میں بعض اوقات وہ ایسے اعمال کر گذرتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱) یا اس کا ہاتھ پکڑ رہا ہے یا اس سے چھینتا ہے یا یہ دیکھے کہ اس کا ناخن شیر ہو گیا ہے یا اسی قسم کی
صورتیں جن کو لوگ خواب میں دیکھا کرتے ہیں انبیاء علیہم السلام کو یہ چیزیں بیداری میں نظر آتی ہیں اور اسی
بیداری کی حالت میں یہ چیزیں ان سے خطاب کرتی ہیں ایک جاگتا ہوا آدمی جس کو یہ چیزیں نظر آتی ہیں
اور محسوس ہوتی ہیں وہ اس بات میں کچھ فرق نہیں کر سکتا کہ یہ خیالی گویائی ہے یا خارجی اور حسی ہے خواب دیکھنے
والے کو تو یہ فرق اس لئے محسوس ہو جاتا ہے کہ وہ جاگ اٹھتا ہے اور خواب و بیداری دونوں کی حالتوں میں
وہ فرق محسوس کرتا ہے۔ جن لوگوں کو ولایت تامہ حاصل ہوتی ہے ان کو یہ تمثیلی رنگ تنہا نظر نہیں آتا بلکہ اس کا
اثر عام حاضرین پر بھی پڑتا ہے اس کی ولایت اپنے فیض کی شعاعیں ان پر ڈالتی ہے اور وہ بھی وہی دیکھتے ہیں جو
صاحب ولایت کو نظر آتا ہے اور وہی سنتے ہیں جو صاحب ولایت کو سنائی دیتا ہے۔

(مضمون یہ علی عبداللہ صفحہ ۱۹ مطبوعہ مصر بحوالہ سیرۃ النبی ج ۳ ص ۳۰)

Marfat.com

جن کی بحالت بیداری وہ کبھی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا اس بات کی دلیل ہو کہ انسان کے لئے اس کی ظاہری شخصیت کے علاوہ ایک اور باطنی شخصیت ہی جو پہلی سی کہیں زیادہ بلند اور ترقی یافتہ ہی

ان استدلات کے علاوہ اور بھی متعدد امور ہیں جن کا اس تحقیقاتی انجمن نے نہایت دقیقہ رسی سی عمیق مطالعہ کیا پھر ساتھ ہی ان تجربوں کا جائزہ لیا جو ان سے پہلے کئے جا چکے تھے۔ اور آخر کار انھوں نے عالم روح اور اس کے لطائف و مزایا کا کھلے دل سی اقرار کر لیا۔ اس سلسلہ میں کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور ماہر علم النفس پروفیسر ڈاکٹر مائرس (Myers) نے جو اس انجمن کے بھی رکن خصوصی تھے انسانی شخصیت (Human Personality) پر ایک نہایت قابل قدر کتاب لکھی ہے جس کے متعدد ابواب ہیں مقناطیسی نیند عبقریت وحی اور شخصیت باطنیہ پر سیر حاصل بحث کی ہی ہم ذیل میں چند اقتباسات کتاب مذکور کے صفحہ ۷۷ اور اس کے بعد کے صفحات سے نقل کرتے ہیں۔

پروفیسر مائرس نے سب سے پہلے ان ریاضی دانوں کا ذکر کیا ہی جو مشکل سی مشکل مسائل ریاضی کا درست حل فوراً بغیر کسی غور و فکر کے معلوم کر سکتے ہیں پھر لطف یہ ہی کہ اگر ان سی پوچھا جائے کہ تمہیں یہ جواب کیوں کر معلوم ہوا تو وہ بجز اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں معلوم نہیں اس سلسلہ میں پروفیسر موصوف نے بیدلر نامی ایک شخص کا ذکر کیا ہی جو بڑے سے بڑے عدد کے متعلق یہ بتا سکتا تھا کہ وہ کن اعداد کی ضرب سی حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ اس سے پوچھا گیا کہ وہ کیا کیا اعداد ہیں جن کو ضرب دیا جائے تو ۱۷۸۶۱ کا عدد حاصل ہو جائے تو اس نے غور و تامل کے بغیر فوراً کہا کہ ۳۳۷ کو ۵۳ میں ضرب دیا جائے تو نتیجہ میں یہ عدد پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس سی پوچھا گیا کہ کس قاعدہ اور حساب سے اس نے کہا میں اس سے واقف نہیں گویا اس کا یہ جواب ایک طرح کا طبعی اقتضا تھا جس میں انسان کے ارادہ اور فہم کو دخل نہیں ہوتا۔

مسٹر سکرپٹشر نے مطران واٹلی سے نقل کیا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ خود اپنی نسبت بیان کیا کہ جب میں پانچ چھ برس کی عمر کا تھا تو میں جمع و تفریق کے سوالات کسی کاغذ پر لکھے بغیر زبانی ہی بہت جلد حل کر دیا کرتا تھا میری یہ حالت تین سال تک رہی مگر تعجب کی بات ہے کہ جب میں بڑا ہوا اور اسکول میں داخل ہو کر باقاعدہ ریاضی کا پڑھنا شروع کر دیا تو میرا یہ خصوصی امتیاز ریاضیات کے ساتھ طبعی مناسبت و فراست تدریجی طور پر کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اب میں ریاضی کا ایک بہت ہی کمزور طالب علم ہوں، اس موقع پر ایک اور واقعہ کا ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا جو مولانا عبدالباری ندوی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

"تریکون متی (Trignomety) یا مساحۃ المثلثات وغیرہ ریاضیاتِ عالیہ کی وہ شاخیں ہیں جن کی کالجوں میں ریاضیات کے اعلیٰ مدارج میں تعلیم دی جاتی ہے، ۱۰، ۱۱ برس کے بچے جو علی العموم زیادہ سے زیادہ سکول کی چوتھی پانچویں جماعت میں پڑھتے ہیں ان کی ریاضی دانی بس حساب کے چند ابتدائی قواعد تک محدود ہوتی ہے، جو لڑکے غیر معمولی طور پر ذہین و محنتی ہوتے ہیں اور جن کی تعلیم کا گھر پر معلم رکھ کر کچھ خاص اہتمام کیا جاتا ہے وہ بہت ترقی کرتے ہیں تو ۱۳-۱۴ برس کی عمر میں اسکول کی تعلیم پوری کر لیتے ہیں۔

لیکن گذشتہ سال اکتوبر میں (۷ اکتا ر۔ لیڈر اخبار) راج نرائن نامی ۱۱ برس کے ایک مدراسی لڑکے کا معجزہ ریاضیات (اسی عنوان سے) یہ چھپا تھا کہ اس نے بلا کسی معلم کی مدد کے اعلیٰ الجبرا، تریکون متی، تحلیلی اقلیدس (جومیٹری) وغیرہ از خود حاصل کی ہے (سیرۃ النبی ج ۳ ص ۱۳۹)

پروفیسر مائرس نے "الہامی طور پر" ریاضی جاننے والوں کا تذکرہ کرنے کے بعد چند شعراء اور دوسرے لوگوں کا ذکر کیا ہے اور بعض خواب کے عجیب و غریب واقعات بیان کئے ہیں، اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

Marfat.com

"میں یقین کرتا ہوں کہ اس قسم کے واقعات دنیا میں پہلی مرتبہ ہی ظاہر نہیں ہوئے بلکہ اس سے پہلے بھی لوگوں کے علم میں آچکے ہیں یہ سب ہمارے شعور باطنی کے کرشمے ہیں جو ہر دور اور ہر زمانہ میں موجود رہتا ہے" پھر آخر میں کہتے ہیں۔

"اب میں پورے وثوق اور جزم واذعان کے ساتھ کہتا ہوں کہ انسان میں ایک روح کا وجود یقینی ہے جو اپنے لئے قوت اور جمال کا اکتساب عالم روحانی سے کرتی ہے اور ساتھ ہی میں اس بات کا بھی یقین رکھتا ہوں کہ تمام عالم میں ایک روح کبیر سرایت کئے ہوئے ہے جس کے ساتھ انسانی روح کو اتصال حاصل ہو سکتا ہے"

اپنی اس تحقیق کے ساتھ ہی مائرس نے فرانس کے مشہور پروفیسر ریبو سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ "انسان کی باطنی شخصیت ہی وہ چیز ہے جس کو عام لوگ وحی کہتے ہیں، اس حالت کے لئے طبعی صفات وخصائص ہیں جو اس کے ساتھ ہی مختص ہیں، یہ باطنی شخصیت ہر چیز سے مقدم ہے اور یہ نہ کسی شخص کے سامنے جھکتی ہے اور نہ انسانی ارادہ کے تابع ہے جس وقت یہ عمل کرتی ہے تو اس طرح کرتی ہے کہ گویا وہ انسان کی کوئی صفتِ غریزیہ وفطریہ ہے اس باطنی شخصیت سے مدد طلب کی جاسکتی ہے لیکن اس پر کوئی جبر نہیں کیا جاسکتا"[1]

علامہ فرید وجدی نے دائرۃ المعارف کی جلد رابع میں لفظ روح کے ماتحت ایک نہایت مبسوط ومفصل اور جامع مقالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے اسپرٹزم (روحانیت) کی تاریخ محققین یورپ وامریکہ کی تحقیقاتی انجمنیں۔ ان انجمنوں کی رپورٹیں، مشہور محققین کے جستہ جستہ اقوال بیان کئے ہیں اور اسی سلسلہ میں انھوں نے سینتالیس علماء تحقیق کے ناموں کی ایک منتخب فہرست دی ہے جو روح کے وجود اور اس کے لطائف ومزایا کا حتمی طور پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا مختصر تذکرہ بھی طوالت

---

[1] اس حصہ کی اکثر معلومات دائرۃ المعارف فرید وجدی کی جلد ۲ لفظ وحی سے ماخوذ ہیں۔

Marfat.com

باعث ہوگا۔اس لئے آخر میں ہم صرف رسل ویلز کی شہادت پر اکتفا کرتے ہیں جو اس نے روح اور اس کے عجائبات کے باب میں قلم بند کی ہے، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ رسل ویلز طبیعیات میں ڈارون کا ہم پلہ اور اس کا شریک خیال کیا جاتا ہے، اس نے عجائباتِ روح پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ ان الفاظ میں برملا اعتراف کرتا ہے۔

"میں کھلا ہوا دہریہ اور مادہ پرست تھا۔میرے ذہن میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ میں کسی وقت روحانی زندگی کا اظہار کروں گا یا مادہ اور اس کی قوت کے سوا ایسے وجود کی تصدیق کروں گا جو اس دنیا میں کارفرما ہے مگر میں کیا کروں میں نے پے بہ پے ایسے محسوس مشاہدات کئے جن کو نہیں جھٹلایا جا سکتا تھا۔انھوں نے مجھ کو مجبور کر دیا کہ میں ان چیزوں کو حقیقی اور واقعی تسلیم کروں اگرچہ ایک مدت تک میں یہ تسلیم نہیں کرتا تھا کہ یہ آثار روح سے سرزد ہوتے ہیں، لیکن ان مشاہدات نے رفتہ رفتہ میری عقل کو متاثر کرنا شروع کر دیا، نہ بطریقِ استدلال وحجت، بلکہ یہ مشاہدات کے پیہم تواتر کا اثر تھا جس سے میں بجز روح کے اعتراف کے کسی اور طریقہ سے بچ ہی نہیں سکتا تھا۔"

یورپ کے اساتذۂ علوم جدیدہ نے روح کے متعلق جو تحقیقات کی ہیں ان سے وہ ان نتائج پر پہونچے ہیں جو کیمل فلامریان کے نزدیک حسب ذیل ہیں۔

(۱) روح جسم سے جداگانہ ایک وجودِ مستقل رکھتی ہے۔

(۲) روح میں اس قسم کی خاصیتیں ہیں جو اب تک علوم جدیدہ کی رو سے غیر معلوم تھیں

(۳) روح حواس کی وساطت کے بغیر متاثر ہو سکتی ہے یا دوسری چیز پر اپنا اثر ڈال سکتی ہے

(۴) روح آئندہ واقعات سے واقف ہو سکتی ہے۔

پھر اس روشنی میں وحی کی نسبت ان علماء کا جو خیال ہو وہ یہ ہے کہ وحی دراصل روح

Marfat.com

انسانی پر ایک خاص قسم کی تجلی کا نام ہے جو اس پر اس کی شخصیت باطنہ کے ذریعہ ضو فگن ہوتی ہے اور اس کو وہ باتیں سکھاتی ہے جنھیں وہ پہلے سے نہیں جانتا تھا اور اس کو ایسے امور کی طرف ہدایت دیتی ہے جن میں خود اس کی بھلائی اور اس کی امت کی ترقی کا راز پنہاں ہوتا ہے۔[1]

وحی کے باب میں علماء اسلام اور ان علماء یورپ میں اتنی بات تو مشترک ہے کہ وحی کا تعلق جسم یا کسی جسمانی طاقت سے نہیں بلکہ روح سے ہے اور یہ انسان کے ارادہ کے تابع نہیں۔ البتہ یہ امر مختلف فیہ ہے کہ اسلام میں وحی فرشتہ کے ذریعہ نبی کے قلب پر اترتی ہے اور ان لوگوں کے نزدیک جس کو فرشتہ کہتے ہیں وہ در اصل انسان کی ہی شخصیت باطنہ ہے جو متشکّل ہو کر اس کے سامنے آجاتی ہے۔ لیکن یہ بھی کیا کم ہے کہ ان لوگوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ ایک روحِ اعظم ہے جو تمام کائنات میں ساری ہے اور انسانوں کی خاص خاص ارواح کو اس کے ساتھ ایک ایسا علاقہ ہوتا ہے جس کے باعث اس سے خارقِ عادات امور صادر ہوتے ہیں اور اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔ پھر یہ علاقہ کی کمی بیشی کا دار و مدار انسانی روح کی ذاتی استعداد پر ہے۔

اب ذرا غور کیجیے کہ ان محققینِ یورپ کے الفاظ میں خدا کا اور جبرئیل امین کا کہیں نام نہیں آیا ہے لیکن اگر ذرا تغیر و تبدل کر دیا جائے تو یہ بے تامل کہا جا سکتا ہے۔

عبارا تنا شتّٰی و حسنک واحدٌ

---

[1] دائرۃ المعارف ج ۲۰ ص ۷۱۹

تسلسلِ وحی اور نزولِ جبریل

پہلی وحی کے بعد جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، وحی کچھ دنوں کیلئے آنی بند ہوگئی۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "اس میں مصلحت یہ تھی کہ پہلی وحی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دہشت ہوئی تھی وہ جاتی رہے، آپ رفتہ رفتہ اس کو برداشت کرنے کے عادی ہو جائیں اور آپ کو اس کے دوبارہ دیکھنے کا اشتیاق بھی پیدا ہو جائے۔"[1]

فترتِ وحی یعنی وحی رک جانے کی مدت میں اختلاف ہے۔ حافظ ابن حجر نے تاریخ امام احمد حنبلی سے بروایت شعبی نقل کیا ہے کہ یہ مدت تین برس تھی بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ڈھائی سال تھی لیکن ابن سعد نے حضرت ابن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ "فترت کی مدت چند روز تھی یہی غالباً صحیح ہے۔

آنحضرت صلعم کا حزن وملال | وحی کے رُک جانے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا رنج وملال ہوا[2]

---

[1] فتح الباری ج ۱ ص ۲۲ جدید اڈیشن

[2] بعض روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انقطاعِ وحی کا سخت رنج وقلق ہوا اور ادھر کفار نابکار نے طعن وطنز شروع کر دیا تو اس پر سورۂ والضحیٰ کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى — قسم ہے وقت چاشت کی اور قسم ہے رات کی جبکہ وہ ساکن ہوگئی ہو۔ آپ کے رب نے نہ آپ کو چھوڑا ہے اور نہ اس نے دشمنی کی ہے۔ (بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

Marfat.com

صحیح بخاری کتاب التعبیر میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

وَفَتَرَ الوحیُ فترۃً حتیٰ حَزِنَ	اور وحی کا آنا رک گیا یہاں تک کہ آنحضرت
النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم	صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا کہ ہم کو اطلاع ہوئی ہے
فیما بلغنا حزناً غدا منہ مراراً کی	اس کا غم ہوا۔ آپ کئی مرتبہ گھر سے روانہ ہوئے
یتردیٰ من رؤس شواھقِ	کہ اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹیوں سے گرا دیں لیکن
الجبال فکلما اوفیٰ بذروۃ جبل	جب کبھی آپ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے تھے تاکہ
لِکے یلقی منہ نفسہٗ تبدیٰ لہٗ	اپنے آپ کو گرا دیں تو جبریل ظاہر ہوتے تھے
جبریل فقال یا محمد انَّکَ	اور کہتے تھے اے محمد آپ سچ مچ اللہ کے رسول
رسول اللہ حقاً فیسکن لذٰلک	ہیں یہ سن کر آپ کا قلب سکون پذیر ہو جاتا تھا
جاشہ وتقر نفسہ فیرجع فاذا	اور آپ لوٹ جاتے تھے پھر جب وحی
طالت علیہ فترۃ الوحی غدا لمثل	کی رکاوٹ طویل ہو گئی تو آپ پھر ایسا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لیکن ہماری رائے میں یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ فترۃ الوحی کے بعد سب سے پہلے سورۂ مدثر کی آیتیں نازل ہوئی ہیں اب اگر سورۂ والضحیٰ کا نزول سورۂ مدثر کی آیتوں کے بعد مانا جائے تو پھر نزول وحی کے جاری ہونے کے بعد ماودّعک فرما کر کفار کی تردید کرنا شانِ نزول کے ساتھ زیادہ چسپاں نہیں ہوتا اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ سورۂ مدثر کے نزول تک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا اعلان ہی نہیں کیا تھا اس لئے وحی کے رک جانے پر کفار کے طعن وطنز کے کوئی معنی نہیں۔ اس بنا پر اس سورۃ کے شان نزول سے متعلق وہی روایت صحیح ہے جس کو امام بخاری نے تفسیر سورۂ والضحیٰ اور باب کیف نزل الوحی میں نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ بیمار تھے چند روز راتوں کو اٹھ کر عبادت الٰہی میں مصروف نہ ہو سکے تو ایک ہمسایہ عورت نے آپ کی شانِ فلک نشان میں سخت گستاخانہ کلمات کہے۔ ان کلمات کی تردید میں یہ سورۃ نازل ہوئی۔

Marfat.com

ذالک فاذا اوفی بذروۃ جبل تبدی لہ جبریل فقال لہ مثل ذالک
کرتے کہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے تھے اس وقت بھی جبریل ظاہر ہوتے اور آپ سے وہی فرماتے تھے

فترت الوحی کے بعد آپ پر جو وحی نازل ہوئی اس کا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں تو تشریف لے جاتے رہتے ہی تھے ایک دن آپ حرا[۱] سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ ناگاہ ایک صدائے غیب سنائی دی جو آسمان سے آرہی تھی آپ نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ تھا جو حرا میں آیا تھا یہ فرشتہ اس وقت آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ کو اس طرح دیکھ کر خوف زدہ ہوگئے اور گھر واپس آکر فرمایا "مجھے کمل اڑھا دو" اسی حالت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ[۲]
اے گلیم پوش اٹھ اور لوگوں کو ڈرا اور اپنے رب کی کبریائی بیان کر اور اپنے کپڑے پاک رکھ اور ناپاکی کو دور کر

اس کے بعد وحی کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اس کا تار اس وقت تک نہیں ٹوٹا جب تک کہ آپ اس عالم ناپائدار سے روپوش نہیں ہوگئے "فحمی الوحی وتتابع"

حضرت ابن عباس سے ایک روایت ہے کہ آخری آیت قرآن جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے نو یا سات دن پہلے نازل ہوئی سورۂ بقرۃ کی یہ آیت ہے۔

وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْہِ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ
اور ڈرو اس دن سے جس میں تم اللہ کی طرف لوٹ جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا

۱۔ حرا مکہ معظمہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے

۲۔ صحیح بخاری باب بدء الوحی

حضرت ابن عباس سے ہی ایک دوسری روایت ہے کہ یہ نہیں بلکہ آیت ربا آخری آیت ہے۔ واللہ اعلم (تفسیر خازن ج ۱ مطبوعہ مصر ص ۲۵۵)

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع شروع میں نزولِ وحی کے وقت شدت کا احساس ہوتا تھا اور پھر بر بنا بشریت آپ کو وحی کے بھول جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ اس لئے آپ نزولِ وحی کے وقت اپنے لبوں کو جلد جلد حرکت دیتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ○ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (القیامۃ)

آپ اپنی زبان کو حرکت نہ دیجیے کہ آپ اسکے ساتھ عجلت کریں بے شبہ قرآن کا آپ کے سینہ میں جمع کرنا اور اس کا پڑھانا ہمارا ذمہ ہے

حضرت ابن عباس سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ جب جبریل آتے تھے تو آپ بالکل خاموش ہوکر سنتے تھے، پھر جب جبریل چلے جاتے تو آپ اس وحی کو اسی طرح پڑھتے تھے جس طرح کہ جبریل پڑھ کر سناتے تھے۔ حضرت انس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آخر عمر میں وحی کی کثرت ہوگئی تھی[1] اس کی وجہ یہ ہے کہ آخر عمر میں مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اطراف ملک سے وفود کی آمد کا سلسلہ جاری تھا احکام اور لوگوں کے استفسارات بڑھ گئے تھے

پہلی وحی اس وقت آئی جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سن مبارک چالیس سال تھا جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے اس کے بعد کچھ مدت کے لئے وحی کا آنا رک گیا پھر سلسلہ شروع ہوا تو آخیر عمر تک جاری رہا۔ آپ کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں ہوئی ہے اس بنا پر وحی کی مدت ۲۳ سال ہے۔

جیسا کہ بیان ہوچکا ہے شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرشتۂ وحی کے دیکھنے

---

[1] صحیح بخاری باب کیف نزل الوحی

Marfat.com

سے دہشت ہوتی تھی لیکن بعد میں جب آپ ان سے مانوس ہو گئے تو پھر آپ کے شوق و اشتیاق کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر کبھی فرشتۂ وحی کے آنے میں کچھ دنوں کی تاخیر و تعویق ہو جاتی تو آپ مضطرب ہو جاتے تھے

چنانچہ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل سے فرمایا کہ تم اس سے بھی زیادہ میرے پاس کیوں نہیں آتے؟ اس کے جواب میں حضرت جبرئیل کی زبانی ارشاد فرمایا گیا۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ج لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا (مریم)

اور ہم تو آپ کے پروردگار کے حکم اور اجازت سے اترتے ہیں اس کو ان تمام چیزوں کا علم ہے جو ہمارے آگے پیچھے اور اس کے درمیان ہیں اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے۔

بارگاہ نبوی میں حضرت جبرئیل کی آمد کا کوئی وقت متعین نہیں تھا، صبح شام، دن اور رات جب خدا کا حکم ہوتا وہ خدمت اقدس میں حاضر ہو کر خدا کا پیغام پہونچاتے تھے۔ تاہم جس طرح بارش ہونے والی ہوتی ہے تو اس کے آثار و علامات پہلے سے فضا میں محسوس ہونے لگتے ہیں۔ وحی کے نزول یا آمد جبرئیل کا وقت قریب ہوتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے ہی یہ بات محسوس ہو جاتی تھی اور آپ بے چینی سے اس کا انتظار شروع کر دیتے تھے آپ کی یہ حالت ایسی واضح اور ظاہر ہوتی تھی کہ اگر اس وقت کوئی شخص آپ کے پاس ہوتا تو وہ بھی اس کو محسوس کر لیتا تھا۔

حضرت ابوذر غفاری کا بیان ہے کہ میں ایک شب میں باہر نکلا تو دیکھا کہ سید ولد آدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا چل رہے ہیں اور آپ کے ساتھ کوئی شخص بھی نہیں ہے میں نے خیال کیا کہ غالباً اس وقت آپ کسی کی معیت پسند نہیں کرتے اس لئے میں چاندنی میں چلنے لگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میں نظر آیا۔ آپ نے پوچھا "کون" میں نے عرض کی۔ ابوذرؓ میں

آپ پر قربان ہوں ارشاد ہوا اے ابوذر ذرا آؤ تو" میں اس ارشاد گرامی کے مطابق تھوڑی دور چلا تھا کہ زبان نبوت یوں گوہر بار ہوئی" جو ارباب ثروت ہیں وہی قیامت میں کنگال ہوں گے" مگر ہاں وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کو اللہ نے مال دیا اور انھوں نے اس کو دائیں بائیں آگے اور پیچھے بکھیر دیا اور اس میں نیکی کے کام کئے" ابوذر کا بیان ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کچھ دیر تک ہی چلا تھا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا" تم یہاں بیٹھ جاؤ" یہ فرماکر آپ نے مجھ کو ایسے میدان میں بٹھا دیا جس کے ارد گرد پتھر پڑے ہوئے تھے پھر فرمایا" دیکھنا تم یہاں بیٹھے رہنا یہاں تک کہ میں واپس آؤں" اس کے بعد آپ حرہ[۵۱] کی طرف تشریف لے گئے۔ یہاں تک کہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ آپ دیر تک وہاں ٹھہرے رہے پھر جب آپ آرہے تھے تو میں نے سنا کہ آپ فرما رہے تھے" اگرچہ وہ چوری کرے یا زنا کرے جب آپ آگئے تو مجھ سے صبر نہیں ہو سکا اور میں پوچھ ہی بیٹھا" اے اللہ کے نبی میں آپ پر قربان ہو جاؤں، آپ حرہ کی سمت میں کس سے باتیں کر رہے تھے، میں نے تو کسی کی آواز نہیں سنی کہ وہ آپ کی بات کا کوئی جواب دیتا" ارشاد ہوا" یہ جبرئیل تھے جو حرہ کے پہلو میں میرے سامنے آئے اور انھوں نے کہا کہ آپ اپنی امت کو خوشخبری سنا دیجئے، کہ جس شخص کا انتقال اس حالت میں ہو گیا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا تھا، وہ جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے پوچھا" اگرچہ وہ سرقہ یا زنا کرے" جبرئیل نے جواب دیا" ہاں اگرچہ وہ سرقہ یا زنا کا مرتکب ہو، میں نے پھر دوبارہ یہی سوال کیا تو جبرئیل نے پھر یہی جواب دیا[۵۲]

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ آپ نصف شب کو سو رہے تھے کہ اٹھ کر بقیع کے

---

۵۱ مدینہ منورہ کی شمالی جانب میں ایک مقام کا نام ہے جہاں یزید بن معاویہ کے زمانہ میں مشہور واقعہ قتل و قتال ہوا تھا اور جس میں اہل مدینہ پر لرزہ فگن مظالم کئے گئے تھے۔

۵۲ صحیح بخاری کتاب الرقاق

Marfat.com

قبرستان میں تشریف لے گئے صبح کو آپ نے فرمایا "رات جبریل نے مجھ کو پیغام دیا کہ میں اس وقت بقیع میں جا کر دعاء مغفرت کروں[1]"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ہر ہر ادا اور آپ کا ہر ہر فعل خدا کے حکم اور اس کے ارشاد کے مطابق ہوتا تھا اس بنا پر اگر کبھی آپ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا جو منشا خداوندی کے مطابق نہیں ہوتا تھا تو فوراً جبریل امین آکر اس کی اصلاح کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ خندق سے مسلمانوں کی فوج لے کر واپس آئے اور ہتھیار کھول کر غسل فرمایا تو جبریل نے آکر کہا "آپ نے ہتھیار کھول دئے حالانکہ ہم اب تک ہتھیار بند ہیں اور بنو قریظہ کو ابھی ان کی غداری کا بدلہ دینا ہے[2]"

حضرت جبریل اگرچہ عموماً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تنہائی میں آتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی اس وقت بھی آتے تھے جب آپ کے پاس مجمع ہوتا تھا یا ایک دو اصحاب بیٹھے ہوتے تھے اس مضمون کی کئی روایات پہلے گذر چکی ہیں، ایک مرتبہ آپ ام المومنین حضرت عائشہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ آپ نے فرمایا "اے عائشہ جبریل تم پر سلام بھیجتے ہیں" ام المومنین بولیں "یا رسول اللہ آپ وہ دیکھتے ہیں جو میں نہیں دیکھتی" ایک دفعہ آپ نے غزوۂ بدر میں فرمایا "دیکھو یہ جبریل اپنے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑے ہیں[3]"

رمضان میں جبریل کی آمد زیادہ ہوتی تھی۔ اس ماہ مبارک میں وہ ہر روز آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید سنتے تھے اور آپ کو سناتے تھے۔

وحی غیر متلو یہ بات یقینی ہے کہ حضرت جبریل بعض اوقات خدا کی طرف سے ایسے پیغامات بھی لیکر آتے تھے جو قرآن مجید میں موجود نہیں ہیں، اسی بنا پر علماء اسلام نے وحی کی دو قسمیں کر دی ہیں

[1] نسائی باب الاستغفار للمومنین [2] بخاری باب غزوۂ خندق [3] بخاری غزوۂ بدر

ایک متلو اور دوسری غیر متلو، وحی متلو تو وہی ہے جو قرآن مجید کی صورت میں مسلمانوں کے سینوں میں اور سفینوں میں محفوظ ہے۔ دوسری قسم وحی غیر متلو وہ ہے جو احادیث صحیحہ کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے خود قرآن مجید کی تصریح۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ — اور آنحضرت اپنی خواہش سے نہیں بولتے ہیں

اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم) — بلکہ آپ کا نطق وہ وحی ہوتا ہے جو آپ پر بھیجی جاتی ہے

کے مطابق وہ بھی وحی ہے اور ہمارے لئے سرچشمۂ سعادت و فلاح ہے چونکہ احکام و مسائل کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے تھے وحی سے فرماتے تھے اس بنا پر اگر کوئی شخص آپ سے کوئی حکم دریافت کرتا اور وہ آپ کو معلوم نہ ہوتا تو آپ جواب میں خاموش رہتے اور وحی کا انتظار فرماتے تھے، یعلی بن امیہؓ کا بیان ہے کہ حجۃ الوداع[ل] کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ میں قیام پذیر تھے کہ ایک شخص نے آکر سوال کیا یارسول اللہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں جس نے کپڑے میں خوشبو لینے کے بعد احرام کی نیت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قدر انتظار کیا، یہاں تک کہ آپ پر نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوئی، جب وہ کیفیت زائل ہوگئی تو آپ نے اس سائل کو بلوایا وہ آگیا تو آپ نے فرمایا "جو خوشبو تم مل چکے ہو اس کو تین دفعہ دھو ڈالو اور اس کپڑے کو اتار دو، پھر عمرہ ادا کرو۔

ایک مرتبہ ایک یہودی عالم نے آپ سے پوچھا "بہترین جگہ کون سی ہوتی ہے" آپ خاموش رہے اور پھر فرمایا "میں جبریل کے آنے تک خاموش رہوں گا" چنانچہ جب جبریل آئے تو آپ نے ان سے پوچھا "بہترین جگہ کون سی ہوتی ہے" جبریل نے کہا "اس مسئلہ میں تو سائل اور مسئول یعنی آپ اور میں دونوں برابر ہیں لیکن ہاں میں اپنے رب سے سوال کروں گا پھر جبریل (دوبارہ آ)

[ل] یہ روایت اس کتاب میں پہلے بھی ایک جگہ گذر چکی ہے۔

Marfat.com

اور انھوں نے کہا "اے محمد! میں اللہ سے اتنا قریب ہو گیا تھا کہ ایسا قریب کبھی نہیں ہوا تھا۔ آنحضرت نے پوچھا" یہ کیوں کر ہوا" وہ بولے" میرے اور خدا کے درمیان نور کے ایک ہزار پردے حائل تھے، اللہ نے فرمایا" بدترین جگہ بازار ہیں اور بہترین جگہ مسجدیں ہیں۔

(صحیح ابن حبان ج ا ص ا، مطبوعہ مجتبائی پریس دہلی)

وحی متلو اور غیر متلو دونوں میں حکم کے اعتبار سے فرق یہ ہے کہ وحی متلو یعنی قرآن مجید کا ایک ایک حرف متواتراً منقول ہے اور اس لئے وہ بالکل قطعی اور حتمی طور پر خدا کا کلام ہے۔ لیکن اس کے برعکس وحی غیر متلو یعنی احادیث احکام و مسائل کا یہ حال نہیں ہے ان کا بہت کم حصہ تواتر منقول ہے پھر جو متواتراً منقول ہیں، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بھی الفاظ کو خدا کے الفاظ نہیں بتایا اس لئے وہ معنیً تو ارشاد خداوندی ہیں لیکن لفظاً نہیں۔

قرآن مجید وحی الٰہی کیوں ہے؟

گذشتہ مباحث کے بعد آخر میں ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن مجید وحی الٰہی کیوں ہے؟ اس کے کیا دلائل ہیں؟ اور وہ کون سے خصائص و اوصاف ہیں جن کی بنا پر قرآن کلام بشر نہیں بلکہ کلامِ الٰہی ہے؟ اس سوال کا ایک واضح اور کھلا جواب تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات جو پیغمبری کے تمام خصائص و محامد کی جامع ہے۔ قرآن کے وحی الٰہی ہونے کی سب سے بڑی اور روشن دلیل ہے۔ گذشتہ ابواب میں ضمنی طور پر اس کی طرف متعدد جگہ اشارات ملیں گے۔ ہم یہاں قرآن کی صرف حیثیتِ کلام کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کرتے ہیں۔

وصفِ اعجاز قرآن کے بیشمار خصائص کے لئے ایک جامع لفظ اعجاز ہے یعنی قرآن مجید اپنے اعجاز کے سبب کلام الٰہی ہے جس طرح کسی جاندار چیز کا پیدا کرنا اور پھر مار ڈالنا۔ آسمان سے پانی کا برسانا اور پھر بادلوں کا کھُل جانا۔ مشرق سے آفتاب کا طلوع ہونا اور پھر غروب ہو جانا، ہوا کا چلنا اور تھمنا۔ یہ سب چیزیں انسان کے دسترس اور قابو سے باہر ہیں اور اس لئے یہ سب ایک زبردست قوت کے وجود کی دلیل ہیں جو اپنی قدرت وحکمت سے اس کارگاہِ ہست وبود کو انتہائی نظم و انتظام کے ساتھ چلا رہی ہے اسی طرح قرآن کا معجز نما ہونا یعنی انسانوں کا اس جیسا کلام لانے سے عاجز رہنا اس کے وحی الٰہی ہونے کی بیّن دلیل ہے۔

وجوہِ اعجاز لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کا یہ اعجاز کس وصف کے لحاظ سے ہے؟ علماءِ اسلام نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس سوال کے متعدد جوابات دئے ہیں جن کو مختصراً اس طرح

بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) قرآن مجید کا نظم کلام اور اسلوب ادا معجز ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عرب کے کلام نثر کے لئے جتنے اسالیب مقرر تھے۔ قرآن مجید نے ان سب سے الگ ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے جس کا مثل لانا انسان کے حیطۂ قدرت سے باہر ہے یہ مسلک معتزلہ کی ایک بڑی جماعت کا ہے۔

(۲) اشاعرہ قرآن مجید کا اعجاز فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے مانتے ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا فصیح و بلیغ متکلم بھی قرآن جیسا فصیح و بلیغ کلام نہیں بول سکتا۔

(۳) بعض متکلمین کے نزدیک قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ایک نبی امی کی زبان سے ادا ہوا

(۴) بعضوں کی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید میں گذشتہ اقوام و ملل کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں اور بعض آئندہ واقعات کے بارہ میں جو پیش گوئیاں کی گئی ہیں اور وہ سب حرف بحرف پوری ہوئی ہیں قرآن اُن کے لحاظ سے معجز ہے۔

(۵) بعض علماء کہتے ہیں کہ قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ شروع سے آخر تک ایک ہی اسلوب اور ایک ہی اسٹائل میں ہے۔ اس میں رفع و خفض اور نشیب و فراز بالکل نہیں پایا جاتا۔

(۶) ایک جماعت کہتی ہے کہ اعجاز قرآن کا اصل راز اس کے احکام و تعلیمات میں ہے کہ کوئی انسانی دماغ اس طرح کے معتدل اور پراز حکمت و ہدایت احکام وضع نہیں کر سکتا۔

(۷) کچھ حضرات کی رائے ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز اس کی حیرت انگیز تاثیر ہے جس سے عربی کا ذوق نہ رکھنے والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

(۸) کسی کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ وہ دلوں کے چھپے ہوئے بھید ظاہر کر دیتا تھا جن تک کسی انسان کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی ہے[1]

(لہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ پر)

Marfat.com

لیکن اصل یہ ہے کہ یہ تمام توجیہات اپنی اپنی جگہ پر قرآن مجید کے حسن تمام وکمال کے کسی ایک رخ کو نمایاں کرتی ہیں ان میں باہمی کوئی تعارض وتضاد نہیں۔ فرض کرو حسن وجمال کا کوئی پیکر اتم اگر چند مختلف الذوق لوگوں کے سامنے آجائے تو اس میں سے ہر شخص کس طرح اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کی تشریح وتوضیح کرے گا۔ کوئی تناسب اعضاء وجوارح پر فریفتہ ہوگا اور کسی کو رنگ ونزہت پر شیفتگی ہوگی، کوئی قد وقامت کی موزونیت پر دل وجان فدا کرے گا اور کسی کو لب لعلین وکاکل مشکین کا سودا ہوگا کسی کے لیے چشم نرگسی جادوئے بابل کا کام کرے گی اور کوئی جمال آتشیں کی فسوں کاریوں کا ہلاک ستم ہوگا۔ غرض یہ ہے کہ حسن جب کامل اور جمال جب اتم ہوتا ہے تو اس کی ہر ہر ادا اہل نظارہ کو دعوت نظر و دید دیتی ہے اور پھر حسن نظارہ سوز کی جلوہ پاشیوں میں نگہ اشتیاق کی لنگ پائی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اسے قدم قدم پر "جا ایں جاست" کا سماں نظر آتا ہے اور وہ وہیں محو حیرت ہو کر رہ جاتی ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ! کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

لیکن جو اہل نظر ہوتے ہیں وہ جان لیتے ہیں کہ اگرچہ تعبیریں مختلف ہیں اور انداز ہائے بیان بھی بدلے ہوئے ہیں لیکن یہ سب رہنمائی کرتی ہیں ایک ہی کی طرف اور یہ سب بیانات ایک حقیقت کلی کی ہی جزئی تشریحات ہیں۔

عبارٰاتنا شتّٰی وحُسنك واحدٌ وكلٌّ الى ذاك الجمال يشيرُ

قرآن مجید نے خود اپنے اعجاز کا دعویٰ کیا ہے اور منکرین کو چیلنج دیا ہے کہ اگر وہ اُسے کلام الٰہی نہیں مانتے تو انھیں چاہیئے کہ اس کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ کا مثل لاکر دکھائیں

(۱؎ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت شاہ ولی اللہ نے الفوز الکبیر باب سوم میں علامہ ابن حزم نے الفصل فی الملل والنحل میں اور علامہ سیوطی نے اتقان میں اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں ان وجوہ اعجاز پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔

Marfat.com

اس بنا پر ہم کو ان اختلافات سے قطع نظر کرکے خود قرآن میں تلاش کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے وجوہ اعجاز میں کیا دلائل پیش کرتا ہے۔ گذشتہ باب" وحی اور قرآن" میں بھی ان دلائل کا اجمالی ذکر آچکا ہے۔ ہم یہاں ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے اس سلسلہ میں پانچ چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت (۲) گذشتہ اقوام کے واقعات اور آئندہ واقعات کے متعلق پیشینگوئیاں (۳) فصاحت و بلاغت (۴) قرآنی احکام و مسائل (۵) قرآن کی غیر معمولی تاثیر۔ ذیل میں انھیں پانچ امور کی تفصیل درج ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ

آپ قرآن سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے اگر ایسا ہوتا تو البتہ یہ باطل پرست شک کر سکتے تھے۔ بلکہ یہ تو کھلی آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جنکو علم بخشا گیا ہے اور ہماری آیات سے ظالم ہی انکار کرتے ہیں

پھر اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے۔

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

(عنکبوت)

کیا ان لوگوں کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے اس میں ایمان والوں کیلئے رحمت اور نصیحت ہے۔

دیکھو ان آیات میں اللہ تعالی کس طرح قرآن مجید کے وحی الہی ہونے اور اسکے منجانب اللہ

نازل ہونے کی نشانی (آیت) یہ بتاتا ہے کہ وہ ایک ایسے نبی امی پر نازل ہوا ہے جو نہ کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا اور نہ کچھ لکھنا جانتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے کہ آپ کی دعوتِ توحید واسلام پر برہم ہو کر کفار مکہ نے کیا کچھ نہیں کہا وہ کونسا افترا اور بہتان تھا جو ان لوگوں نے پیغمبر حق کے برخلاف نہیں باندھا۔ آپ کو (معاذ اللہ) ساحر کہا۔ کاہن کہا سب کچھ کہتے رہے اور ایذا رسانی میں بھی انھوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن یہ کہنے کی جرأت کسی کو نہ ہو سکی کہ آپ امی کہاں ہیں؟ آپ تو نزولِ قرآن سے پہلے بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے عکاظہ اور ذوالمجنہ کے سالانہ اجتماعات میں ادھر ادھر کے آتش بیان خطیب اور نامور شعراء جمع ہو کر جوہر سخن کی نمائش کرتے اور اس آن بان سے فصاحت و بلاغت اور زور بیان و کلام کی داد دیتے تھے کہ تمام مجمع میں دھوم مچ جاتی تھی۔ لیکن آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے جو عمر مبارک کے چالیسویں سال ہوئی کسی ایک شخص نے بھی نہیں دیکھا اور نہ سنا کہ آپ نے بھی کسی مجمع میں شریک ہو کر کوئی پر زور خطبہ دیا ہو۔ حالانکہ اگر قرآنی فصاحت و بلاغت کا ملکہ آپ کا ایک ذاتی وصف تھا تو اس کا ظہور روز بروز نہیں چالیس سال کی عمر سے پہلے کبھی ایک مرتبہ تو ہوا ہوتا یہ ظاہر ہے کہ ہر انسان کے ذاتی جوہر وکمال کے ابھرنے اور نمایاں ہونے کا زمانہ اس کا عہدِ شباب ہوتا ہے چالیس برس کی عمر سے تو قوی میں انحطاط کے ساتھ انسان کے ذاتی ملکات و اوصاف میں بھی انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ سید کونین عرب میں سب سے زیادہ فصیح تھے چنانچہ آپ نے خود فرمایا ہے " میں تم سب میں فصیح تر ہوں کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنو سعد کی زبان ہے (طبقات ابن سعد ج ۱) لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس غیر معمولی فصاحت و بلاغت کے باوصف آپ نے نبوت ملنے سے پہلے کبھی کہیں ایک مرتبہ بھی کوئی ایسا خطبہ دیا جو قرآنِ مجید

Marfat.com

کے اندازِ بیان اور اسلوب کلام سے ملتا جلتا ہو جس میں قرآن کے بیان کے مطابق حکمت و موعظت اور اسرارِ عالم اور کائنات کے گنجینے بھرے ہوئے ہوں؟ پھر اگر ایسا ہوتا تو آپ کی وہ حیرت و گمشدگی کی حالت کسطرح ہوسکتی تھی جو نزولِ وحی کے بالکل آغاز میں ہوئی اور جسکی طرف قرآن مجید نے

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ — اور خدا نے آپ کو حیرت زدہ پایا اور اُسنے ہدایت کی

کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

پس سوچو اور غور کرو کہ کیا یہ قرآن کا اعجاز نہیں ہے کہ عرب کا ایک گوشہ نشین امی جو نہ لکھنا جانتا ہے اور نہ پڑھنا اور جو نہ علماء کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے اور نہ (ایک دو معمولی سفروں کے علاوہ) کہیں مکہ سے باہر آتا جاتا ہے جو فصاحت و بلاغت اور شعر و خطابت کی عام گرم بازاری کے اور خود اس فضا میں رہنے کے باوجود نہ ایک شعر موزوں کرسکتا ہے اور نہ کوئی خطبہ دیتا ہے۔ لوگ اسے "صادق" "امین" اور "راستباز" کی حیثیت سے جانتے پہچانتے ہیں لیکن حکمت مآب فصیح و بلیغ کی حیثیت سے اسے کوئی شہرت حاصل نہیں ہے وہ عمر کا بہترین حصہ (چالیس سال سے پہلے تک کا) اسی گمنامی میں بسر کر دیتا ہے۔ پھر جب قوی میں انحطاط کا زمانہ شروع ہوتا ہے تو یہی امی ایک بالکل عجیب و غریب طریقہ پر دنیا کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ جو لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا اس نے عالم کون و فساد کے حقائق سے نقاب الٹ دی۔ حکمت و ہدایت کے دفتر کھول دئے، بڑے بڑے فلاسفر جن اسرار و رموزِ کائنات کی گرہ کشائی نہیں کرسکتے تھے اس نے چشم زدن میں ان سب کو حل کرکے رکھ دیا پھر اسی خاموش امی کی زبانِ حق ترجمان سے جو پیغام "قرآن" کے نام سے نکلا اس نے فصاحت و بلاغت کے ایسے ایسے گوہر ہائے گرانمایہ کا انبار لگا دیا کہ بڑے بڑے فصحا و بلغاء کی زبانیں بار بار کے چیلنج کے باوجود اس کے کسی ایک حصہ کا جواب لانے سے بھی گنگ ہوگئیں اور اس

Marfat.com

امی کی زبان کا ایک ایک لفظ شدید ترین ظلمتوں میں بھی حقانیت وصداقت کا آفتاب جہانتاب بن کر چمکا اور اس طرح چمکا کہ

عالم تمام مطلع انوار ہوگیا

شیخ سعدی کی نعت کے یہ دو شعر پڑھو اور دیکھو کہ اس کا ایک ایک لفظ کس طرح اصل حقیقت کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کرتا ہے۔

کلیمے کہ چرخِ فلک طور او ست | ہمہ نورہا پرتوِ نورِ اوست
یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست | کتب خانۂ چند ملت بشست

تو پھر بتاؤ کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت قرآن کے اعجاز کی دلیل نہیں ہے اور کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن آنحضرتؐ کا نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے؟

واقعات غیب قرآن مجید کے بیان کے مطابق قرآن کے وحی ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس میں پچھلی قوموں کے ان صحیح صحیح واقعات کا بیان ہے جن کے علم کا کوئی ذریعہ آپ کے پاس موجود نہیں تھا۔ اس طرح کے واقعات کا علم آپ کو تین طریقوں سے ہی ہو سکتا تھا ایک یہ کہ یہ سب واقعات آپ کے سامنے پیش آتے دوسرے یہ کہ آپ نے ان کو کسی کتاب میں پڑھا ہوتا تیسرے یہ کہ آپ کی صحبت ایسے لوگوں کے ساتھ رہی ہوتی جنھیں ان واقعات کا علم تھا اور آپ ان سے ان کا تذکرہ سنتے۔ قرآن مجید ان تینوں ذرائع میں سے ہر ایک کی نفی کرتا ہے پہلے ذریعۂ علم کی نسبت حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں ارشاد ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَآ	آپ مغربی جانب میں نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو
إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ	اپنا حکم بتایا اور نہ آپ وہاں دیکھ رہے تھے
الشَّاهِدِينَ وَلَٰكِنَّآ أَنْشَأْنَا قُرُونًا	لیکن ہم نے کئی جماعتیں پیدا کیں اور ان پر

فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ
ثَاوِيًا فِيْ أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ
اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ وَمَا كُنْتَ
بِجَانِبِ الطُّوْرِ إِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً
مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا أَتٰهُمْ
مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ
يَتَذَكَّرُوْنَ (قصص)

مدت دراز گذر چکی اور نہ آپ مدین والوں میں تھے
کہ ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہوتے
لیکن ہم رسول بھیجتے رہتے ہیں اور نہ آپ طور
کے کنارے تھے جب ہم نے ان کو ندا دی لیکن یہ
آپکے رب کا انعام ہے تاکہ آپ ان لوگوں کو ڈرائیں
جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا
نہیں آیا ہے تاکہ یہ موعظت گیر ہوں۔

حضرت مریمؑ اور حضرت زکریاؑ کے واقعہ میں ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ
إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُوْنَ
أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ
وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُوْنَ

(آلِ عمران)

یہ گذشتہ زمانہ کی خبروں میں ہے جس کو ہم بذریعہ
وحی آپ پر نازل کرتے ہیں اور آپ ان کے
پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنا پانسہ ڈال رہے
تھے اور نہ آپ اسوقت موجود تھے جبکہ وہ جھگڑ رہے تھے

حضرت یوسف کے واقعہ میں بھی اسی طرح ارشاد ہے۔

دوسرا ذریعہ علم یہ تھا کہ آپ ان واقعات کو کسی کتاب میں پڑھ لیتے قرآن اس کی بھی نفی کرتا ہے چنانچہ اس سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمیت کے بیان میں جو آیت گذر چکی ہے اس میں اس مضمون کی صاف تصریح ہے اس کے علاوہ ایک اور آیت بھی ہے۔

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا
الْإِيْمَانُ (شوریٰ)

آپ کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور
ایمان کسے کہتے ہیں۔

تیسرا ذریعۂ علم یہ ہو سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان واقعات کو کسی سے سنتے قرآن مجید اس کی بھی نفی کرتا ہے۔ ارشاد ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا (ہود)

یہ غیب کی باتیں ہیں جو آپ پر ہم بطور وحی نازل کرتے ہیں اس سے پہلے ان باتوں کو نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم جانتی تھی۔

ہر شخص جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے چالیس سال کی زندگی مکہ معظمہ میں گذاری۔ اس تمام مدت میں آپ کا صرف دو مرتبہ شام کے سفر میں جانا ثابت ہے ایک مرتبہ آپ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ گئے تھے۔ اس وقت آپ کا عہد طفولیت تھا اور دوسری مرتبہ آپ عہد شباب میں تشریف لے گئے تھے لیکن یہ سفر چند روز کے لئے تھا۔ قیام مکہ کے زمانہ میں آپ قریش والوں میں ہی رہتے سہتے تھے اور یہ لوگ جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے اہل کتاب نہ ہونے کے باعث گذشتہ اقوام و ملل کی تاریخ سے بالکل ناآشنا تھے۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ تیسرا ذریعۂ علم بھی سرے سے مفقود تھا۔

ان تینوں ذرائع علم کی نفی کے بعد قرآن کا یہ فرمان کہ "نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ" خود بخود واضح ہو جاتا ہے اور ایک ایسی حقیقت مسلمہ بن کر سامنے آتا ہے کہ کسی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کفار و مشرکین جس طرح آپ کی امیت کی تکذیب نہیں کر سکے۔ ان میں سے کسی ایک شخص کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ "آپ یہ کیسے فرماتے ہیں کہ یہ واقعات غیب مجھ کو وحی سے معلوم ہوئے ہیں آپ تو یہ واقعات فلاں شخص سے سنتے تھے یا اس کے پاس آپکی نشست و برخاست تھی" اس قسم کے دعوی کا اظہار اگر ہوتا تو علماء یہود و نصاری کی طرف سے ہو سکتا تھا اور حضور کی مدنی زندگی میں انھوں نے بار بار اسکا امتحان بھی لیا لیکن آخر کار انکو بھی قرآن کے وحی الہی ہونے کا اقرار

Marfat.com

کرنا پڑا اور کسی ایک شخص کو بھی آنحضرت کی امیت کا انکار کرنے کا حوصلہ نہیں ہو سکا۔

واقعات آئندہ کی پیشینگوئی | اخبار عن الغیب کے سلسلہ میں قرآن مجید کی وہ پیش گوئیاں بھی داخل ہیں جو بعض نہایت ہی مستبعد امور سے متعلق ہیں اور جو حرف بحرف صحیح ثابت ہو کر رہیں۔

غلبہ روم کی پیشین گوئی | ان پیشین گوئیوں میں سب سے زیادہ حیرت انگیز اور نمایاں تر پیشین گوئی غلبہ روم کی ہے قرآن میں اس کا ذکر اس طرح ہے ۔

الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ	الم ۔ قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے
وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ	ہیں اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد چند
فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ۗ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ	سال میں غالب آجائیں گے اللہ ہی کے
وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَیَوْمَىٕذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ	ہاتھ ہے سب کام پہلے اور پچھلے اور اس دن
بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَهُوَ ا	مسلمان خوش ہوں گے اللہ کی مدد سے اللہ
لْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۙ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا یُخْلِفُ	جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور وہی زبردست
اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ	اور رحم کرنے والا ہے ۔ اللہ کا وعدہ ہو چکا اللہ
لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (الروم)	اپنے وعدہ کیخلاف نہ کریگا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے تھے

جنگ روم و ایران کا واقعہ | اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ عرب کے دائیں بائیں روم اور ایران کی دو طاقتور حکومتیں قائم تھیں۔ رومی حکومت عیسائی تھی اور ایرانی سلطنت مجوسی۔ دونوں میں ایک عرصہ سے کش مکش چلی آ رہی تھی۔ ایرانی سلطنت کے تخت پر نوشیرواں کا پوتا اور ہرمز کا بیٹا خسرو (Chosres) قابض تھا اور رومی حکومت کی عنانِ اختیار و اقتدار ہرقل (HERACLIUS) کے ہاتھ میں تھی۔ ان دونوں حکومتوں میں جنگ و پیکار کا سلسلہ ۶۰۲ء سے ۶۱۶ء تک جاری رہا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت عیسوی تاریخ کے حساب سے ۵۷۰ء میں ہوئی ۔

Marfat.com

اور ۶۱۰ء میں آپ کے فرقِ مبارک پر نبوت و رسالت کا تاجِ زرفشاں رکھا گیا۔ دونوں سرحدوں کے قرب کی وجہ سے مکہ والوں کو طبعی طور پر اس جنگ سے گہری دلچسپی تھی۔ یہاں برابر اس کی خبریں پہنچتی رہتی تھیں۔ ایرانی مجوس یعنی آتش پرست تھے۔ اس لئے مکہ کے کفار و مشرکین کو ان کے ساتھ دلی ہمدردی تھی اور وہ دعائیں کرتے تھے کہ جنگ میں ایرانیوں کو فتح و کامرانی حاصل ہو لیکن مسلمان طبعی طور پر رومیوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ عیسائی ہونے کی وجہ سے ایرانیوں کی نسبت ان سے زیادہ قریب تھے۔

ایرانیوں کی فتح

لیکن ایرانی فوج نہایت طاقتور اور منظم تھی اور ادھر رومی فوج کا ایک بہترین جنرل نارسیس قسطنطنیہ کے بازار میں زندہ جلوا دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں نے ایک طرف دجلہ و فرات کے کناروں سے شام کی طرف بڑھنا شروع کیا اور دوسری جانب (ایشیائے کوچک میں) وہ آذربائیجان آرمینیہ ہو کر اناطولیہ میں داخل ہو گئے۔ رومی افواج کو دونوں طرف سخت ہزیمت اور پسپائی سے دوچار ہونا پڑا۔

یورپ کے مشہور مورخ گبن کا بیان ہے کہ اس جنگ میں رومیوں کے نوے ہزار آدمی قتل ہوئے۔ کلیساؤں کو آگ لگا دی گئی۔ تین سو برس کی مذہبی نذریں ایک دن میں وقفِ عام ہو گئیں۔ انتہا یہ ہے کہ بیت المقدس سے عیسائیوں کی سب سے زیادہ مقدس صلیب بھی ایران کو منتقل ہو گئی اور قیصر روم ایک جسدِ بیجان ہو کر رہ گیا۔ مشرقی ممالک کے نقصان کے علاوہ یورپ میں بھی ان کی حالت بہتر نہ تھی تمام یورپ میں غدر مچا ہوا تھا۔ اسٹریا (ISTRIA) کی سرحد سے تھریس کی دیواروں تک آوارس (Avars) مظالم ڈھا رہے تھے۔ جنگ اطالیہ میں جن معصوم انسانوں کا خون پانی کی طرح بہا تھا وہ بھی ابھی خشک نہیں ہوا تھا کہ آوارس نے پنونیا (Pannania) کے مقدس میدان میں مرد قیدیوں کو قتل کر دیا عورتیں اور بچے

Marfat.com

غلام بنا لئے گئے رومی سلطنت قسطنطنیہ کی دیواروں، یونان، اٹلی اور افریقہ کے کچھ بقیہ حصوں اور ایشیائی ساحل کے چند بحری مقامات میں صور سے طرازون تک محدود ہو کر رہ گئی۔ غرض یہ ہے کہ ایک طرف عراق، شام، فلسطین، مصر اور ایشیاء کوچک کے وسیع علاقوں میں ایرانی حکومت قائم ہو چکی تھی ہر جگہ آتشکدے تعمیر ہو رہے تھے اور مسیح کے بجائے آگ اور سورج کی جبری پرستش کرائی جا رہی تھی اور دوسری طرف خود رومن امپائر کی وسیع مملکت میں بغاوتیں برپا تھیں اور ان بغاوتوں میں افریقہ اور یورپ کے علاقے بھی شامل تھے ظاہر ہے ان حالات میں سلطنت روما کے بے نام و نشان ہو جانے میں کیا کسر رہ گئی تھی[۱]۔

| مشرکین مکہ کی مسرت | ان ایرانی فتوحات پر مشرکین مکہ جتنے بھی خوش ہوتے کم تھا۔ وہ اس کو مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے لئے فتح کی ایک نیک فال سمجھتے تھے اور مسلمانوں سے برملا کہتے تھے کہ جس طرح ایرانیوں نے رومیوں کو ہزیمتِ فاش دی ہے اسی طرح اگر کبھی تم میں اور ہم میں لڑائی ہوئی تو ہم کو بھی تم پر فتح حاصل ہوگی۔ مسلمان اس صورت حالات پر نہایت دل گرفتہ اور رنجیدہ تھے مگر کر کیا سکتے تھے۔ راضی بحکم ایزدی تھے کہ نا امیدی اور مایوسی کی شدید ترین ظلمتوں میں غلبہ روم کی آیات نے (جو پہلے گذر چکی ہیں) نازل ہو کر دلوں میں پھر امید و حوصلہ کی روشنی پیدا کر دی۔

کفار مکہ کا استبعاد اور اس کی وجہ | کفار مکہ کو اس پیشین گوئی کا علم ہوا تو انھوں نے اس کو نہایت مستبعد سمجھ کر مسلمانوں کا مذاق اڑایا اور کہا کہ اچھا آؤ ہم تم شرط کریں کہ اگر رومی واقعی غالب آ گئے تو ہم

---

[۱] گبن نے اپنی کتاب تاریخ زوال روما جلد ۳ میں ایران و روم کی اس جنگ کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے اردو میں علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی جلد ۳ میں اور ہمارے لائق دوست مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایڈیٹر الندوہ نے الندوہ جلد ۲ نمبرہ میں گبن کی تاریخ سے ہی اخذ کر کے اس جنگ کے مفصل حالات لکھے ہیں ہم نے اس بحث میں ان دونوں مضامین سے استفادہ کیا ہے۔

مسلمانوں کو کئی اونٹ دیں گے اور اگر اس کے برعکس ظہور ہوا تو تو مسلمان اونٹ ہار جائیں گے حضرت ابو بکرؓ نے مسلمانوں کی طرف سے اس پیشین گوئی کے ظہور کی مدت چھ سال مقرر کی تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو ارشاد ہوا کہ "بضع" کا لفظ تین سے نو تک پر بولا جاتا ہے اس بنا پر دس سال سے کم کی مدت مقرر کرنی چاہیئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے اس ارشاد نبوی کے مطابق نو سال کی شرط کی[۱]۔"

حقیقت یہ ہے کہ نظر بر اسباب ظاہری ان حالات میں کسی کو یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ابھی چند برسوں میں ہی پانسہ بالکل پلٹ جائے گا اور شکست خوردہ رومی پھر طاقتور ایرانیوں پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ کیونکہ ایک طرف ایرانی فتوحات اور طاقت وقوت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے رومیوں کے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک چپہ چھین لیا اور دوسری جانب قیصر روم ہرقل کی عیش پسندی اور غفلت مآبی کا یہ حال تھا کہ وہ گبن صاحب کے الفاظ میں پرلے درجہ کا سست، کاہل اور اپنی قوم اور ملک کی بربادی کا نام تماشائی تھا"۔

"تاریخ زوال روما" کا مصنف لکھتا ہے:۔

" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں پیشین گوئی کی کہ چند سال کے اندر اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے۔ جب یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اس وقت اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ کیونکہ ہرقل کی حکومت کے ابتدائی بارہ سال سلطنت روما کی قریبی تباہی اور خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے۔

بہر حال یہ وہ نامساعد و ناموافق حالات تھے جن میں قرآن کی طرف سے غلبۂ روم کی بظاہر بالکل مستبعد پیشینگوئی کا اعلانِ عام کیا گیا۔ ترمذی میں ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کو اس قدر خوشی ہوئی

[۱] مستدرک حاکم جلد ۲ تفسیر سورۂ روم و ترمذی باب تفسیر سورہ روم

کہ وہ مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں چیخ چیخ کر "الم غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون" کی تلاوت کرتے پھرتے تھے۔

پیشینگوئی کی صداقت کا ظہور یہ آیت بعثت نبوی کے پانچویں سال نازل ہوئی تھی یعنی عیسوی تاریخ کے لحاظ سے ۶۱۴ء میں جب کہ ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں کی شکست کا آغاز ہو چکا تھا پھر ہوتے ہوتے ۶۱۶ء میں یہ شکست انتہا کو پہونچ گئی۔ آغاز شکست سے پورے آٹھ برس بعد یعنی ۶۲۲ء میں رومیوں کے تن مردہ میں پھر جان پیدا ہوئی اور انھوں نے ایرانیوں کے انتہائی جبر و ظلم سے تنگ آ کر ہرقل کی قیادت میں ایرانیوں پر حملہ کر دیا۔ ۶۲۳ء سے انکو قرآن مجید کی پیشین گوئی کے مطابق اس حملہ میں کامیابی ہونی شروع ہوئی اور انجام کار ۶۲۵ء میں رومیوں کی فتح اس شان سے پایۂ تکمیل کو پہونچی کہ انھوں نے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر پھر دجلہ و فرات کے ساحلوں تک دھکیل دیا۔ کیا عجیب بات ہے کہ ایرانیوں پر رومیوں کی حیرت انگیز فتح و کامرانی کا سال (بلکہ بعض روایتوں کے مطابق مہینہ اور دن بھی) بعینہ وہی سال تھا جس میں مسلمانوں کی تین سو تیرہ کی جماعت قلیل کو نو سو سے زیادہ مسلح کافروں کی بھاری تعداد کے بالمقابل بدر کے میدان میں عظیم الشان فتح حاصل ہوئی تھی۔

اب غور کرو قرآن مجید نے غلبۂ روم کی جو پیشین گوئی کی تھی اس میں چند باتیں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہیں۔

(۱) یہ پیشینگوئی حد درجہ ناساز گار حالات میں کیگئی جبکہ رومیوں کی فتح کا بعید سا احتمال بھی نہیں ہو سکتا تھا

(۲) پیشینگوئی میں غلبۂ روم کی کوئی طول طویل مدت مقرر نہیں کی گئی۔ بلکہ صرف نو سال بتائے گئے اور یہ ظاہر ہے کہ رومیوں کو جس شان کی شکست ہوئی تھی اس کے

Marfat.com

اعتبار سے قیاس نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ نو برس کی قلیل مدت میں اپنی عظمت رفتہ واپس لے لینگے

(۳) پھر یہ دیکھو کہ رومیوں کو شکست جس سست اور عشرت پسند کمانڈر کے ہاتھوں ہوئی تھی اب یہ فتح بھی اسی کے زیر قیادت ہوئی ہے۔ گویا یہ وہ ہیلا ہرقل ہے ہی نہیں۔

(۴) پیشین گوئی کے جو الفاظ ہیں نہایت واضح اور صاف صاف ہیں ان میں کاہنوں اور نجومیوں کی پیشین گوئیوں کی طرح ابہام وخفا یا شک وتردد کی ہلکی سی آمیزش بھی نہیں ہے دیکھو کس محکم جزم ویقین کے ساتھ ارشاد ہے۔

وَعْدَ اللّٰہِ لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ — یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ اللہ اپنے وعدہ کا خلاف نہیں

وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ — کرتا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔

(۵) دنیا جانتی ہے کہ قرآن کی یہ حیرت انگیز پیشین گوئی کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی اور ٹھیک اسی مدت میں جو قرآن نے مقرر کی تھی۔

اب خود سوچو اور بتاؤ کہ کیا قرآن کی یہ پیشین گوئی اور اس کا سچ ثابت ہونا قرآن کے اعجاز کی اور اس کے وحی الٰہی ہونے کی بین دلیل نہیں ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اس پیشین گوئی کی صداقت کو دیکھ کر بہت سے کافر مسلمان ہو گئے۔[1]

چند اور پیشنگوئیاں اس خاص پیشین گوئی کے علاوہ قرآن مجید میں اور بھی پیشین گوئیاں ہیں جو بعد میں حرف بحرف پوری ہو کر رہیں۔ تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے کہ جب مسلمان صلح حدیبیہ سے واپس لوٹے تو ان میں ایک عام بددلی پائی جاتی تھی اور وہ اس صلح کو اپنے لئے شکست کے مترادف سمجھتے تھے یہاں تک کہ بعض بعض نے تو صاف لفظوں میں اس کا اظہار بھی کر دیا تھا اس پر قرآن مجید نے یہ مژدۂ جانفزا سنایا۔

---

[1] ترمذی تفسیر سورۃ الروم

Marfat.com

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا

ہم نے تو تمہارے لیے عظیم الشان فتح مقدر کردی ہے

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ حدیبیہ کی صلح کو شکست نہ کہو بلکہ یہ درحقیقت پیش خیمہ ہے ایک عظیم الشان فتح کا جو فتح مکہ کے نام سے معروف ہے۔ چنانچہ اسی سورۃ میں ارشاد ہے

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ
شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ
وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ (الفتح)

تم اگر اللہ نے چاہا تو مسجد حرام میں ضرور داخل
ہوگے مامون ومحفوظ کچھ اپنا سر منڈائے ہوں گے
اور کچھ بال ترشوائے ہوئے اور تم خوفزدہ نہیں ہوگے

پھر غزوہ خیبر میں مسلمانوں کو جو مال غنیمت ملا۔ اس کے متعلق پیشینگوئی بھی اس آیت میں پہلے ہی کردی گئی تھی۔

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ
إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا
نَتَّبِعْكُمْ (الفتح)

پیچھے رہ جانے والے اعراب کہیں گے جب کہ
تم مالہائے غنیمت کو لینے جاؤگے کہ ہم کو چھوڑ
دو کہ ہم بھی تمہارے پیچھے پیچھے چلیں۔

فتح مکہ اور فتح خیبر کی پیشینگوئیوں سے زیادہ حیرت انگیز وہ پیشینگوئی ہے جس میں مسلمانوں سے تمکن اور استخلاف فی الارض کا وعدہ کیا گیا ہے ارشاد ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ
فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ
دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ
(مومنون)

تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور
نیک عمل کرتے ہیں اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے
کہ وہ ضرور ان کو زمین میں ایسا ہی خلیفہ بنائیگا
جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو بنایا ہے اور وہ یقیناً
ان کے اس دین کو جس سے وہ (خدا) راضی
ہوگیا ہے طاقتور بنائے گا۔

یہ پیشینگوئی اُس وقت کی گئی جب کہ عرب کے دونوں طرف ایران اور روم کی دو زبردست سلطنتیں قائم تھیں اس وقت کسی شخص کو یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ چند برسوں میں ہی ایک وقت وہ آئے گا جب کہ عرب کے بے سروسامان مسلمانوں کی ایک جماعت ان دونوں کو زیر و زبر کر کے رکھ دے گی لیکن اللہ وعدہ کر چکا تھا اس میں تخلف کس طرح ہو سکتا تھا بالآخر دنیا نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پچاس برس بعد ہی مسلمانوں نے ایک طرف ایرانی سلطنت کی پرانی حشمت وشوکت کو ختم کر کے رکھ دیا اور دوسری طرف مشرقی رومن امپائر کے بہت سے صوبوں پر شام سے لے کر موریٹینش کے انتہائی سرے تک قبضہ کر لیا۔ رب العزت نے مسلمانوں سے استخلاف فی الارض کا جو وعدہ کیا تھا وہ نصف صدی میں ہی اسطرح پورا ہوا کہ خلافت عظمیٰ کا دائرہ اقتدار مشرق میں سندھ تک پھیل گیا مغرب میں بحر اٹلانٹک اور شمال میں اس کا پرچم عظمت اناطولیہ کے قلب وجگر پر لہرایا۔

مسلمانوں کی ان حیرت انگیز فتوحات پر تبصرہ کرتے ہوئے گبن صاحب قرآن کی پیشین گوئی کی صداقت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"شاید اب قرآن کی تفسیر آکسفورڈ کے اسکولوں میں پڑھائی جائیگی اور اس کے ممبروں سے مقدس لوگوں کے لئے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وحی کی صداقت اور اس کے تقدس کا اظہار کیا جائے گا۔"[۵]

علاوہ ازیں یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

ہم نے ہی قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرینگے۔

---

[۵] The Decline and Fall of Roman Empire

Marfat.com

فرما کر قرآن کی حفاظت کا۔ اور

وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ — اللہ تعالیٰ آپکو لوگوں سے محفوظ رکھے گا

فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا جو وعدہ کیا تھا وہ کس طرح حرف بحرف پورا ہو کر رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینے کے کیسے کیسے منصوبے باندھے گئے اور کیا کچھ سازشیں نہیں ہوئیں اور پھر آنحضرت مسلح فوجیوں کی حفاظت میں یا کسی مضبوط قلعہ میں بھی نہیں رہتے تھے۔ لیکن چونکہ خدا وعدہ کر چکا تھا اس لئے دشمنوں کی تمام تدبیریں ناکام رہیں اور وہ آپ کا کچھ نہ کر سکے۔ اسی طرح قرآن کو دیکھو اس کو نازل ہوئے چودہ سو برس ہونے کو آئے اور اس کے باوجود اس کا حرف حرف بلکہ اعراب اور علاماتِ آیات تک جوں کی توں محفوظ ہیں اور صرف کاغذوں میں نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کے سینوں میں کیا دنیا کی کوئی اور کتاب بھی اسطرح محفوظ ہے؟

اس اخبار بالغیب میں جو قرآن کے وجوہِ اعجاز میں سے ایک وجہ ہے۔ قرآن مجید کے وہ قصص بھی داخل ہیں جو انبیاء کرام علیہم السلام یا دوسری اقوام سے متعلق ہیں اور منافقوں کے دلوں میں چھپے ہوئے ان بھیدوں کی اطلاع بھی داخل ہے جن کا ذکر زیادہ تر سورۂ توبہ میں ہے۔

فصاحت وبلاغت قرآن مجید کے اعجاز کی ایک بڑی وجہ اس کا انتہائی فصیح و بلیغ ہونا ہے۔ اس کی تفصیلات میں اگرچہ اختلافات ہیں، لیکن اجمالاً یہ عقیدہ ہر قرن اور ہر دور میں جمہور امت کے نزدیک مسلم رہا ہے کہ قرآن کی فصاحت وبلاغت کا مثل نہیں لایا جا سکتا۔ قرآن نے خود اپنی فصاحت وبلاغت کا اظہار چند آیتوں میں کیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْہِ اَعْجَمِیٌّ وَّھٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ (نحل) — جس کی طرف یہ کفار نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ قرآن کی زبان نہایت واضح اور صاف عربی ہے۔

Marfat.com

قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ (زمر) — قرآن عربی زبان میں ہے جس میں کوئی کجی نہیں ہے

قُرْآنٌ مُّبِينٌ — نہایت واضح اور صاف قرآن

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ — یہ قرآن ایسی زبان میں ہے جو مدعا کو وضاحت سے بیان کرتی ہے۔

فصاحت وبلاغت ذوقی ووجدانی چیز ہے

اس بحث کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگرچہ علماء معانی و بیان نے فصاحت و بلاغت اوران کے مدارج و مراتب کی تعین کے لئے بڑی محنت اور تلاش وجستجو سے اصول و قواعد مدون کئے ہیں اوران کی تشریح و توضیح میں نہایت طول طویل بحثیں کر کے ذہانت وطباعی کی داد دی ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ باعتبار فصاحت وبلاغت دو کلاموں میں موازنہ و ترجیح کا کام اہل لسان کے ذوق و وجدان سے ہی متعلق ہے اوراس قضیہ میں ان کے ذوق کا فیصلہ ہی دلیل قاطع کا حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ کتاب الطراز کے مصنف فصاحت کلام پر طویل بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"یہ جو کچھ بھی ہم نے کہا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی لفظ کے حسن تالیف کے فیصلہ کا دارومدار ذوق سلیم اور طبع مستقیم پر ہے قواعد وضوابط پر نہیں جیسا کہ لوگوں نے سمجھا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہی چند حروف ہیں کہ اگر ایک خاص ترتیب سے ان سے ایک لفظ بنایا جائے تو وہ انتہائی غیر فصیح اور رکیک ہوتا ہے لیکن اگر انھیں حروف سے اس ترتیب کو بدل کر کسی اور ترتیب سے ایک لفظ بنایا جائے تو وہ فصیح تر ہو جاتا ہے۔ مثلاً مَلَعَ اور عَلِمَ۔"[۵]

جب خود اہل زبان بلاغت کا ذوق رکھنے میں یکساں نہیں ہوتے تو غیر اہل زبان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قرآن کے وجوہ اعجاز کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

---

[۵] کتاب الطراز ج ا ص ۱۰۸ و ۱۰۹

Marfat.com

"ازاں جملہ درجۂ علیا از بلاغت کہ مقدور بشر نباشد و چوں مابعد عرب اول آمدہ ایم بکنہ آں نمی توانیم رسید لیکن ایں قدر می دانیم کہ استعمال کلمات و ترکیبات عذبہ جذلہ بالطاف و عدم تکلف قدرے کہ در قرآن می یابیم در ہیچ قصیدۂ از قصائد متقدمین و متاخرین نمی یابیم و ایں امریست ذوقی کہ مہرۂ از شعر آں آنرا بخوبی میتوانند دانست و عوام آں ذائقہ ندارند[۱]"

اسی بنا پر امام راغب اصفہانی نے بالکل درست کہا ہے کہ جو لوگ وجدان صحیح اور ذوق سلیم رکھتے ہیں ان کے لئے اعجاز قرآن کی کسی دلیل کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں وہ خود ہی اس کے قائل ہو جاتے ہیں ان کے برخلاف جو لوگ اعجاز قرآن کی دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں وہ دو قسم کے اشخاص ہوتے ہیں ایک وہ جو ناقص ہونے کی بنا پر کلام الٰہی اور کلام بشری میں امتیاز نہیں کر سکتے اور دوسرے وہ جو نقص کے باوجود عناد بھی رکھتے ہیں[۲]۔

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا اندازہ ان لوگوں کو ہی ہو سکتا ہے جو سلامت ذوق اور استقامت طبع کے ساتھ عرب کے اساتذۂ شعر و سخن کے کلام کا مطالعہ کئے ہوئے ہوں اور جنھوں نے علم معانی و بیان پر اساتذۂ متقدمین کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اپنے ذوق و وجدان کو پختہ اور شائستہ بنا لیا ہو[۳]۔

۱؎ الفوز الکبیر ص ۳۸ ۔ ۲؎ کتاب الذریعہ ص ۷۰

۳؎ ہمارے ہندوستان کے مدارس عربیہ میں ان فنون کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ اس مقصد کیلئے بالکل ناکافی ہیں ان کی جگہ اگر کتب ذیل پڑھائی جائیں تو خاطر خواہ فائدہ ہو سکتا ہے (۱) اسرار البلاغۃ و دلائل الاعجاز امام عبد القادر جرجانی (۲) کتاب الصناعتین ابو ہلال العسکری (۳) الخصائص ابن جنی (۴) اساس البلاغۃ زمخشری (۵) کتاب الطراز یحییٰ بن حمزہ (۶) کتاب الفوائد حافظ ابن قیم (۷) مغنی اللبیب ابن ہشام

Marfat.com

بلغاء وشعراء عرب پر قرآنی بلاغت کا اثر | جو لوگ اس نعمت خداداد سے بہرہ وافر رکھتے ہیں وہ خواہ
مسلمان ہوں یا غیر مسلم بہر حال اس پر مجبور ہیں کہ بلاغت و فصاحت کے اعتبار سے بھی قرآن کے اعجاز کے قائل ہوں۔ چنانچہ تاریخ ادبیات عرب کا مطالعہ کیا جائے تو اس قسم کے صدہا واقعات ملتے ہیں کہ لوگوں نے قرآن مجید کی ایک آیت سن کر ہی اسکے وحی الہٰی ہونے کا اقرار کر لیا ہے۔

عتبہ بن ربیعہ قریش کا بڑا صاحب اثر و رسوخ شخص تھا۔ بدر کی جنگ میں مارا گیا ہے ایک مرتبہ اہل قریش کے ساتھ ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم الگ مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ عتبہ اہل مجلس کے مشورہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ارادہ یہ تھا کہ آپ کو مال وغیرہ کا لالچ دے کر دعوتِ اسلام سے باز رکھنے کی کوشش کرے عتبہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "حٰمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کی سورۃ کا کچھ حصہ تلاوت کر کے سنایا۔ عتبہ نے اپنے دونوں ہاتھ پس پشت لیجا کر ان پر ٹیک لگا لی اور نہایت خاموشی سے سنتا رہا۔ سورۃ کی تلاوت کرتے کرتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آیت سجدہ تک پہونچے تو آپ نے سجدۂ تلاوت کیا اور پھر عتبہ سے مخاطب ہو کر فرمایا ابو الولید! کیا اب بھی تم اپنے اسی پرانے خیال پر جمے ہوئے ہو؟ عتبہ یہ سن کر اپنے لوگوں میں واپس چلا آیا لیکن قرآن مجید کی آیات کو سننے کا اثر اس کے چہرہ بشرہ سے ظاہر ہو رہا تھا۔ ارباب مجلس نے جب اس سے پوچھا تو کہنے لگا۔ خدا کی قسم میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے کہ اس جیسا آج تک سنا ہی نہیں تھا خدا یہ کلام ہرگز ہرگز نہ شعر ہے نہ کوئی جادو ہے اور نہ کسی کاہن یا نجومی کا قول ہے" اے قریش والو تم میری بات مانو۔ [۵۸]"

انیس قبیلۂ غفار کے بڑے نامور شاعر تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا سنکر

---

[۵۸] شرح زرقانی علی المواہب ج ۵ ص ۹۸۔ ۹۹

چھپے چوری مکہ آئے اور آنحضرتؐ کی زبان مبارک سے قرآن مجید کی کچھ آیتیں سنکر واپس گئے ان کے بھائی حضرت ابوذر نے پوچھا کہ تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیسا پایا؟ وہ بولے "لوگ کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں ساحر ہیں یا کاہن ہیں، لیکن میں نے کاہنوں کا کلام سنا ہے اور شعر کے اسالیب وطرق سے بھی واقف ہوں میں نے محمد کے کلام کو ان سب پر منطبق کر کے دیکھا. خدا کی قسم وہ ان سب سے بالکل الگ اور ایک اور ہی عجیب طرح کا کلام ہے. بخدا محمد سچے اور قریش کے لوگ جھوٹے ہیں[1]"

ولید بن مغیرہ بڑا دولت مند اور قریش میں فصاحت کا امام تھا ایک مرتبہ اس نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر کچھ سنانے کی درخواست کی. آنحضرت نے "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ" والی آیت آخر تک تلاوت فرما کر سنائی. ولید اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے مکرر تلاوت کرنے کی فرمائش کی جب آنحضرت دوسری مرتبہ بھی سنا چکے تو ولید بولا "خدا کی قسم اس کلام میں کچھ اور ہی شیرینی ہے اور تازگی بھی نئی قسم کی ہے. اس نخل کا اعلیٰ حصہ ثمر آور ہے اور اس کا حصہ زیریں مضبوط تنہ ہے اور کوئی بشر اس جیسا کلام نہیں کر سکتا[2]"

شاہ حبش کے متعلق مشہور ہے ہی کہ جب اس کے دربار میں حضرت جعفر نے سورہ مریم کی تلاوت کی تو وہ اس درجہ متاثر ہوا کہ بیساختہ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے پھر بولا خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں[3]"

قبیلۂ ازد کے ایک شخص ضماد تھے جھاڑ پھوک کا کام کرتے تھے ایک مرتبہ مکہ آئے اور یہاں کے لوگوں سے سنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو (نعوذ باللہ) جنون ہو گیا ہے ضماد یہ خ

---

[1] صحیح مسلم اسلام ابی ذر
[2] شرح زرقانی ج ۵ ص ۱۰۰
[3] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۱۰

کرکے کہ میں آپ کا علاج کروں گا۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرتؐ نے ان کے سامنے مختصر سی حمد اور کلمۂ شہادت پڑھا، ضماد پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا اور تین مرتبہ آپ سے اس کا اعادہ کرایا اور پھر کہا" بیں نے کاہنوں، جادوگروں اور شاعروں ان میں سے ہر ایک کا کلام سنا ہے لیکن آپ جیسے کلمات تو سنے ہی نہیں یہ کلام تو سمندر کی گہرائیوں تک اتر جائیگا اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر بیعت کرلی[۱]۔"

عمروبن جموح قبیلۂ بنوسلمہ کے نامی گرامی سردار تھے ان کے بیٹے معاذ اسلام قبول کرکے واپس آئے تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھا کہ تم نے آپ سے کیا سنا ہے معاذ نے سورہ فاتحہ الحمد للہ رب العٰلمین سے لیکر الصراط المستقیم تک پڑھ کر سنائی عمروبن جموح پر بڑا گہرا اثر پڑا، کہنے لگے" یہ کلام تو بڑا ہی عمدہ ہے اور خوب ہے کیا آپ کا سب کلام ایسا ہی ہے بولے" جی ہاں! بلکہ اس سے بھی عمدہ" اس کے بعد وہ مسلمان ہو گئے[۲]۔"

جس زمانہ میں قرآن مجید نازل ہوا عرب کا بچہ بچہ شعروشاعری کا ذوقِ خداداد رکھتا تھا آتش بیان خطبا قبیلہ قبیلہ میں موجود تھے جو کسی بڑے سے بڑے شاعر و خطیب کے کلام کو نظر میں نہیں لاتے تھے فصاحت و بلاغت کا جوہر ایک ایک شخص کے خمیر میں پڑا ہوا تھا اور وہی ان کے لئے سب سے بڑا سرمایہ نازش و افتخار تھا اب غور کرو فصاحت و بلاغت اور شعر و خطابت کی اس گرم بازاری کے عہد میں مکہ کی خاکِ پاک سے ایک نبی امی کا ظہور ہوتا ہے وہ چالیس سال تک خاموش زندگی بسر کرنے کے بعد یکایک ایک نئے پیغام کی دعوت لے کر اٹھتا ہے اور اس دعوت کی سچائی کے ثبوت میں ایک کلام (قرآن) پیش کرتا ہے اس کلام کو پیش کرکے وہ عرب کے

---

[۱] صحیح مسلم باب الاقتصاد فی الصلوٰۃ والخطبہ

[۲] شرح زرقانی ج ۵ ص ۱۰۲

نامور شاعروں، شعلہ فشاں مقرروں اور خطیبوں اور میدان فصاحت و بلاغت کے شہسواروں کو ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار نرمی اور لین سے نہیں بلکہ نہایت سخت زجر و توبیخ کے انداز میں پھر یکے بعد دیگرے نہیں بلکہ سب کو ایک ساتھ چیلنج دیتا ہے کہ اگر یہ لوگ اس کے دعویٰ کی تکذیب میں سچے ہیں تو سارے قرآن کا نہیں اس کے کسی ایک جزء کا ہی مثل لاکر دکھا دیں۔

پھر کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس نبی امی کی مخالفت اور خصومت میں کیا کچھ نہیں کہا اور کیا گیا لیکن یہ عرب کے نامور خطبا اور شعرا سب مل کر بھی قرآن مجید کی تحدی کے جواب میں اس کی کسی ایک سورۃ کا مثل لا سکے ہرگز نہیں سب کی زبانیں گنگ تھیں اور قوت فصاحت و بلاغت مفلوج پھر جو لوگ ان میں پاک باطن اور صاف سینہ تھے انھوں نے کھلے لفظوں میں اپنی شکست و عجز کا اقرار کیا اور قرآن کے اعجاز بیان سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے شاعری کو ہی خیر باد کہہ دیا۔ لبید عرب کے مشہور شاعر ہیں جن کا ایک قصیدہ سبعہ معلقہ میں بھی شامل ہے اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ صرف ایک دو شعر منقول ہیں ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ان سے شعر سنانے کی فرمائش کی تو انھوں نے جواب دیا جب خدا نے مجھ کو بقرہ اور آل عمران سکھائی تو اب مجھے شعر کہنا موزوں نہیں[۱] ان کے علاوہ حسان بن ثابت کعب بن مالک عبداللہ بن رواحہ طفیل بن عمر زید الخلیل کعب بن زہیر شماس اسود بن سریع وغیرہم عرب کے نامی گرامی شعرا تھے لیکن قرآن مجید کے دعویٰ اعجاز کے سامنے سب کی گردنیں خم ہوگئیں اور بجائے مخالف ہونے کے اسلام کے زبردست حامی بن گئے۔

قرآن مجید کے اعجاز بیان کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی صاحب ذوق کے سامنے اسکی کوئی آیت تلاوت کی جائے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کلام کا قائل کون ہے تب بھی لامحالہ سننے والے پر

---

[۱] اسد الغابہ ج ۴ ص ۲۶۱ و ۲۶۲

Marfat.com

اس کا اثر ضرور ہوگا تاریخ اور ادب کی کتابوں میں جستجو کی جائے تو اس قسم کے سینکڑوں واقعات مل سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے ایک شخص سے "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" سنا تو فوراً سر بسجود ہو گیا اور بولا "میں نے اس وقت اس کلام کی فصاحت و بلاغت سے ہیبت زدہ ہو کر سجدہ کیا ہے"
ایک اعرابی نے کسی شخص سے قرآن پاک کی آیت فَلَمَّا اسْتَيْأَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا سنی تو بولا "میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی مخلوق اس جیسا کلام بولنے پر قادر نہیں ہے۔"

ایک دفعہ عربی لغت کے مشہور امام اصمعی نے ایک کمسن بچی کو دو شعر پڑھتے ہوئے سنا شعر سن کر بولے "اللہ اکبر! یہ شعر کس درجہ فصیح و بلیغ ہیں" لڑکی بولی "کیا اللہ تعالیٰ کے ارشاد

وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ	اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی بھیجی کہ تم اس کو دودھ
فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي	پلاؤ اور جب تم کو اس کے متعلق خوف ہو تو اسے
الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا	دریا میں ڈال دو اور نہ خوف کرو نہ غم ہم پھر
رَادُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ	موسیٰ کو تمہاری طرف لوٹا دیں گے اور اس کو
الْمُرْسَلِيْنَ	رسول بنائیں گے۔

کے بعد بھی کوئی کلام اب اس کا مستحق ہے کہ اسے فصیح کہا جائے۔ تم دیکھتے نہیں کہ اس ایک آیت میں کس خوبی سے اللہ نے دو امر ارضعیہ اور القیہ دو نہی لَا تَخَافِيْ لَا تَحْزَنِيْ دو خبریں اِنَّا رَادُّوْهُ اور جَاعِلُوْهُ اور دو بشارتیں جمع کر دی ہیں۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں سو رہے تھے کہ اتنے میں روم کی فوج کا ایک کمانڈر انچیف آیا اور کلمۂ تشہد پڑھنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے اس کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ میں نے مسلمان قیدیوں سے ایک قیدی کی زبانی یہ آیت سنی وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ

Marfat.com

وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللهَ وَيَتَّقْهِ الآیہ اور اس سے اس درجہ متاثر ہوا کہ آپ کے سامنے اسلام قبول کرتا ہوں[۱]"

ان واقعات کے علاوہ صحابہ کرام کے حالات زندگی پڑھو تو معلوم ہو گا کہ قرآن مجید ان پر کیا اثر کرتا تھا حضرت عمرؓ کے متعلق کون نہیں جانتا کہ انھوں نے اپنی بہن فاطمہ سے سورۃ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سنی تو یہ حال ہوا کہ یا تو سخت غصہ میں بھرے ہوئے تھے اس سورت کو سنتے ہی ان کا حال دگرگوں ہو گیا ایک ایک لفظ دل پہ تیر وسنان کا کام کرتا تھا یہاں تک کہ جب فاطمہ آمِنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهِ پر پہونچی تو وہ بے ساختہ پکار اٹھے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً رسول اللہ

حضرت عثمان بن مظعون نے جب سورہ نحل کی یہ آیت سنی۔

اِنَّ اللهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	بے شبہ خدا عدل اور احسان اور قرابتداروں
وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ	کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اور
الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ	بدکاری اور بری باتوں ہو ظلم سے روکتا ہے
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۔	تاکہ تم اس سے نصیحت پذیر ہو۔

تو انھوں نے فرمایا "اب اس وقت میرے دل میں ایمان جاگزین ہو گیا اور میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے لگا[۲]"

حضرت جبیر بن مطعم اسیران بدر کو چھڑانے آئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سورۂ طور کی چند آیتیں سنی تو ان کا دل اڑنے لگا[۳]" حضرت طفیل بن عمرو دوسی کے

---

[۱] یہ سب واقعات شرح زرقانی ج ۵ ص ۱۰۳ و ۱۰۴ سے ماخوذ ہیں

[۲] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۳۱۸ — [۳] صحیح بخاری تفسیر سورۂ طور

Marfat.com

کانوں میں اتفاقیہ قرآن کی چند آیتیں پہونچ گئیں تو حلقہ بگوش اسلام ہو گئے[1] حبش سے بیس آدمیوں کی ایک جماعت خدمت اقدس میں حاضر ہوئی آپ نے ان کو قرآن مجید کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا تو ان کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے[2] طائف کے سفر میں حضرت خالد العدوانی نے آپ کی زبان سے

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ — آسمان کی قسم اور رات میں آنے والے کی قسم

سنی تو اسی وقت پوری سورۃ دل میں اترتی چلی گئی اور آپ مسلمان ہو گئے[3]

افراد و اشخاص کا کیا ذکر ہے صحابہ کی تو جماعت ہی قرآن مجید کے اثر سے متاثر ہوئی حضرت ابو عبیدہ حضرت ابو سلمہ اور حضرت ارقم بن ابی ارقم اسی کتاب الٰہی کی مقناطیسی کشش سے کھنچکر اسلام لائے تھے[4]

پھر اسلام لانے کے بعد بھی صحابہ کا یہ حال تھا کہ ایک ایک آیت پر کلام الٰہی کی ہیبت سے آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جو خود حامل وحی تھے بسا اوقات کسی کی زبان سے قرآن مجید سن کر رونے لگتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے قرات شروع کی تو چشم مبارک سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔

قرآن کی یہ معجزانہ فصاحت و بلاغت ان لوگوں کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہی جو اہل زبان

---

[1] طبقات ابن سعد تذکرۂ طفیل بن عمرو الدوسی

[2] سیرۃ ابن ہشام

[3] مسند امام احمد بن حنبل ج ۴ ص ۳۳۵

[4] اسد الغابہ تذکرہ ابو سلمہ

Marfat.com

سنتے تھے اور ساتھ ہی غیر مسلم بھی تھے ڈاکٹر ٹیلر، موسیو سدیو، گبن، ڈیون پورٹ، ٹالسٹائی۔ کارلایل ہنری دی کاستری۔ راڈویل ان لوگوں نے بھی قرآن مجید کے اسلوب بیان اور اس کی تاثیر وتسخیر کا اعتراف صاف لفظوں میں کیا ہے۔[۵۱]

ژان ژاک روسو نے اپنی ایک تحریر میں قرآن مجید کی تاثیر اور اس کے اعجاز کا ذکر ایک عجیب پیرایہ میں کیا ہے جو آج کل کے بعض مدعیان عربی داں پر پورے طور پر صادق آتا ہے وہ لکھتا ہے:-

"بعض لوگ ہیں جو عربی برائے نام ہی جانتے ہیں وہ جب قرآن پڑھتے ہیں تو ہنسنے لگتے ہیں۔ لیکن اگر اس قسم کے لوگوں کو اس بات کا موقع مل جاتا کہ وہ براہ راست محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس حد درجہ اثر انگیز اور دلوں میں گھر کرنے کی والی زبان کو سنتے تو بے شبہ یہ لوگ زمین پر سجدہ میں گر پڑتے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پکار کر کہتے کہ "اے نبی" آپ ہمارا ہاتھ پکڑ لیجئے، پھر آپ کا جہاں جی چاہے ہم کو لے چلئے۔ خواہ شرف ومجد کی طرف یا خطروں اور ہلاکتوں کی جانب ہم تو اب آپ کی وجہ سے موت کو بھی محبوب رکھنے لگے ہیں۔

عدم اختلاف قرآن نے اپنے اعجاز کی ایک دلیل عدم اختلاف وتناقض کو بھی بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا	اگر قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔

عام مصنفین کی بڑی بڑی اہم تصنیفات سے قطع نظر یہ دیکھو کہ دوسرے مذاہب کی

---

۵۱ دیکھو تفصیل کے لئے اسلام والحضارة العربیہ جلد اول اور ادب العرب

۵۲ بحوالہ الاسلام والحضارة العربیہ ج ۱ ص ۶۹

خود الہامی اور آسمانی کتابوں کا کیا حشر ہوا؟ ایک اڈیشن دوسرے اڈیشن سے مختلف ہے لیکن قرآن نے اپنی صداقت میں جس دلیل کو پیش کیا تھا وہ دشمنوں کی ہزار کوششوں کے باوجود آج تک آفتاب نیمروز کی طرح روشن وظاہر ہے تقریباً بتیس تینتیس برس پہلے ڈاکٹر منگانا نے قرآن مجید کے کسی نئے نسخے کے ملنے کی اطلاع سے دنیا میں ایک تہلکہ برپا کر دیا تھا لیکن باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ مصر اور ہندوستان کے علماء نے کس طرح ڈاکٹر صاحب کے بے بنیاد دعویٰ کو باطل محض کر دکھایا تھا

احکام وشرائع | خود قرآن کے بیان کے مطابق اس کے اعجاز کی ایک وجہ اس کے تشریعی احکام ومسائل ہیں قرآن نے بار بار اپنے آپ کو ہدایت نور دلیل روشن رحمت بصیرت اور حجت کہا ہے غور کرو قرآن مجید کے اعجاز کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ چالیس سال کی خاموش زندگی کے بعد یکایک ایک امّی ایک صحیفہ مقدس لئے ہوئے دنیا کے سامنے ظاہر ہوتا ہے اور اس صحیفہ سے وہ جاہلوں کو دانشورانِ روزگار اور اونٹ چرانے والے بدویوں کو بہترین تہذیب وتمدن اخلاق فاضلہ اور اعمالِ صالحہ کا پیکر اتم بنا دیتا ہے۔ اصولِ اخلاق وقانون حکمت وفلسفہ اور محاسنِ علم وعمل کی بزم کا گوشہ گوشہ اس کے پرتوِ قدس سے بقعۂ نور بن جاتا ہے۔

قرآن کا محکم دستور العمل | جو قوانین وضوابط قرآن نے پیش کئے وہ اس قدر صحیح اور مکمل ہیں کہ آج علوم وفنون کی بڑی گرم بازاری اور انسانی عقل وخرد کی حیرت انگیز ترقی وبلند پروازی کے باوجود معاشرت تہذیب وتمدن نکاح وطلاق بیع وشرا تقسیم میراث اور عام معاملات واخلاق کے قوانین قرآنی قوانین کے مقابلہ میں سالہا سال کے تجربوں کے بعد ناکام ہی ثابت ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ دوسری قوموں کو جب کبھی اپنی سوشل اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنی پرانی مزعومہ یا اصلی روایات مذہبی کو چھوڑ کر اسلام کے احکام وقوانین کے دامن ہی میں پناہ لی ہے۔

اس پر اگر تفصیل سے کلام کیا جائے تو ایک مستقل کتاب درکار ہے مجملاً اسقدر لکھ دینا کافی ہوگا کہ

Marfat.com

یورپ نے بہت دنوں تک طلاق کا مذاق اڑایا۔ تعدد ازدواج پر طعنہ زنی کی اور مسلمانوں کے جہاد کو وحشت اور بربریت کہا۔ مگر آخر کار اس کو خود طلاق کا قانون وضع کرنا پڑا۔ پھر یہ دیکھو کہ اسلام نے طلاق کا اختیار مرد کو دیا تھا نہ کہ عورت کو۔ کیونکہ عورت فطرتاً بہت زود رنج اور جلد متاثر ہو جانے والی ہے۔

یورپ والوں نے طلاق کو مشروع تو کیا لیکن غلطی یہ کی کہ اس کا اختیار عورت کو دیدیا گویا پہلے یہ لوگ تفریط میں مبتلا تھے اور اب افراط میں مبتلا ہو گئے۔ اس کا جو کچھ بھی نتیجہ ہوا آج ہر باخبر شخص اس سے ناواقف نہیں ہے کہ طلاق کی کثرت نے کس طرح ان لوگوں کی معاشرتی زندگی ویران و تباہ کر رکھی ہی۔

ہندوؤں میں عقد بیوگان کا رواج نہیں تھا۔ مذہبی اعتبار سے وہ اسے بہت بڑا پاپ سمجھتے تھے۔ لیکن جب اس ممانعت نے ان کی سوسائٹی میں چند در چند اخلاقی معائب پیدا کر دئے اور ان کو اپنی اصلاح کا خیال ہوا تو انجام کار انھیں وہی کرنا پڑا جس کا اعلان اب سے ساڑھے تیرہ سو سال سے بھی زیادہ مدت پہلے ایک نبی امی کی زبان سے ہو چکا تھا یہی حال میراث کا ہی۔ ہندوؤں میں بیٹی کو ترکہ پدری سے کوئی حصہ نہیں ملتا تھا لیکن اب جن ہندو ریاستوں میں سماجی اصلاح کی کوششیں ہو رہی ہیں وہاں برملا کہا جا رہا ہی کہ بیٹی کو بھی حصہ ملنا چاہیئے اب اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ قانون قرآنی کے متناسب و متوازن ہونیکا یہ عالم ہے کہ وہ بیٹی کو باپ کے ترکہ میں سے حصہ دلاتا ہی لیکن بیٹے سے نصف اس میں حکمت یہ ہے کہ بیٹے کو کسب معاش کے لئے کارگاہ زندگی میں تگ و دو کرنی پڑتی ہے اور تمام بار اس کو ہی اٹھانا پڑتا ہے، رہی بیٹی تو اس کو کمانے کے لئے خود کچھ نہیں کرنا پڑتا بلکہ اس کا نان نفقہ شادی کے بعد شوہر کے ذمہ ہوتا ہے۔

یورپ نے تعدد ازدواج پر کیا کچھ لعن طعن نہیں کیا لیکن اب خود وہاں کے بڑے بڑے حکماء اور مفکرین تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام میں تعدد ازدواج کی اجازت بہت سے اخلاقی فواحش و مفاسد کے انسداد کا کامیاب ذریعہ ہی اسی طرح یورپ نے "جہاد" کو وحشت اور درندگی کہا۔ لیکن اب دیکھو کہ خود

Marfat.com

یورپ میں کیا ہو رہا ہے کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اب دبی زبان سے یورپ نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ جب تک دنیا فتنہ و شر اور خواہشاتِ نفسانی و اغراض فاسدہ کی آماجگاہ ہے کسی حق کی حفاظت کیلئے تلوار سے کام لینا ناگزیر ہے۔ البتہ ہاں فرق اسقدر ضرور ہے کہ قرآن میں جس جنگ کا حکم ہے وہ وہی جنگ ہے جو حق کی حمایت و حفاظت کے لئے لڑی جائے نسلی اور قومی عصبیت کی برتری قائم رکھنے کیلئے جنگ نہ صرف یہ کہ جائز نہیں ہے بلکہ بڑی معصیت ہے اور یہاں انجیل کے پیرو جو کچھ کر رہے ہیں وہ محض اپنی قومی فوقیت کو برقرار رکھنے اور دوسرے ملکوں اور قوموں کو اپنے دامِ حکومت میں پھنسانے کے لئے کر رہے ہیں۔ پس غور کرو کہ کیا یہ قرآن کا اعجاز نہیں ہے کہ وہ جو دستور العمل اور نظام زندگی پیش کرتا ہے وہ ایسا جامع محکم اور ناقابل تغیر و تبدل ہے کہ صدیوں کے گذر جانے اور عقل و فکر کی حیرت انگیز ترقی کے باوصف اسکی کسی ایک دفعہ میں بھی کوئی ترمیم و تنسیخ نہیں ہو سکتی اور اس بنا پر مسلمان اس بات کے محتاج نہیں ہیں کہ اپنی کسی سوشل اصلاح کیلئے وہ کسی دوسرے قانون و نظام سے دریوزہ گری کریں تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کسی جماعت نے قرآن کے دستور سے منحرف ہو کر کسی قوم کی نقالی کی اس نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں اسکے برعکس دوسری قوموں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی کی اصلاح کیلئے جب کبھی غور و فکر سے کام لیتی ہیں انھیں مجبوراً اپنی دیرینہ روایات مذہبی و سماجی کو پس پشت ڈالکر اسلام کے دستور سے ہی بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ پس کیا کوئی طاقت ہے جو قرآن کے دعویٰ

كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ — ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں مضبوط ہیں

اور جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ — ہم نے اسکو نور بنایا ہے کہ جو چاہتے ہیں اسکے ذریعہ سے راستہ دکھاتے ہیں

کی ذرا بھی تکذیب و تغلیط کر سکے" سورۂ قصص میں قرآن مجید اپنی اس حیثیت کو بطور تحدی اسطرح بیان کرتا ہے

قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ — کہدیجئے اے محمد تم اللہ کے پاس سے کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو ان دونوں (قرآن اور توراۃ) سے زیادہ ہدایت دینے والی ہو میں اسکا اتباع کرونگا اگر تم سچے ہو

Marfat.com

قرآن کی روح سے تشبیہ جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید سراپا نور اور حسن وجمال ہے سطور بالا میں جو چند وجوہ اعجاز بیان کئے گئے ہیں وہ صرف اس کے ایک رخ پر بوزن کی ناتمام سی تشریح کرتے ہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کو ایک مقام پر روح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (زخرف)

اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے آپ پر روح کو بطور وحی نازل کیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح روح ایک حقیقت ثابتہ ہے اسکے افعال وآثار ہر شخص پر عیاں ہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ مادی اور جسمانی زندگی کا قیام روح کے اتصال بالجسم پر موقوف ہے لیکن اسکے باوجود آج تک روح کی حقیقت وماہیت متعین نہیں کی جاسکی اسی طرح قرآن مجید اخلاق وحسن عمل کی روح ہے اس پر عمل کرنے کے بعد ہر شخص اس کے اثرات ونتائج بین طور پر محسوس کرسکتا ہے لیکن بایں ہمہ کوئی شخص اس کی پوری حقیقت وکنہ سے واقفیت حاصل نہیں کرسکتا۔

حضرت علیؓ کا ارشاد حضرت علیؓ نے قرآن مجید کی نسبت ایک نہایت بلیغ کلام کیا ہے ہم وجوہ اعجاز کی بحث کو اس پر ہی ختم کرتے ہیں۔

"قرآن علماء کی پیاس کے لئے سامان سیرابی ہے اور فقہا کے دلوں کے لئے فصل بہار وہ صلحا کے لئے ایک جادۂ مستقیم ہے اور ارباب بحث ونظر کیلئے برہان قوی وہ طلبۂ علوم کیلئے علم کا انمول خزانہ ہے اور اربابِ حکومت کے واسطے ایک محکم دستور اساسی وہ اصحابِ روایت کے لئے حدیث جانفزا ہے اور تشنگانِ تحقیق وجستجو کے لئے امید ورجاء کا سب سے بڑا سہارا (نہج البلاغۃ)

حق کی حجت تمام ہوچکی اب اس پر بھی اگر کوئی سرگشتہ وادیِ ضلالت وگمرہی ہدایت کی روشنی نہیں پاتا تو نہیں کہا جاسکتا کہ

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ

اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے[1]

[1] یہاں یہ جتادینا ضروری ہے کہ ہم نے کتاب کے موضوع بحث کی مناسبت سے اعجاز قرآن پر مختصر گفتگو کی ہے ورنہ اس بحث کے لئے ایک مستقل ضخیم کتاب درکار ہے عربی میں خاص اسی موضوع پر کئی عمدہ اور مفصل کتابیں موجود ہیں۔

Marfat.com

قرآن مجید کا اسلوب بیان اور بعض عیسائی مصنفین

کتاب کے آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض ان اعتراضات اور ان کے جوابات کا بھی ذکر کر دیا جائے جو بعض عیسائی مصنفین نے قرآن پر کئے ہیں ان لوگوں کا ایک عام اعتراض یہ ہے کہ نزولِ قرآن سے پہلے عرب میں بعض پرزور خطیب مثلاً قس بن ساعدہ اور شعراء مثلاً امیۃ بن الصلت ایسے موجود تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے ان کے خطبے اور اشعار سنے تھے اور ان لوگوں کے کلام میں بعض چھوٹے چھوٹے فقرے قرآن کی چھوٹی چھوٹی آیتوں کے انداز کے پائے جاتے ہیں، عیسائی مصنفین اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کا اسلوب انھیں لوگوں سے لیا ہے قس بن ساعدہ کے خطبات اور امیہ بن الصلت کے اشعار عربی ادب و محاضرات کی کتابوں میں بکثرت منقول ہیں انکی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے یہاں ان کے نقل کرنیکی ضرورت نہیں۔

اس اعتراض کے جواب میں سب سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیئے کہ قس بن ساعدہ اور امیۃ کے جن اشعار کو پیش کر کے قرآن مجید کے اسلوب پر اعتراض کیا جاتا ہے انکی نسبت تحقیق یہ ہے کہ وہ سب موضوع ہیں۔ اس بنا پر وہ نزولِ قرآن سے پہلے کا نہیں بلکہ بعد کا کلام ہے اصل یہ ہے کہ بنو امیہ اور عباسیہ کے عہد میں کچھ ایسے لوگ تھے جو خلفاء و امراء سے بیش از بیش انعام حاصل کرنے اور بعض دوسری اغراض کیلئے از خود کلام گھڑ گھڑ کر شعراء و خطباء جاہلیت کیطرف اسے منسوب کر کے سنا دیتے تھے ان وضاعین میں حماد الروایۃ اور خلف بن حیان الاحمر زیادہ مشہور ہیں ایک مرتبہ ولید بن یزید نے حماد سے پوچھا "تمہیں کتنے اشعار یاد ہیں بولا" بہت زیادہ اگر آپ سننا چاہیں تو ایک نشست میں ہی ہر ہر حرف تہجی کے سو سو طویل قصیدے صرف شعراء جاہلیت کے سنا سکتا ہوں" ظاہر ہے کہ حماد کا یہ عجیب و غریب دعویٰ خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شعراء جاہلیت کیطرف منسوب کر کے جو اشعار سناتا تھا ان میں بہت کچھ اسکے خود ساختہ و پرداختہ اشعار بھی شامل ہونگے چنانچہ اصمعی نے ایک مرتبہ کہا "حماد اعلم الناس ہے اگر وہ اشعار میں کمی بیشی نہ کرے" علامہ یاقوت الحموی لکھتے ہیں کہ

اصمعی نے یہ اس لئے کہا کہ حماد کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ وہ شعر از خود کہتا ہے اور پھر شعرا عرب کی طرف اسے منسوب کر دیتا ہے۔ مفضل الضبی کا قول ہے "شعر پر حماد کی وجہ سے ایسی آفت ٹوٹی ہے جس کی کبھی اصلاح نہیں ہو سکتی یہ شخص قدیم شاعروں کے محاورات انداز بیان اور ان کے لغات و اسلوب ادا سے پوری طرح واقف تھا اس لئے ان کے ہی طرز میں شعر کہکر انکی طرف منسوب کر دیتا تھا اور سوائے ماہر فن نقاد کے عام لوگوں کو امتیاز نہیں ہو سکتا تھا کہ اس قصیدہ میں کتنے شعر شاعر کے ہیں اور کتنے خود حماد کے کہے ہوئے ہیں" ۱۵۵ھ میں انتقال ہوا۔

یہی حال خلف الاحمر کا تھا' اس کا باپ ابو بردہ بلال بن ابی موسیٰ الاشعری کا غلام تھا' اشعار کے وضع میں یہ حماد کا ہم پایہ تھا۔ کتاب "ابناء الرواۃ" میں ہے کہ یہ شخص اتنا بڑا حاذق اور ماہر لغت و ادب تھا کہ اپنے اشعار شعرا جاہلیت کے نام سے پڑھ کر سنا دیتا تھا اور بڑے بڑے زباں دانوں کو یہ محسوس نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ اشعار خود اس کے طبعزاد ہیں' ابو الطیب عبد الواحد اللغوی کا بیان ہے

كَانَ خَلَفٌ يَضعُ الشعرَ وَيَنسبُهُ	خلف اشعار وضع کرتا تھا اور انھیں عرب کی طرف
إلى العربِ فلا يُعرَفُ ۵۳	منسوب کر دیتا اور (لطف یہ ہے) اسکا پتہ نہیں چلتا تھا

ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ چونکہ قرآن نے اپنی غیر معمولی فصاحت و بلاغت کے باعث تمام عرب کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا۔ بچہ بچہ کی زبان پر قرآن کی آیتیں تھیں جنھیں بے تکلف بول چال اور تقریر و خطابت میں استعمال کر کے اپنے کلام کو مزین کرتے تھے۔ انداز خیال۔ اسلوب بیان اور طرز کلام و گفتگو سب قرآن مجید کے نظم کلام سے متاثر تھے اس بنا پر یہ قیاس کرنا بالکل صحیح ہے کہ حماد الراویۃ اور خلف الاحمر ایسی وضع و قماش کے لوگ اپنے جن نتائج فکر کو قدیم شعرا عرب کی طرف منسوب کرتے تھے

۵۱ معجم البلدان ج ۱۰ ص ۲۶۵ جدید اڈیشن ۵۲ ایضاً ص ۲۶۵، ۲۶۶

۵۳ معجم البلدان ج ۱۱ ص ۶۸

Marfat.com

ان میں قرآن مجید کے اسلوبِ بیان کی جھلک اضطراری یا اختیاری طور پر نمایاں ہوجاتی تھی. ہم تمثیلاً تین شعر نقل کرتے ہیں جو بالعموم امیۃ بن الصلت کی طرف منسوب ہیں - انھیں پڑھو اور غور کرو، صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید سامنے رکھ کر یہ اشعار تصنیف کئے ہیں۔

فقلت لہ اذھب بھارون فادعوا الی اللہ فرعون الذی کان طاغیاً

وقولا لہ انت رفعت ھذہ بلا عمدٍ ارفق اذا بک بانیا

وقولا لہ انت سوّیت وسطھا منیراً اذا ما جنّہ اللیل ھادیا

ان اشعار کے ساتھ قس بن ساعدۃ کے خطبہ کا ایک ٹکڑا بھی ملاحظہ فرمایئے کہتا ہے[۱]

"نبیًا قد حان حینہ واظلکم اوانہ فطوبیٰ لمن آمن بہ فھداہ وویلٌ لمن خالفہ وعصاہ"

جو لوگ زبان عربی کا ذوق رکھتے ہیں وہ فوراً محسوس کریں گے کہ اس عبارت میں جو الفاظ قرآن مجید کے آ گئے ہیں ان کا دوسرے الفاظ کے ساتھ جوڑ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ٹاٹ میں مخمل کے کسی ٹکڑے کا پیوند اور اس بنا پر پوری عبارت صاف بتا رہی ہے کہ یہ نزولِ قرآن سے پہلے کی نہیں بلکہ بعد کی ہے۔

عجب بات یہ ہے کہ پروفیسر مارگولیوتھ اس قسم کے معترضین میں سب سے پیش پیش ہیں مگر ایک جگہ خود انھیں بھی اعتراف ہے کہ "قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موضوع کیا گیا ہے"[۲]۔

اشعار موضوعہ کی تنقید | جس طرح مسلمانوں میں بعض شریر النفس لوگوں کی کوششوں سے احادیث موضوعہ کا چرچا ہوا تو ارباب فن نے ان کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا اور ایک ایک لفظ اور ہر ایک راوی پر ایسا نقد و جرح کیا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگیا۔ اسی طرح اس قسم کے من گھڑت اشعار

---

[۱] اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ للسیوطی ج ۱ ص ۸۷ مطبوعہ مصر [۲] بحوالہ سیرۃ النبی ج ۱ حاشیہ صفحہ ۱۸۳

Marfat.com

اور خطبے شعراء وخطبا قدیم کی طرف منسوب ہو کر مسلمانوں میں پھیلنے شروع ہوئے تو اگرچہ عوام اصلی اور نقلی میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اصحاب ذوق اور علماء شعر وادب اس فریب میں نہیں آسکتے تھے انھوں نے علماء جرح وتعدیل کی طرح ان موضوع اشعار وقصائد کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا اور جس میں جہاں کہیں رخنہ نظر آیا اسے برملا ظاہر کیا. چنانچہ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں اور جلال الدین سیوطی نے اللآلی المصنوعہ میں اس نوع کے اشعار وخطبات متعدد مواقع پر نقل کر کے ان پر تنقید کی ہے اور ان کے موضوع ہونے کا پردہ چاک کیا ہے ان کے علاوہ عربی ادب کی تنقیدی کتابوں میں بھی اس طرح کے مقولے اور اقوال بکثرت مل سکتے ہیں ۔

پھر اس پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ اگر عیسائی مصنفین کا یہ اعتراض کسی درجہ میں بھی درخور اعتنا ہوتا تو اس کی طرف سب سے پہلے توجہ ان کفار ومشرکین کو ہوتی جو انتہائی عالم بے بسی وبیکسی میں قرآن پر حرف گیری کرنے کے لئے تنکے کا سہارا ڈھونڈھتے تھے تو پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ جو لوگ اہلِ زبان تھے شعراء جاہلیت کا کلام جن کے ایک ایک بچہ کی زبان پر تھا اور جو عربی زبان کے اسالیب بیان سے واقف ہونے کے باعث شعراء عرب پر بہترین تنقید کر سکتے تھے ان کے حاشیۂ خیال میں تو یہ بات کبھی بھی نہیں آئی کہ قرآن مجید کا اسٹائل شعراء وخطباء جاہلیت کے اسٹائل سے ماخوذ ہے اور وہ عیسائی مصنفین جن کا ذوقِ عربیت اور مسلمانوں کے فنِ روایت سے ان کی واقفیت برائے نام ہی ہے وہ اس بے سروپا اعتراض کی جرأت کرتے ہیں سبحان اللہ

پری نہفتہ رخ ودیو در کرشمۂ ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

ذخیرہ محمد اقبال مجددی لاہور

فہمِ قرآن

جس میں فہم قرآن سے متعلق تمام قدیم وجدید
نظریوں پر مبسوط اور محققانہ بحث کی گئی ہے اور قرآن مجید کے آسان ہونے کی
حقیقت کو دل نشین پیرایہ میں واضح کیا گیا ہے. نیز بتایا گیا ہے کہ وحی الٰہی اور کلام ربانی کا
صحیح اور قطعی منشا معلوم کرنے کے لئے صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اقوال و
اعمال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے. اس سلسلہ میں تدوینِ حدیث اور اس سے متعلقہ مضامین
فتنۂ وضع حدیث، اس فتنہ کی روک تھام، حدیث کے پایۂ اعتبار صحابہؓ کی عدالت
کثرت سے روایت کرنے والے بعض صحابہؓ کے حالات، دورِ تابعین کی خصوصیات،
اور دیگر اہم عنوانات پر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔

تالیف

مولانا سعید احمد ام، اے

ندوۃ المصنفین دہلی

قیمت غیر مجلد [illegible]

قیمت مجلد [illegible]

Marfat.com